صنادیدِ عجم

بیاورید گر اینجا بود زباندانے
غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد
(غالب)

مرتبہ

مہدی حسین ناصری

تاریخ تالیف

مؤلفہ

این جلوهٔ معنی که بقرطاس پدید است   سحریست عجم را و عرب را ید بیضاست

نزدیک خدایان سخن بسکه رسیده   شیرازهٔ مجموعهٔ من حبل ورید است

از گنج نغم مژده دهد جیب ایان را   این نظم گهرریز که آوازه شنیده است

نازم که حیات ابدی یافته امروز   در مقتل عشاق بر آنکس که شهید است

سال رقمش ناصری از کلک گهربار   بنوشت که آثار صنادید پدید است

سنه ۱۲۶۳ ھ

بی حشو ز عرفی شمر این سال رقم را
آثار پدید است صنادید عجم را

سنه ۱۲۶۳ ھ

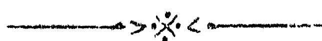
۱۲ ۱۴ ۰

صنادید عجم

مشتمل بر تاریخ و تنقید انشاے عجم از قرن اوّل تا زمانۂ حال

مولفہ

مولوی مہدی حسین صاحب ناصری ایم۔ اے



حسب فرمائش

رائے صاحب لالہ رام دیال اگروالہ بکسیلر و پبلشر کٹرہ الہ آباد

باہتمام کے۔ بی۔ اگروالہ شانتی پریس الہ آباد میں طبع ہوا

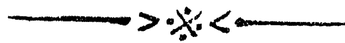
۱۹۲۹ء

بار دوم ۵۰۰ جلد

قیمت فی جلد ے ر

فہرست مضامین

محمد شاہ ۔ ناصر الدین شاہ ۔ مظفر الدین شاہ ۔ محمد علی شاہ ۔ احمد شاہ قاچار ۔ خاتمۂ عہد قاچاریہ اور رضا شاہ پہلوی لٹریچر پر انقلاب ۔ ملک الشعرا صباے کاشانی ۔ نشاط اصفہانی ۔ وصال شیرازی ۔ یغماے جندقی ۔ نشاطی مازندرانی ۔ حکیم قاآنی ۔ افسر قاچار ۔ احمد علی میرزاے قاچار ۔ فرہاد میرزا اور جغرافیہ جام جم وغیرہ ۔ بمان علی کرمانی اور حملۂ حیدری ۔ سپہر کاشانی اور ناسخ التواریخ وغیرہ ۔ سامانی پسر قاآنی ۔ وفائی تفرشی ۔ رضا قلی خاں ہدایت اور مجمع الفصحا وغیرہ ۔ ناصر الدین شاہ کا سفر نامہ اور مجموعۂ غزلیات ۔ مظفر الدین شاہ کا سفر نامہ ۔ خاتمہ (فارسی ڈراما اور ناولوں وغیرہ کا ذکر) ۔



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

عرض حال

برسوں کی آرزو سے ہے کہ فارسی کی تاریخ ادب مذاقِ حال میں مرتب کی جائے اور فلسفۂ لغت و فن تنقید کی مدد سے سخنورانِ ایران کی داد دی جائے۔ اسی شوق میں السنۂ مختلفہ کی تاریخ ادب اور تنقید کلام کی ورق گردانی کی اور مدتوں نظم و نثر کے میدان میں طبیعت کو جولاں رکھا تاکہ بے سوادی دور ہو اور کچھ سلیقہ آجائے تو بقدر حوصلہ چند ورق تحریر کروں۔ غرض ہمت کمال کی طالب رہی اور کم فرصتی ہر طلب پر غالب رہی۔ اِسی کشمکش میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادب پر نظر پڑی۔ حضرت مولانا شبلی نعمانی کی فیض صحبت سے مستفیض ہوا اور شعر العجم کے بعض اجزا ممدوح کی زبان مبارک سے سُنے۔ مولانا آزاد دہلوی کی سخندان فارس بھی نہایت شوق سے پڑھی۔ ارادہ ہوا کہ پہلے ان کاملینِ فن کے مصنفات کا خلاصہ کرلیا جائے تو قلم اٹھایا جائے مگر یہ خیال بھی رفتہ رفتہ زینت طاق نسیاں ہوگیا۔ اس زمانے میں اساتذۂ جوامع الہ آباد وغیرہ کی خواہش ہوئی کہ ایک مختصر

تاریخ ادب ابتدائی درجات کے لئے مُہیّا ہوجائے تو مناسب ہے۔ مؤلف کو بھولا ہوا خیال یاد آیا اور یہ چند اوراق تحریر کئے۔ آتشکدہ و خزانہ عامرہ وغیرہ سے بھی مدد لی۔

تمتّع زہر گوشۂ یافتم   زہر خرمنے خوشۂ یافتم

اب یہ تالیف مطبع کے حوالے کی جاتی ہے۔ اربابِ ذوق عیوب کو نظر انداز کریں اور خدائے پاک تحقیق کی توفیق عطا فرمائے۔ والسلام۔

فتحپور۔ بارہ بنکی
یکم جولائی ۱۹۲۴ء

ناصری



باب اول

آثارِ شکستہ

تمہید
اُمّ البلاد کی قومیں جب دنیا کو آباد کرنے نکلیں تو وہی شرافت پناہ فرقہ جو ایریا کہلاتا ہے بامِ دُنیا سے اُترا اور مختلف ممالک کی زینت ہوا۔ نگارخانۂ چین۔ حکمت یونان۔ قانونِ روم اسی کی بیش بہا یادگاریں ہیں اور وید اور ژند و پاژند اسی کے کارنامے۔ اندلس کی زمین سے چاندی نکالنا اسی فرقے کا کام تھا اور ایران میں درفش کاویانی کی ترصیع میں اسی کا نام تھا۔ فلسفۂ لغت کے ماہرین کہتے ہیں کہ ایران (مُلک کا نام) بھی اسی قوم کے نام سے مشتق ہوا اور شاید یونان کی کتب قدیمہ میں اسی کو آریان لکھا ہے۔

آثارِ قدیم
بہر تقدیر سرزمینِ ایران ابتداے آفرینش سے جنّت نشان ہے۔ ملک کی شادابی۔ زبان کی شیرینی۔ تخییل کی نزاکت۔ ذہن کی جودت یہاں کے رہنے والوں کو فطرت کی طرف سے عطا ہوئی ہیں۔ ان خصوصیات پر اگر لحاظ رکھا جاے تو اس ملک کو کسی زمانے میں بھی انشاپردازی سے خالی سمجھنا ذرا مشکل ہو جاے گا۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی بادِ مخالف کے تند جھونکوں نے یہاں کی نظم و نثر کے اوراق منتشر کر دئے ہوں یا کسی جہاں سوز جنگ نے ان کے علوم کے خزانے جلا دئے ہوں لیکن کرمان شاہ کے ویرانے

آج تک تاریخ قدیم کا مقبرہ بنے پڑے ہوئے ہیں اور قصر شیرین وخرابۂ شاپور وخرابۂ استخر وغیرہ آن نقوش کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہیں جن سے ان پُرانی قوموں کی جوان بختی اور بلند اقبالی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح قدیم زمانے کے اصطلاحاتِ علمیہ اور معارفِ دینیہ بھی زبان حال سے پکار پکار کر کہتے ہیں کہ ایک غافل قوم کی کھوئی ہوئی عظمت ہیں ہم

گوش عبرت سے سنو افسانۂ عبرت ہیں ہم

اللہ! اللہ!

ہم روئے زمیں تیرا است ہم زیر زمیں — ایں صفحۂ خاک ہر دو رو تصویرا است

خانوادہائے سلطنت

تفحص آثار و تصفح اخبار سے اتنا معلوم ہوا ہے کہ مہ آبادیوں سے پیشتر بھی بہت سی سلطنتیں گذر گئی تھیں جنمیں تمدن وتہذیب کسی نہ کسی قسم کی موجود تھی مگر نہ ان خاندانوں کے نام معلوم ہو سکے نہ کوئی اور خاص واقعہ قابل ذکر ملا ہے۔ تسلسلِ تاریخ قائم کرنے کے لئے خاندان مہ آبادیاں سے ابتدا کی جاتی ہے پھر پیشدادی۔ کیانی۔ اشکانی اور ساسانی حکمراں شمار کئے جاتے ہیں یہانتک کہ اسلام کا حملہ ہوتا ہے اور برکتِ اسلام سے ایک باضابطہ تاریخ عجم شروع ہوتی ہے۔

باشندگان قدیم کے مذہبی حالات وعقائد ہندوؤں سے مشابہ تھے اور اعمال وافعال اور رسم ورواج کے مقابلے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید یہ دونوں قومیں ابتدا میں ایک تھیں۔

ذیل میں چند امور شمار کئے جاتے ہیں :-

(۱) مہ آبادیوں کے زمانے میں چار برن تھے۔ کاتوزی[1] یعنے زہدان گوشہ نشین۔ نیساری[2] یعنے افسران ملک و فوج۔ نسودی[3] سختی نہ برداشت کرنے والے اور انوہشی[4] سختی برداشت کرنیوالے۔ پیشدادیوں نے ترمیم کی اور چار گروہ یوں قائم کئے۔ آسورنی[1] علمائے ملت۔ آرتشتار[2] سلاطین و سپاہ۔ استرہوش[3] کاشتکار۔ ہوتخش[4] مزدور وغیرہ۔

(۲) جانوروں کا مارنا گناہ عظیم تھا۔

(۳) تناسخ پر اعتقاد جزو مذہب تھا۔

(۴) صبح۔ دوپہر۔ شام اور آدھی رات کو عبادت کی جاتی تھی۔ ان کی گیتا کا نام گاتھا اور منتر کا نام منتھرا تھا۔

(۵) خدائی کارکن جنھیں ہندو لوگ دیوتا کہتے ہیں ان کے یہاں **فرشتہ** کہلاتے تھے اور آگ۔ پانی۔ ہوا۔ بجلی۔ بہار۔ حسن۔ عشق غرض ہر چیز کا ایک دیوتا یا فرشتہ مانا جاتا تھا۔ زرتشت نے اس اعتقاد کو بالآخر مٹا دیا۔

(۶) اجرام سماوی کی مورتیں بنائی گئی تھیں اور ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ افسانہ گو اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے :-

بدو گفت سہراب کاے خوب چہر ‌‌ ‌‌ بہ تاج و بہ تخت بہ ماہ و بہ مہر
کہ ایں بارہ با خاک پست آورم ‌‌ ‌‌ ترا اے ستمگر بدست آورم

(۷) قربانی۔ جنیو۔ ہون وغیرہ کا بھی پتا لگتا ہے۔

(۸) گائے کی تعظیم بھی کی جاتی تھی اور جب سے فریدوں کی

پرورش کرنے والی گائے برمایہ کو ضحاک نے ذبح کرڈالا تھا اور کاوہ نے اس کا چمڑا درفش کاویانی میں تعظیماً لگا دیا تھا (جسکے سایہ میں فریدوں کو فتح حاصل ہوئی) تو گائے کی عظمت و محبت اور بڑھ گئی یہانتک کہ بادشاہوں کے نام گاؤیار وغیرہ ہونے لگے۔

(۹) برہمنوں کی طرح ان کے یہاں موبد اور دستور تھے جو اپنے علم اور تقدس کی وجہ سے ایک ممتاز گروہ تھے اور قوم ان کی بیحد عظمت کرتی تھی۔

(۱۰) شگون اور فال وغیرہ کا بھی بہت خیال تھا اور بعض وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مردوں پر چوٹی بھی ہوتی تھی۔

(۱۱) بادشاہ کی تعظیم بھی بیحد کی جاتی تھی اور وہ بزرگان مذہب میں شمار ہوتا تھا۔

(۱۲) بسنت کے مشابہ جشن گل کوبی ہوتا تھا جسمیں زرد پھول توڑے جاتے تھے۔ ابتک لٹریچر میں موجود ہے :-

خدائگانِ جمال و خلاصۂ خوبی   بہ باغِ حسن درآمد بہ رسمِ گل کوبی

سویمبر کے مشابہ مردگیراں کا جلسہ ہوتا تھا اور نسل و ولادت کے فرشتے کی تمجید کی جاتی تھی۔ ہولی کے چند روز بعد چراغانِ روز اسفند ہوتا تھا۔ شاعری میں ذکر موجود ہے :-

سیاہ روز شدم بہرِ عشرتِ دگراں   دریں زمانہ چراغانِ روزِ اسفندم

دسمبر میں بزرگوں کی روحوں کی تعظیم کرتے تھے اور ایک تیوہار آتش سوز ہوتا تھا جسمیں آتش خانے روشن کئے جاتے تھے

اور آگ کے دیوتا کی تعظیم ہوتی تھی۔ جون کے مہینے میں آب ریزاں ہوتا تھا جسمیں ایک دوسرے پر رنگ ڈالتے تھے۔ اعتدال خریفی کا جشن ستمبر میں ہوتا تھا اور اعتدال ربیعی میں نو روز اور خرم روز ان کے مشہور جشن تھے جنکی مثالیں ہندوستان میں بھی ملینگی۔

مقدس کتب یہ مذہبی رسوم جو تحریر ہوئے ہیں بادی النظر میں معلوم ہوتے ہیں کہ کچھ تو مہ آبادیوں اور پیشدادیوں کے وقت سے چلے آتے تھے اور کچھ زرتشت کے بعد جاری ہوئے۔ افسوس ہے کہ دین زرتشتی سے پہلے کی کتابیں موجود نہیں اور نہ سر دست کوئی ذریعۂ تحقیق موجود ہے ورنہ اس قوم کے ارتقائے مذہبی کی تاریخ مسلسل لکھی جاتی۔ لیکن جہانتک اندازہ ہوسکا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زرتشت کی حیثیت اس تاریخ میں وہی ہے جو گوتم بدھ کی ہندوستان میں تھی۔ گشتاسپ اور اسفندیار جو کیانیان دوم کے ابتدائی سلاطین میں تھے زرتشت کے فروغ کے باعث ہوئے جنکی تعلیم و تلقین قدیم عجائب پرستی کی مخالف تھی اور آتش پرستی کے پردے میں ایک نئی روشنی پھیلا رہی تھی۔ اس مصلح دین و ملت کی مقدس کتاب کا نام ژند[1] تھا مگر یہ کتاب نہایت مشکل تھی اس لئے شرح لکھی گئی اور اس کا نام پاژند[2] رکھا گیا تاکہ بقول مولانا آزاد "جب ژند پاژند سے ٹکرائے تو جلوۂ حق روشن نظر آئے"۔ مگر شرح متن سے مشکل ہو گئی لہذا اس کی ایک تفسیر

---

[1] لفظی معنی چقماق کا وہ جزو جو آگ نکالتا ہے۔

[2] چقماق کا دوسرا جزو۔

لکھی گئی جس کا نام استا یا اوستا[1] ہے۔ ساسان پنجم نے خسرو پرویز کے زمانے میں چند کتب قدیمہ کا اپنے زمانے کی فصیح زبان میں ترجمہ کیا جو دساتیر کے نام سے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نامے سلاطین مہ آباد پر نازل ہوئے تھے لیکن اصل کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے تاریخ زبان میں انکا درجہ ژند اوستا کے بہت بعد آتا ہے۔

نمونے کے طور پر ان کتب قدیمہ کے اقتباسات درج کیے جاتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ قبل اسلام اور بعد اسلام کی فارسی میں کس قدر تفاوت ہے۔ ژند کے متعلق اتنا اور تحریر کرنا لازم ہے کہ اس کتاب کے پچیس بابوں میں سے صرف اُنیسواں باب وندیداد پورا ہے باقی اوراق پریشان رہ گئے ہیں۔

استا کا فقرہ ۔ اشم وہو ویشم ہستی اُستا ہمائے

راستی نعمت کبریائی ہے۔ رحمت ہے اور فراواں ہے۔ اور تقدس سے

یداشائے ویستائے اشم (وغیرہ)

خیر ترین اشیا ہے۔ چاہتی ہے کرتی ہے۔ ہو گی۔

خورده استا (نمازوں اور دعاؤں کے صحیفہ) کا اقتباس:۔

مس دوہ د فیروزگر باد مینوے خورشید امرگ رایومند

بزرگ و فیروزمند باد مینوی خورشید بے مرگ خالص نورمند

---

[1] یوروپ کے محقق کہتے ہیں کہ اوستا اصل زرتشت کی کتاب ہے۔ جس کی زبان میں ارمنی وکلدانی واشوری وغیرہ شامل ہیں۔ ژند اس کی شرح پہلوی زبان میں ہے اور پاژند اسی ژند کی دوسری تدوین ہے جس میں خالص فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں اور غیر زبانوں کے الفاظ شاذ و نادر ہیں۔

خرد ہمند ار وند اسپ ہمت وہیخت وہورشت
خردمند قوی اسپ بہ نیک نیت نیک گفتار ونیک کردار نمازبرایں

دساتیر کا اقتباس:-

ہوزامیہم فہ مزدان ہزہزماس وزماس ہرشیور
پناہیم بہ یزدان از منش و خوی بد درشت گمراہ کنندہ

ہردیور فہ شید شمستاسے ہرشندہ ہرشنگر زمریان
و براہ بدبرندہ بنام ایزد بخشائندہ بخشائشگر مہربان

فرو ہید ور-
دادگر

دیکھنا! اس عجیب اتفاق کو کہ یہ آخری دو فقرے اپنے معانی ہیں اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم سے کس قدر مشابہ ہیں۔

علمی کمال
ان کتابوں کے ترجمے انگریزی وغیرہ میں ہو گئے ہیں جنکے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حقائق و معارف۔ حکمت اخلاق وسیاست مدن وغیرہ کے ذخیرے ان قوموں کے پاس نہایت عمدہ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام نے ایران کے کمالات کو معراج پر پہنچادیا اور اپنے علوم و فنون سے اس ملک کو اتنا متاثر کیا کہ بعد اسلام کے تصانیف۔ اصطلاحات وخیالات وغیرہ میں عرب کے زلہ ربا معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو پرانی فارسی میں منطق و فلسفہ و فقہ وادب وغیرہ کے مصطلحات خالص فارسی میں ملتے ہیں اور

بعض مقامات پر مباحث علمیہ بھی ترجمے کے لباس میں نظر آتے ہیں جن سے پورا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ قومیں زمانۂ سابقہ میں کافی ترقی کر چکی تھیں۔ ذیل کے اصطلاحات حکمیہ ملاحظہ ہوں :۔

عقل اول = مہین ہوش	واجب = بایست
علّت = ایرایہ	ممکن = شایست
علّت مادّی = مایۂ	ممتنع = نا بایست
علّت صوری = پیکری	جوہر = گوہر
علّت فاعلی = کاری	عَرَض = پیان
علّت غائی = کرانی	بسیط = آدرز
قدیم = باش	مرکب = دربست۔ کاموس
حادث = رستہ۔ نو رستہ	

منطقی اصطلاحیں دیکھئے :۔

نوع = گونہ	دعوٰی = خواست
جنس = مہ گونہ	برہان = روشنگر
فصل = بازار	برہان تطبیق = برہم روشنگر
خاصہ = ویژہ	برہان سلمی = زینۂ روشنگر

سلطنت کے نظم و نسق کے متعلق بھی بہت کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ بادشاہ کی عظمت بیحد کی جاتی تھی کیونکہ جس طرح وہ مرتبے میں افضل ہوتا تھا ویسے ہی نیک نیتی اور نیکوکاری میں بھی سب سے فوقیت رکھتا تھا۔ اہل دربار کو تعظیم سلطنت خاص طور سے ملحوظ رہتی تھی۔ اگر کوئی شخص بادشاہ کی جھوٹی

قسم کھاتا تھا تو لوگ اُس سے ملنا جلنا چھوڑ دیتے تھے آئین مہ آبادی میں تاکید تھی کہ رعایا کو آرام سے رکھنا بادشاہ کا فرض ہے۔ وزیر سب سے بڑا مہندس اور حکیم ہوا کرتا تھا اور تمام عُمّال سرکاری اُسکے ماتحت ہوتے تھے۔ خاص ماتحتوں میں دو استوار (امین) دو شدہ بند (وقائع نویس) ہوتے تھے جو منصب وزارت کے مخصوص معین تھے۔ خبر رساں لوگ رَوَند کہلاتے تھے۔ فوج میں ایک لاکھ پر سپہبد۔ اُن سے نیچے کئی سر ہزار کے سردار۔ پھر سو سو پر سپہدار پھر دس دس پر سالار پھر چار چار، پانچ پانچ کے افسر۔ ہر شہر میں فرہنگ روز (کوتوال) ہوتا تھا جو سراغ رسانی اور واقعہ نگاری کے فرائض کا نگراں تھا۔ مالگذاری مہ آبادیوں کے زمانے میں بیسواں حصہ آمدنی کا تھی لیکن ساسانیوں کے زمانے میں دہ یک کا سلسلہ قائم ہوا۔ فوجداری اور دیوانی کے محکموں کے افسر فرہنگ دار اور دادستاں تھے یعنے قاضی و مفتی۔ آئین مہ آباد کے فتوے بغیر بادشاہ کو بھی قتل کا اختیار نہ تھا۔ سوداگر اور مسافر اگر فلاکت میں مبتلا ہو جاتے تھے تو سلطنت کی طرف سے اُن کی مدد کی جاتی تھی۔ بیمار۔ اپاہج۔ بیمارخانوں میں داخل کئے جاتے تھے۔ سراؤں کی تعمیر اور سڑکوں کی درستی پر پوری تاکید رہتی تھی۔ حرم سراؤں کے بھی آداب و قواعد مقرر تھے۔ مختصر یہ کہ ہر حیثیت سے ایک نظم اور ضابطہ کا پتہ لگتا ہے۔ جن سے اسلاف عجم کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

موسمی حالت کے متعلق بھی کچھ بیان کر دینا لازم ہے کیونکہ موسمی

کسی ملک کی انشا پر تنقیدی نظر ڈالنا ممکن نہیں تا وقتیکہ وہاں کے عقائد و رسوم کے ساتھ ساتھ سیاسی و طبیعی حالات کی اطلاع نہو جائے۔ فنِ انشا کی لطافت ہمیشہ نزاکت خیال اور شیرینی ادا سے وابستہ رہتی ہے اور استعارات و تشبیہات بلکہ امثال و محاورات تک کا تجزیۂ صحیح اس امر پر شاہد ہے کہ تفاوتِ تخیل بقدر تفاوتِ حالاتِ طبیعی و سیاسی و مذہبی ہوا کرتا ہے۔ انگریز انشا پرداز گرمی کو عیش کا زمانہ سمجھتا ہے اور سردی کو مصیبت کا عالم جانتا ہے کیونکہ ملک اکثر اوقات سرد رہا کرتا ہے لیکن عرب کو اگر کوئی چیز بآسانی ہاتھ آجاتی ہے تو اُسے غنیمت باردہ کہتا ہے یا جسکے دیکھنے سے دل کو راحت ہوتی ہے اُسے قرۃ العین (آنکھ کی ٹھنڈک) کہتا ہے کیونکہ ملک گرم ہے اور سردی مغتنمات سے ہے۔ ایران کی سرزمین سرسبز و شاداب ہے۔ کوہستانی مناظر اور صحراؤں کے سبزے نہایت دلکش اور روح پرور ہیں۔ موسم اس ملک کے چار قرار دیے گئے ہیں۔

بہار ۲۱- مارچ سے شروع ہوتی ہے کیونکہ ملک سرد ہے اور برف جب گل کر بہ جاتی ہے تو پھول وغیرہ کثرت سے نکل آتے ہیں اور ہر ٹکڑا زمین کا گلزار ہوتا ہے۔ ایرانیوں کو پھولوں سے عشق ہے ہر گھر میں پائیں باغ موجود ہے۔ جاڑوں میں ہر چیز برف کی چادر میں ڈھکی ہوئی تھی۔ نوروز آیا اور برف بہنے لگی۔ شاخیں ہری ہونی شروع ہوئیں۔ آج کلی پھوٹی۔ کل پھول نکلا۔ ہوا میں خنکی۔ پانی سرد۔ مگر آفتاب گرم۔ غرض عجب لطف کا

زمانہ ہے۔ ہندی شاعر نوروز کا حال نظم کرتے وقت پانی برسنے کا نظارہ پیش کرتا ہے جو واقعیت کے سراسر خلاف ہے۔ خاقانی کو دیکھو کس مزے سے کہہ گیا ہے :۔

نوروز برقع از رخ زیبا برافگند   برگستوان بہ دُلدلِ شہبا برافگند

یہ برقع کیا ہے۔ وہی برف کی چادر ہے جو ہر خوبصورت چیز کے چہرے سے ہٹ گئی ہے۔ یا مثلاً نظامی نے کہا ہے :۔

دہن ناکشادہ لبِ آبگیر   کہ آید لبِ غنچہ را بوے شیر

یعنے ابھی حوضوں کے کنارے کی برف اچھی طرح گل نہیں چکی مگر غنچہ کو اپنی پرورش کے لئے پانی ملنے کی امید پیدا ہو گئی ہے۔

تابستان کی ابتدا ۲۳۔جون سے ہے۔ دریاؤں میں پانی زور شور سے بہتا ہے۔ میوے تیار ہیں۔ گرمی پڑنے لگی ہے۔ ناشپاتیاں۔ سیب۔ انگور اس کثرت سے ہیں کہ جانور تک ان سے سیر ہو جاتے ہیں۔ کاروبار تجارت بخوبی چلنے لگتے ہیں۔ یہیں سے گرم بازاری یا سرد بازاری سمجھ میں آتی ہے کہ کیا چیز ہے اور یہ محاورات کیوں قائم ہوئے۔ پھر گرمی ہنگامہ۔ گرمی صحبت۔ شعر گرم۔ حسن گرم۔ گرمی گفتار وغیرہ کو دیکھو اور قیاس کرو کہ کیا لطف کا زمانہ ہوگا۔ ہندوستان والا گرمی سے پناہ مانگتا ہے جب تک ایران نہ جائے کیا سمجھے ؟

پائیز ۲۳۔ستمبر سے شروع ہوتا ہے۔ برف باری کا آغاز سرد بازاری کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ کسانوں نے بیج بو دیئے۔ اوپر سے برف گری اور زمین ڈھک گئی۔ فردوسی نے

اسی خیال میں بڑھاپے کی آمد دکھائی ہے۔

بگسترد کافور بر جائے مشک　　　　گل ارغوان شد بہ پائیز خشک

زمستان ۲۱- دسمبر سے شروع ہوتا ہے۔ برسات کی شدت برف باری کی کثرت۔ آگ بغیر گذارا نہیں۔ پانی کے قطروں کی برف کی وجہ سے یہ قطع ہوتی ہے کہ جیسے کوئی آسمان پر سے روئی دھنک دھنک کے پھینکتا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

برآمد زکوہ ابر کافور بار　　　　مزاج زمیں گشت کافور توار

ذرا کافور کا رنگ اور برف کا رنگ دیکھئے۔ پھر دونوں کا مزاج انتہائی سرد۔ جبتک طبیعی حالات نہ معلوم ہوں اس شعر کا کیا لطف ہے؟ ہندوستان گرم ملک ہے۔ ہمیشہ ٹھنڈی جگہ پر بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ ایران کی حالت اسکے خلاف ہے کہتا ہے۔

عجب جائیست ایں کاخ دل آویز　　　　کہ چوں جا گرم کردی گفت برخیز

جا گرم کردن کسی جگہ تھوڑی دیر بیٹھنا ہے۔ گویا۔ دنیا تھوڑی دیر بھی ایک مقام پر اطمینان سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ پھر سرد ملک میں گرم جگہ کو چھوڑ کر گھڑی گھڑی ٹھنڈی جگہ پر بیٹھنا جس بےچینی کو ظاہر کرتا ہے اس کا اندازہ اہل عجم ہی کر سکتے ہیں۔

ایرانی زبانیں　اس سرسبز اور زرخیز سرزمین کی زبانیں ابتدا میں کیا تھیں؟ اس کا جواب پرانی فارسی کتابوں میں جہاں دیکھئے یہی ملتا ہے کہ سات زبانیں رائج تھیں۔ فارسی۔ دری۔ پہلوی۔ ہروی۔ سگزی۔ زاولی اور سغدی۔ ان میں سے چار آخری زبانوں کے نام خود ہرات۔ سگز (سیستان)، زابل۔ سغد یہ (سمرقند

وغیرہ) سے منسوب ہیں۔یہیں انکی نشو و نما ہوئی ہوگی اور یہیں خاتمہ۔ ممکن ہے کہ اب بھی ان ممالک کے محاورات وفقرات میں کوئی خصوصیت باقی ہو جس میں ان مردہ زبانوں کا اثر موجود ہو۔لیکن کوئی تصنیف یا کتابہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے سردست ان کے متعلق کوئی تحقیقی بات نہیں کہی جاسکتی البتہ فارسی۔ دری اور پہلوی کے بارے میں کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

دری — دری۔ کہا گیا ہے کہ کسی زمانے میں دربار کی زبان تھی۔اب قہستان میں اسکے نشان پائے جاتے ہیں۔اہل یورپ کے تحقیقات کے نتائج سے جو استنباط کیا جاسکتا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ غالباً یہ قدیم فارسی ہے جس میں غیر زبانوں کے الفاظ ومحاورات داخل نہیں ہیں۔کیکاؤس وکیخسرو وغیرہ اسی کو بولتے تھے اور نقش رستم اور خرابات استخر کے کتبے اسی زباں میں ہیں۔

پہلوی — پہلوی۔کہتے ہیں کہ یہ زرتشت کی زبان ہے اور اوستا وغیرہ اسی زبان میں تصنیف ہوئی ہیں۔بعض محققین کا خیال ہے کہ محض اُس رسم کتابت کا نام ہے جو ارامی اور اشوری قوموں سے حاصل کی گئی تھی۔اس رسم الخط میں مثلاً "بادشاہ" کے لئے ایک صورت خاص وضع کی گئی تھی اگر یہ صورت تحریر میں ارامی وسریانی وغیرہ میں آتی تھی تو اس کا تلفظ "ملک" کیا جاتا تھا اور اور اگر فارسی میں آتی تھی تو "شاہ" ہوتا تھا۔یہ فرق صرف اسلاف کو معلوم تھا۔اخلاف کے زمانے میں انکے فارسی تلفظ مفقود ہوگئے اور ارامی واشوری وسریانی وغیرہ کے تلفظ داخل ہوگئے۔نتیجہ

یہ ہوا کہ زبان خالص نہ رہی بلکہ مخلوط ہوگئی۔ آل ساسان کے زمانے میں اس زبان میں بیشتر تصانیف ہوئے اور رفتہ رفتہ علمی زبان ہوگئی۔ اگرچہ زبان کے اعتبار سے ساسانیوں کی پہلوی قدیم پہلوی سے بہت کچھ جدا تھی۔ آج جو کچھ پارسیوں کے یہاں ذخیرہ ملتا ہے یا یورپ و ایشیا کے کتب خانوں میں پایا جاتا ہے وہ سب اسی پہلوی جدید میں ہے۔ مینوے خرد۔ خوردہ اوستا۔ اندرزخسرو۔ خواتان۔ ارداے ویراف کے تصانیف۔ کارنامک ار تخشتر پاپکان وغیرہ وغیرہ وہ تصانیف ہیں جو اس دور سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

فارسی

فارسی کے بارے میں یہ خیال ہے کہ اسی پہلوی زبان سے غیر ممالک کے الفاظ نکال کے ایرانی فارسی کے الفاظ قائم کرنے سے بنتی ہے اور بعض محققین کہتے ہیں کہ اگر پہلوی پارسیوں کے رسم الخط میں ہو تو پہلوی ہے اور اگر عربی رسم الخط میں ہو تو فارسی ہے۔ اس تحقیق کی بنا پر معلوم ہوتا ہے کہ فارسی وہ زبان (اور رسم الخط) ہے جو ظہور اسلام کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ حقیقت میں فارسی یا پارسی فارس یا پارس سے منسوب ہے جو ایران کے ایک صوبہ کا نام ہے جس کے دارالسلطنت کو شیراز کہتے ہیں اور آجتک یہ اثر ہے کہ فارسی زبان جس قدر شیراز کی فصیح ہے کسی اور مقام کی نہیں ہے۔ یہ زبان فی الحقیقت اُس ارتقاے فطری کا نتیجہ ہے جو ہر ملک کی زبان میں ہوتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ السنہ سے مقابلہ کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ یہاں کی زبانیں برج بھاشا

وغیرہ ابتدا میں کیا تھیں اور غیر قوموں اور فاتحوں کے اثر سے ان میں ارتقاے تدریجی ہوتے ہوتے کیونکر "اردو" زبان قائم ہو گئی۔ انگلستان کی تاریخ سے اندازہ ہوگا کہ انگلیس اور سیکسن زبانیں کیا تھیں۔ پھر یونان۔ ڈنمارک۔ اندلس۔ لاطن فرانسہ اور جرمن کے اثر سے موجودہ انگریزی زبان کیونکر قائم ہو لی۔ فی الحقیقت اس تالیف کا منشا یہی ہے کہ اسی زبان کے انشا کے خصوصیات اور انشا پردازوں کے حالات قلمبند کئے جائیں۔ لیکن اخلاف کے کمالات کا سلسلۂ تاریخی قائم کرنے کے لئے اسلاف کے حالات و خصوصیات کا علم لابدی ہے کیونکہ اساس لغت و انشا وہی مٹا ہوا نقش ہے لہذا اس مقام پر اختصار کیا جاتا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ ہر ایک دور کے سلسلے میں اس ارتقاے تدریجی کا ذکر آئیگا۔

قدیم شعر و شاعری

اس باب کے ختم کرنے پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اسلاف کی نظم کا بھی ذکر کیا جائے کیونکہ پرانی قوموں میں شعر کا وجود مستقل تاریخی دنیا میں نثر سے پیشتر دکھائی دیتا ہے مگر نہایت افسوس سے معذرت کی جاتی ہے کہ کوئی شعر اس وقت تک ایسا دستیاب نہیں ہوا جو اس زمانے سے منسوب ہو سکے۔ البتہ پارسیوں کی بعض دعائیں نظم میں ہیں اور بعض کتب میں کچھ منظومات بھی درج ہیں لیکن ہمارے تذکرہ نویس صرف اتنا لکھتے ہیں کہ پہلا مصرعہ بہرام چوبیں کا ہے جس نے شیر مار کے فخریہ کہا تھا:۔

منم آں ببر دماں و منم آں شیر یلہ

اور دوسرا مصرعہ اُس کی معشوقہ کا جواب ہے۔

نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ

دولت شاہ کا بیان ہے کہ کوہ بے ستون اور قصر شیریں کے عمارات میں سے کسی دروازے پر کندہ تھا :۔

ہزبرا بہ گیہاں انوشہ بزے جہاں را بدیدار توشہ بزے

قدیم فارسی میں فن شعر کے اصطلاحات ضرور ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فن نازک اُس زمانے میں موجود تھا۔ مثلاً غزل کے لئے چامہ موجود ہے۔ ردیف کے لئے پساوند۔ قافیہ کے لئے سروارہ وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ بعض محققین کا خیال ہے کہ مثنوی بھی قبل اسلام موجود تھی مگر ثبوت موجود نہ ہونے سے بالفعل یہ خیال محض حسن ظن کا مرتبہ رکھتا ہے۔

خاتمہ اب یہ باب تمام کیا جاتا ہے کیونکہ جو کچھ آثار قدیمہ سے ظاہر ہوا وہ اس قدر پریشان و پاشان اور بعض اعتبارات سے ہیچ در ہیچ ہے کہ ایک مسلسل تاریخ مہیا کرنا سردست محال ہے۔ جو کچھ اس باب میں تحریر ہوا ہے اُس کی بنا کے لئے ایک کمزور اساس قیاس کی ہے یا وہ کتبے اور سکے ہیں جو زیر زمین سے باہر لائے گئے۔ آئندہ باب میں سلاطین عجم کا افسانہ تحریر کیا جاتا ہے جو عوام کی زبان پر جاری رہا ہے۔ یہ افسانہ اگرچہ کسی کمزور بنیاد پر بھی قائم نہیں ہے

لیکن تاریخ ادب سمجھنے کے لئے اس کا علم ضرور چاہیے کیونکہ اکثر محاورات والفاظ۔ بیشتر تلمیحات و تشبیہات انھیں افسانوں سے وابستہ ہیں۔ بلکہ قومی خیالات اور رواسم وغیرہ پران کا اچھا خاصہ اثر ہے۔ وما ھذا الا اساطیر الاوّلین۔



باب دوم

اَساطیرِ اَوّلین

تمہید — سلاطین مہ آباد اور ان کے پیشرو خاندانوں کے حالات قصص و حکایات سے بھی کسی مسلسل صورت میں نہیں ملتے۔ شاہنامۂ فردوسی اور افسانہائے پہلوی وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلا حکمراں خاندان پیشدادیوں کا تھا۔ اس کے بعد کیانی۔ اشکانی اور ساسانی بادشاہ ہوئے۔ اول الذکر دو سلسلوں کے حالات محض افسانے ہیں مگر اشکانیوں اور ساسانیوں کے واقعات کو فی الجملہ تاریخی حیثیت بھی حاصل ہے۔

کیومرث — پیشدادی خاندان کا پہلا تاجدار کیومرث ہے۔ جو مذہب زرتشت میں گیامرت کہلاتا ہے اور ایرانیوں کا باوا آدم یہی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ بادشاہ اور رعایا سب کے سب پہاڑوں میں رہتے تھے اور چیتے یا تیندوے کی کھال پہنا کرتے تھے۔ وحشی جانوروں کو رام کرنا اور انسان کے لئے بکار آمد بنانا اسی وقت سے شروع ہوا۔ ولیعہد سلطنت اس کا بیٹا سیامک تھا جو دیوؤں کے ہاتھ سے کسی جنگ میں مارا گیا لہذا کیومرث کی تیس سالہ سلطنت کے بعد اس کا پوتا ہوشنگ

تخت نشین ہوا۔

ہوشنگ — یہ وہی ہوشنگ ہے جس کا نام تاریخ عرب میں اوشہنج ہے۔ اس کی چہل سالہ سلطنت میں آگ کا چقماق سے نکالنا معلوم ہوا اور پارسیوں کا جشن سدہ اسی اکتشاف کی یادگار ہے۔

طہمورث — طہمورس (طہمورث) دیوبند اپنے باپ ہوشنگ کے بعد وارث سلطنت ہوا۔ لقب خود بتاتا ہے کہ جنوں اور دیوؤں پر غالب آگیا تھا مگر مغلوب قوموں کی جان بخشی اس شرط پر کردی تھی کہ مختلف زبانیں اور خط و کتابت سکھا دیں۔ چنانچہ افسانہ نگار کہتے ہیں کہ یہ بادشاہ تیس زبانیں جاننے لگا اور تیس ہی سال سلطنت کر کے دنیا سے گذر گیا۔

جمشید — جمشید اسی پڑھے لکھے باپ کا بیٹا تھا۔ قصص و روایات میں قدیم عظمت و سطوت کا مرکز بن گیا ہے۔ اسکا پائے تخت استخر تھا جسے تخت جمشید بھی کہتے ہیں۔ جن۔ دیو۔ پری۔ ابر ہوا۔ غرض کائنات پر تسلط تھا۔ اور تخت شاہی ہوا میں اڑتا تھا اسی وجہ سے عرب اسے سلیمان بن داؤد کہتے ہیں حالانکہ ابن المقفع ان جاہل عربوں کا مضحکہ اڑاتا ہے کہ جمشید و سلیمان کے درمیان کم سے کم تین ہزار برس کا فاصلہ تھا۔ بھلا یہ دونوں ایک کیونکر ہو سکتے ہیں۔ ہندوؤں کا یاھم بھی جم سمجھا گیا ہے کیونکہ شید محض نام پر اضافہ ہے

جیسے خور اور خورشید) اور زرتشتیوں کا یم یا یما بھی یہی ہے۔
شاہنامہ میں لکھا ہے کہ اس کی سلطنت سات سو برس رہی۔
آلاتِ جنگ۔ اسبابِ لباس وغذا۔ بنائے مکانات۔ آلاتِ
عیش وطرب سب کا موجد یہی ہے۔ نظامِ سلطنت کے قوانین
اوّلاً اسی نے ترتیب دئے تھے اور اِدارات مذہبیہ وحربیہ
و مالیہ وغیرہ قائم کئے تھے۔ زر و جواہر کا استعمال زینت و
آرایش میں اسی کے وقت میں ہوا اور جام و شراب کا
ایجاد کرنے والا بھی یہی منجھلا بادشاہ نکلا۔ غالب مرحوم کہہ گیا ہے:۔

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم
دانی کہ اصل دودہ ام از دودۂ جم است
میراثِ جم کہ مے بود اینک بمن سپار
زیں پس رسد بہشت کہ میراثِ آدم است

فارسی انشا میں خصوصیت کے ساتھ دو چیزیں اس زمانے
کی بہت مشہور ہیں:۔

(۱) جامِ جم اجرامِ سماوی و اقالیمِ ارضی کا کُرہ جس پر نظر
کر کے جمشید گذشتہ اور آئندہ واقعات علمِ نجوم کی قوت
سے بتلایا کرتا تھا۔

(۲) جشنِ نوروز جس کی ابتدا اس وقت سے ہوتی
تھی جب آفتاب برجِ حمل میں داخل ہوتا تھا اور اعتدال
ربیعی شروع ہو جاتا تھا۔

عظمت واقبال کی فراوانی حد سے بڑھ گئی تو بادشاہ کے دماغ میں غرور
آگیا اور خدا کے مقابلے پر آمادہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضحّاک کے ہاتھ سے مار ڈالا گیا۔

ضحّاک کا نام اوستا میں اژدہاک ہے۔ زمانۂ آل ساسان

میں اس کا تلفظ عربی کر دیا گیا تاکہ یہ قدیم ایرانیوں کا دشمن بھی
اُسی قوم عرب میں شمار ہونے لگے جو آخر عہد میں سلطنت ایران
سے برابر نبرد آزمائی کیا کرتے تھے اور بالآخر آل ساسان کے
زوال کے باعث ہوئے ضحاک نہایت ظالم بادشاہ سمجھا گیا ہے
اور ظلم کا نتیجہ یوں نکلا کہ دو سانپ اسکے شانوں پر ظاہر ہوئے
جن کی غذا کے لئے دو آدمیوں کے بھیجے روزانہ آتے تھے۔
ہزار برس کی سلطنت میں اس بادشاہ نے اتنے ظلم و ستم کیے
کہ سارا ایران گھبرا گیا۔ کیانیوں سے اس قدر عداوت تھی کہ
واجب القتل ہونے کے لئے اس خاندان سے انتساب کافی
تھا۔ ایک کیانی بی بی حالت حمل میں جان بچا کے بھاگی اور
پہاڑوں میں رہنے لگی۔ وہاں بچہ پیدا ہوا جس کا نام فریدوں
رکھا۔ ماں کا دودھ سوکھ گیا اور بچہ مصیبت میں گرفتار ہوا
خدا کی رحمت سے ایک گائے آئی جس کا نام مایہ یا مایون
یا برمایون بتایا گیا ہے۔ اسکے دودھ سے فریدوں کی پرورش ہوئی۔ فریدوں
یکے گاؤ برمایہ خواہد بُدن جہاندار را دایہ خواہد بُدن

ضحاک کو نجومیوں نے بتلایا کہ تیرا دشمن پیدا ہوا ہے
اور فلاں پہاڑ میں پرورش پا رہا ہے۔ ظالم بادشاہ لشکر لیکے
چڑھ دوڑا۔ ماں نے خبر پائی تو فریدوں کو لیکے دوسرے مقام پر
چلی گئی۔ برمایہ گائے رہ گئی جو ظالم کے ہاتھ سے بیگناہ ماری
گئی۔ ماران ضحاک کی غذا کے لئے قضائے کار کا وہ آہنگر
کے بیٹوں کی باری آئی۔ بڈھے لوہار نے گھبرا کے اپنا پیشہ بند

یا بر مایہ کا چمڑا ایک نیزے پر لٹکایا اور حبت قوم کا علم بلند کیا۔ ستم رسیدہ ایرانی جوق جوق اسکے ساتھ ہوگئے اور پہاڑوں سے فریدوں کو بادشاہ بنا کے لائے۔ کیانی تاجدار کے دیدار سے قوم کی قوت ایسی بڑھی کہ میدان جنگ میں ظالم ضحاک قتل ہوا اور کیانیوں کی عملداری ہوگئی۔ برمایہ کی ..کا ریں گرز گاؤ سر بنایا گیا اور کاوہ کے علم کا چمڑا زرو جواہر سے مرصع کیا گیا جو درفش کاویانی کے نام سے آجتک فارسی لٹریچر پر لہرا رہا ہے اور ظالم کش بادشاہ کا نام بھی اوستا[1] سے لیکے آج تک فارسی انشا میں محبت کے ساتھ لیا جا رہا ہے :-

فریدون فرخ فرشتہ نبود ۔۔۔ زمشک و ز عنبر سرشتہ نبود
بداد و دہش یافت آن نیکوئی ۔۔۔ تو داد و دہش کن فریدون توئی

ایرج — فریدوں کے تین بیٹے تھے سلم۔ تور۔ ایرج۔ ایرج سب سے چھوٹا تھا اور باپ کو بھی محبوب تھا۔ دونوں بڑے بھائی اپنے چھوٹے بھائی سے حسد کرتے تھے۔ باپ نے دور اندیشی کی اور اپنا ملک تینوں کو اپنی زندگی میں بانٹ دیا تاکہ بعد کو قتل و خونریزی نہ ہو مگر ہونے والی بات ہو کے رہتی ہے۔ سلم کو چین و ماچین ملے۔ تور نے ترکستان اور ماوراء النہر کی حکومت پائی۔ ایرج کو سرزمین ایران و ہندوستان ہاتھ آئی۔ دونوں بھائیوں کو حسد ہوا کہ چہیتے بیٹے کو نہایت سرسبز اور زرخیز ملک دیا گیا اور چھوٹے بھائی کے خون کے پیاسے

---

[1] اوستا میں تھرا ئیتاون اور ہندی میں تھرا تین اس بادشاہ کا نام ہے۔

ہو گئے یہانتک کہ اُس کی زندگی کا خاتمہ کرادیا اور نوجوان بیٹے کی لاش باپ کے پاس بھجوادی - فریدوں اس غم میں نہایت بیقرار ہوا اور قسم کھا گیا کہ خون کا انتقام ضرور لیا جائیگا۔

منوچہر

ایرج کا بیٹا منوچہر جب سن شعور کو پہونچا تو خونِ ناحق کے انتقام لینے میں کامیاب ہوا اور فریدوں کے سامنے سلم و تور کے سر کاٹ کے بھیجے - اسی وقت سے کیانیوں اور تورانیوں کی جنگ کا آغاز ہوتا ہے اور کیقباد - کیکاؤس و کیخسرو وغیرہ کی زندگی انھیں لڑائیوں میں ختم ہوتی ہے - زابلستان اور سیستان کے نبرد آزما - نریمان - سام - زال اور رستم - کے کارنامے ان افسانوں کی آجتک زینت ہیں - اُدھر افراسیاب بادشاہِ توران کسی سے پست نظر نہیں آتا - رستم کے بیٹے سہراب کو باپ سے لڑوا دینا اور ایرانیوں کی زندگی کو تلخ کر دینا اسی کا کام تھا - بالآخر کیخسرو کے ہاتھ سے افراسیاب مارا گیا اور قومی لڑائیوں کا فی الجملہ خاتمہ ہوا -

کیقباد و کیکاؤس و کیخسرو -

انشائے عجم کے ناظرین کو اس زمانے کے مختلف واقعات لٹریچر میں نظر آئیں گے - کہیں ہفتخوان رستم کا ذکر ہوگا - کہیں "نوشدارو پس از مرگ سہراب" کا محاورہ ملیگا - کہیں چاہ بیژن اور منیژہ کا حوالہ ہوگا - کبھی خونِ سیاوش - پرسیاوشان - کبھی سیمرغ اور کوہ قاف کے نام آئیں گے - جن کی تفصیل شاہنامہ وغیرہ میں ملیگی - افراسیاب کے بعد کیخسرو دنیا سے کنارہ کش ہو کے

لہراسپ گوشۂ عبادت میں گیا اور اپنے داماد لہراسپ کو سلطنت کرنے
گشتاسپ کے لئے چھوڑ دیا۔ لہراسپ کے بعد گشتاسپ بادشاہ ہوا۔
جسکے زمانے میں زرتشت کا ظہور اور آتش پرستی کا رواج ہوا۔ ولیعہد
سلطنت اسفندیار روئیں تن خواہ مخواہ رستم سے
حسد کرنے لگا اور خود ایک ہفتخواں سر کرکے بڑا نامور ہیرو اور
محسن کیانیاں سے لڑنے پر آمادہ ہوا نتیجہ یہ ہوا کہ رستم کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اسکے تھوڑے
عرصے کے بعد رستم کے سوتیلے بھائی شغاد نے ازراہ حسد رستم کی راہ میں
چاہ رستم ایک کنواں کھودا جو خس پوش تھا۔ رستم اپنے رخش پر سوار نادانستہ اس کنوئیں گرا اور ہلاک ہوا۔
گشتاسپ کے بعد بہمن درازدست بادشاہ ہوا پھر داراب
پھر اسکا بیٹا دارا جسکے باجگزار ممالک میں مصر و بابل و اشور و ہندوستان
دارا وغیرہ شامل تھے مگر عیش و عشرت کی اس زمانے میں اسقدر فراوانی ہو گئی
کہ شراب کو زہر خوشگوار بھی کہتے تھے اور پیتے بھی تھے۔ اسی بادشاہ نے
آبنائے باسفورس پر ایک ایسا پل بنایا تھا جو کھلتا اور بند ہوتا تھا۔
سکندر رومی اسی پل پر سے اپنا لشکر لے کے آیا (ملاحظہ ہو تاریخ ادب
ایران مولفۂ ایلزبیتھ ریڈ) اور دارا کو شکست دیکے ایران کا فاتح
مشہور ہوا۔

سکندر سکندر کی قسمت تاریخ عجم میں عجیب ہے ارداے
ویراف اسے "ملعون رومی" کہتا ہے۔ فردوسی اسے دارا کا
سوتیلا بھائی بتاتا ہے اور اس طرح یونانیوں کی عظمت کو عین
کیانیوں کی عظمت قرار دیتا ہے۔ نظامی نے اسے ذوالقرنین
سمجھا ہے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ

اس نے آتش پرستی کو مٹا کے خدائے واحد کی پرستش اہل ایران میں جاری کی۔

اشکانیان یونانیوں کی حکومت کے بعد پارتھیا کے لوگ یعنے **اشکانی** حکمراں ہوئے جنھیں عرب کے مؤرخ ملوک الطوائف کہتے ہیں اور اس خاندان کا خاتمہ **اردشیر بابکان** کے ہاتھ سے ہوا جو ساسانی خاندان کا پہلا حکمراں تھا اور اپنا نسب ساسان بن بہمن بن گشتاسپ تک پہونچاتا تھا۔

آل ساسان آل ساسان کے افسانے کسی قدر تاریخی پہلو لئے ہوئے ہیں۔ اسی خاندان کو اہل یونان "کسراس" اور عرب "اکاسرۂ عجم" کہتے ہیں۔ تاریخ عرب و عجم میں ان بادشاہوں کے حالات نہایت وقعت کے ساتھ درج ہوئے ہیں خصوصاً اردشیر و شاپور و نوشیرواں کے قصے آجتک دنیا کو بتا رہے ہیں کہ نصفت و عدالت شان و شوکت۔ سیاست و کیاست میں علم امتیاز انھیں کا بلند تھا مگر رومی مؤرخین انکے خلاف ہیں کیونکہ ان سلاطین کے ہاتھوں عیسائیوں کو شدید نقصانات پہونچے تھے۔

اردشیر **اردشیر بابکاں** کا پہلا کارنامہ یہ ہوا کہ ملوک الطوائف کے آخری بادشاہ **اردوان** کو حکمت عملی سے زیر کیا اور میدان جنگ میں شکست فاش دی۔ پھر قدم کردوں پر حملہ آور ہوا اور سلطنت کو ان کے دغدغے سے نجات دی۔ **ہفتان بخت** شہر کرمان کی ایک بلا تھی جس سے تمام ملک پریشان تھا۔ اردشیر نے

سلہ واحد کسرے

اس کا بھی خاتمہ کیا اور فرّ کیانی کی وقعت ثابت ہو گئی۔

شاپور — شاپور بن اردشیر کی عظمت بھی اپنے باپ سے کم نہیں۔ نقش رستم اور خرابۂ شاپور کے کتبوں سے ثابت ہے کہ اس نے قیصر روم کو شکست دیکر ایران کا اثر مشرق سے مغرب تک پھیلا دیا تھا۔ انھیں تحریروں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سلاطین ساسانیہ اپنی سلطنت کو خلافتِ الٰہی اور اپنے کو خلیفۃ اللہ بلکہ خدا کا وارث سمجھتے تھے چنانچہ ایک عبارت منقولہ کا ترجمہ یہ ہے :۔

"یہ توقیع ہے میجہ بندۂ خدا شاپور کی جس کی جگہ معبودوں میں ہے۔ جو شاہنشاہ ایران وغیرایران ہے۔ جو سلسلۂ آسمانی خدا کا وارث ہے۔ جو بیٹا بندۂ خدا اردشیر کا ہے" الخ

مانی — شاپور کے زمانے میں مانی ظاہر ہوا جس نے پہلے اس کے بھائی پیروز کو اور پھر خود شاپور کو اپنے مذہب میں داخل کیا۔ اسکے مذہب کو عربوں نے ثنویہ لکھا ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زرتشت کا مذہب بھی ایک قسم کی ثنویت ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ دونوں میں فرق کیا ہے اور کیوں ایک دوسرے کے مخالف ہیں؟ مذہب زرتشت یا مجوسیت میں ایک قادر مطلق یا خالق مطلق ہے۔ پھر اس کی دو حیثیتیں ہیں۔ ہرمزد (خالق خیر) اور آہرمنوش یا اہرمن (خالق شر) لیکن یہ مذہب مادّیت لئے ہوئے ہے تمام حیوانات و نباتات کو انسان کے فائدے کے لئے سمجھتا ہے اور خود انسان کو توالد و تناسل۔ جنگ و صلح سلطنت و تجارت وغیرہ کی اجازت دیتا ہے۔ برخلاف اسکے

مانی کا مذہب نور کو خیر اور ظلمت کو شر کہتا ہے اور تمام امور دنیا کو ظلمانیت یعنے خالق شر کا اثر سمجھتا ہے۔ لٹریچر میں بھی اتنا اثر موجود ہے کہ سیہ بخت سیہ روز۔ سیہ گلیم وغیرہ برے معنوں میں ہیں روشن روز۔ روشن رواں وغیرہ اچھی حالت ظاہر کرتے ہیں۔ مانی کا مذہب چاہتا ہے کہ انسان بالکل دنیا کو ترک کرے اور گوشۂ تجرّد میں بیٹھ کے اپنے کو فنا کر دے۔ اس مذہب کے پانچ درجے ہیں معلّمین (ابناء الرحم) مشمسین (ابناء العلم)۔ قسیسین (ابناء العقل) صدیقین (ابنائے ذاتِ غیر مرئی) سماعین (ابنائے ذکاوت)۔ (پروفیسر بیوَن کا خیال ہے کہ یہی صدیق رفتہ رفتہ زندیق ہو گیا اور خلیفہ مہدی باللہ کے زمانے میں تمام مانی کی امت کو زنادقہ کہنے لگے جن کا استیصال بنی عباس کے زمانے میں عرصے تک ہوا کیا)۔ مانی گوتم بدھ کو ہندوستان کا پیغمبر۔ جناب عیسیٰؑ کو سرزمین اسرائیل کا نبی اور اپنے کو بابل و نینوی وغیرہ کا پیغمبر سمجھتا تھا۔ اس کی کتابیں سات ہیں کتاب الھدیٰ والتدبیر سفر الجبابرہ۔ سفر الاسرار۔ کنز الاحیاء وغیرہ چھ کتابیں سریانی میں اور شاپورقان پہلوی میں ہے۔ اس نے اپنی تصانیف کے لئے ایک خاص خط ایجاد کیا تھا جو نہایت اہتمام سے لکھا جاتا تھا اور اسکے پیروؤں کا ایک گروہ اس رسم الخط کی خوشنمائی میں مدد دیتا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے مانی کو مصوّر سمجھا گیا ہے اور تصویر کشی اس کا معجزہ قرار دیا گیا ہے۔

غرض شاپور نے جب یہ مذہب قبول کیا تو ایرانیوں کو

شاق ہوا اور جب وہ لوگ بھی مانی کے آئین ماننے پر مجبور کئے گئے تو اور زیادہ پریشان ہوئے۔ آخر مجوسیوں کا ایک موبد بادشاہ کے سامنے آیا اور عرض کرنے لگا کہ اگر مجھے مناظرے کی اجازت دیجائے تو بہت اچھا ہے تاکہ حق و باطل کا فیصلہ ہوجائے اور ایران میں صرف ایک مذہب قائم رہے۔ بادشاہ نے اجازت دیدی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کو مانی کا مذہب ترک کرنا پڑا اور مجوسیت کو غلبہ ہوا۔ مانی پر حکم شرک لگایا گیا اور واجب القتل ٹھہرایا گیا مگر وہ ایران سے بھاگ گیا اور شاپور کے زمانۂ سلطنت تک ہندوستان و چین میں اپنا مذہب پھیلاتا رہا۔

ہرمزد — **شاپور** کے بعد اُس کا بیٹا **ہرمزد** تخت نشین ہوا۔ رام ہرمزد اسی کا بنایا ہوا ہے۔ ایک سال سلطنت کرکے انتقال

بہرام — پھر **بہرام** پسر **ہرمزد** مسند آرائے سلطنت ہوا اور جوشِ جوانی کی وجہ سے عیش و عشرت کیطرف مائل ہوگیا۔ بادشاہ کو عیش پرست سمجھ کے **مانی** واپس آیا اور چاہا کہ پھر اپنا مذہب پھیلائے مگر بہرام نے گرفتار کراکے اُس کی زندگی کا خاتمہ کردیا۔

قباد — اس کے بعد کئی صدیوں تک اکاسرۂ عجم مذہب زرتشت کے پیرو رہے یہانتک کہ **نوشیرواں عادل** کا زمانہ آیا۔ ابھی اسکا باپ کواد (قباد) سلطنت کر رہا تھا کہ ایک شخص

مزدک — **مزدک** ظاہر ہوا جس نے موبدوں کا اثر مٹا کے مساوات

بین الناس کو قائم کرنا چاہا اور خود پیغمبری کا دعوے کیا۔ **قباد** خود بھی چاہتا تھا کہ کسی طرح موبدوں کا اثر کم ہو۔ اس نے **مزدک** کو باریابی دی اور اس کا دین قبول کیا۔ اس کا خیال تھا کہ تمام برائیاں حرص و حسد و غصہ کے شیاطین کی وجہ سے دنیا میں آئی ہیں۔ **نوشیرواں** نے اسکے نیرنگ اور شعبدوں کی حقیقت بیان کر کے باپ کے خیالات بدل دیے۔ پھر ایک روز **مزدک** اور اسکے پیروؤں کی دعوت ایک باغ میں کی اور ظاہر کیا کہ اس تقریب کے موقع پر میں آئین **مزدک** کو قبول کرونگا۔ مزدکی لوگ جوق جوق آنے لگے لیکن جو گروہ باغ میں داخل ہوا **نوشیرواں** کے سپاہیوں نے اسے تہ تیغ کیا اور زمین میں سر کے بل دفن کر دیا اور پاؤں باہر نکلے رہے۔ آخر میں **مزدک** آیا۔ اسے نوشیرواں نے یہ دردناک منظر دکھایا اور کہا کہ تمھارے اقوال و اعمال کے یہ درخت اُگے ہیں"۔ پھر اسے بھی قتل کیا اور یوں ہی دفن کیا۔

نوشیرواں **نوشیرواں** جب خود بادشاہ ہوا تو بقیہ مزدکیوں کو رہنا دشوار ہو گیا۔ بیشتر ہلاک ہو گئے اور باقی خفیہ طور سے اپنے عقیدے پر قائم رہے مگر علانیہ زرتشت کے مذہب کو مانتے رہے۔ اس کے بیٹے **انوشہ زاد** نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا لہذا باپ کا برتاؤ اس مذہب کے ساتھ بھی اچھا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائی مورخ عدالت نوشیرواں کی شہرت کا سبب مزدکیوں اور عیسائیوں کے قتل کو بتاتے ہیں جو موبدانِ

پارس کی خوشنودی کا باعث ہوا تھا حقیقت یہ ہے کہ نوشیروان آن بادشاہوں میں سے گذرا ہے جس کی عقل وکیاست۔ فراخدلی اور عالی حوصلگی پر تاریخ سلاطین عالم کو ناز ہے اور جن لوگوں نے نوشیروان و قیاصرۂ روم کے محاربات وغیرہ کا حال پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ بادشاہ کس مرتبے کا تھا۔ اسکے ملفوظات واحکام کے ترجمے آجتک شہادت دیتے ہیں کہ معاملۂ عدل وانصاف میں کسی شاہزادے کا قتل کرڈالنا یا کسی ضعیف سے محجوج ہوجانا اسکے لئے ایک معمولی امر تھا۔ اسی کے زمانے میں ولادت حضرت رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام واقع ہوئی اور اسی کے ایوان کے چودہ کنگرے شب مولود گرے اور آتشکدے سرد ہوگئے۔ نوشیروان نے کاہنوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آل ساسان کے چودہ بادشاہ حکومت کرینگے پھر انکا زمانۂ سلطنت ختم ہوجائیگا اور پیغمبر عرب کے پیرو سلطنت عجم کے مالک ہونگے۔ بادشاہ نے کہا کہ کم سے کم دوسو برس کی مدت اس کو بھی چاہیئے۔ اصحاب فیل کا واقعہ بھی اسی زمانے میں ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ملک یمن ایرانیوں کے تصرف میں آگیا۔ ہندوستان ویونان کے فلسفہ وطب وغیرہ کی کتابوں کے ترجمے اسی کے حکم سے پہلوی میں کئے گئے اور ملک خاطر خواہ ترقی پذیر ہوا۔

زوال کا اثر

نوشیروان کے بعد اس کا بیٹا انوشہ زاد تخت نشین ہوا۔ پھر ہرمزد چہارم بادشاہ ہوا جسکی سفاہت وظلم کی وجہ سے بہرام چوبین غالب آگیا اور ساسانیوں کی سلطنت

کمزور ہونے لگی پھر خسرو پرویز کی باری آئی مگر وہ زیادہ سلطنت نہ کرسکا اور اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس ظالم بیٹے نے بادشاہ ہوتے ہی اپنے اٹھارہ بھائیوں کو بھی قتل کر ڈالا اور بالآخر خود بھی مر گیا۔ اسی زمانے میں مرض طاعون پھیلا اور رہا سہا ایران غارت ہوگیا۔ پھر اس کا ہفت سالہ بچہ اردشیر بادشاہ بنایا گیا مگر وہ بھی غاصب شہر براز کے ہاتھوں قتل ہوا۔ پھر پوران دخت پرویز کی بیٹی بادشاہ ہوئی جس نے اپنی قابلیت خداداد سے ملک کی حالت بہت کچھ درست کی مگر موت نے اسے بھی مہلت نہ دی۔ اسکے بعد پیروز پچہ اسکی بہن آرزم دخت کو سلطنت ملی مگر یہ سب بھی تباہ ہوئے۔ خلاصہ یہ کہ خسرو پرویز سے لیکے یزدجرد سوم تک تیرہ بادشاہ ہوئے اور پانچ برس کے عرصے میں سب ختم ہوگئے۔ آخری بادشاہ عربوں سے شکست کھاکے بھاگا اور ایک بے حقیقت مخلوق کے ہاتھ سے طمع زر میں مارا گیا۔

اب اس خاندان کے قصے زبانوں پر ہیں اور کتابے شکستہ دیواروں پر۔ اسلام کے آنے سے ایران کی حالت بالکل بدل گئی۔ نہ وہ لٹریچر رہا۔ نہ وہ مذہبی خیالات۔ نہ وہ عقائد۔ نہ وہ رسوم۔ البتہ دوربین نظریں آنے والے تمدن میں مٹے ہوئے نشان ان صنادید عجم کے دیکھتی ہیں اور چشم ظاہربیں کے لئے صرف اتنا ہے کہ

پردہ داری می کند بر طاق کسریٰ عنکبوت　　چغد نوبت میزند بر گنبدِ افراسیاب

باب سوم
آغاز اسلام و انشائے عجم

عرب کا داخلہ

یزدجرد سوم کے خاتمہ نے آل ساسان اور دین زرتشت کی شوکت کو ایران سے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور دین اسلام اور تمدن عرب کا فاتحانہ شان سے گل و بلبل کی سرزمین پہ داخلہ ہوا۔ فاتحوں کی شجاعت و ذکاوت اور زبان عربی کی فصاحت و وسعت نے جب ایران سا سرسبز و شاداب ملک اور ایرانیوں سے نفیس الطبع لوگ پائے تو دونوں قوموں کے باہمی تعلقات سے سیاسی اور علمی منظر رنگ بدلنے لگے۔ یوں تو یونانیوں اور اشکانیوں کی بھی صدیوں عملداری رہی مگر ایران کی زبان کسی طرح تسخیر نہ ہوئی۔ خدا جانے سامی زبانوں میں کیا جذب تھا کہ قبل اسلام ارامی و کلدانی و سریانی وغیرہ سے یہ زبان متاثر ہوئی اور اس صلاحیت تاثر اور مادّہ قبول کا یہ نتیجہ ہوا کہ عربوں کے آتے ہی ان کی زبان کے الفاظ اس کثرت سے داخل ہوئے کہ آج بغیر عربی کی اچھی تعلیم کے فارسی زبان کے خصوصیات سے لذت ملنا ناممکن ہے۔

زبان پر عرب کا اثر

ایرانیوں نے سب سے پہلے اپنے حروف تہجی یک قلم موقوف کئے اور عرب کے حروف تہجی کو ایرانی جامہ پہنایا۔ جہاں آوازیں مشترک تھیں

وہاں عربی حروف کا داخل کرنا آسان تھا۔ غیر مشترک آوازوں کے لئے پ۔ چ۔ ژ۔ گ اختراع کئے گئے اور باے فارسی۔ جیم فارسی۔ زاے فارسی اور کاف فارسی نام رکھے گئے۔ پھر عربی صرف و نحو کی تقلید شروع کی اور اضافت و توصیف و تصغیر و نسبت وغیرہ کو اختیار کر کے زبان کو وسیع کیا۔ اسکے بعد عربی الفاظ و محاورات پر تصرّف شروع کئے اور معنی وضعی کا فی الجملہ لحاظ کر کے اپنی زبان میں نازک طریقوں سے الفاظ عرب کا استعمال شروع کیا مثلاً سَیر عربی میں چلنے کو کہتے ہیں لیکن فارسی میں سیر کردن محض دیکھنے کے معنوں میں رہ گیا اور تماشا کا بھی یہی حال ہوا کہ "نظارہ" کے حدود میں آگیا۔ یا شمّہ عربی میں سونگھنا تھا۔ فارسی میں ذرا سی چیز کو کہتے ہیں (جتنی شاید سونگھنے کو درکار ہوتی ہے)۔ اسی طرح ارتفاع و سبق وغیرہ وغیرہ بکثرت الفاظ ہیں جنکے عربی و فارسی معانی میں تفاوت بعیدہ ہوگیا ہے حالانکہ بالاصالۃ عربی ہیں۔ اسکے علاوہ بہت سے مشدّد الفاظ کی تشدید کو دور کیا کہ زبان میں ثقل نہ پیدا ہو۔ خاصیت و کیفیت و جادہ وغیرہ اسی کی مثالیں ہیں۔ پھر عربی مرکبات کو بطور مفرد بولنا شروع کیا۔ ماجرا۔ ماورا۔ ماسوا وغیرہ کے لفظی معنی دیکھو اور فارسی میں ان کا بے تکلف استعمال دیکھو۔ عربی محاورات کو بھی اپنی زبان میں داخل کیا مثلاً زر خالص کو زر جعفری کہنے لگے حالانکہ نسبت خود بتاتی ہے کہ جعفر برمکی کیوجہ سے عرب میں خالص سونے کا چلن ہوا تھا عجم سے کیا واسطہ؟ اور زر مغربی

کہنا اور تعجب خیز ہے کیونکہ عرب اقصاے مغرب کے سونے کو خالص سمجھتے تھے۔ ایرانیوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اسی طرح لالہ کو شقائق یا شقائق النعمان کہنا یا طوفان نوح و یرش ذوالفقار وغیرہ کی تلمیحیں بے تکلف لانا یاویس ورامیں وغیرہ کو چھوڑ کر قیس ولیلی۔ وامق و عذرا۔ سعد وسلمیٰ کا ذکر کرنا یا نفس زدن صبح۔ شب زندہ داری بسرو چشم وخنکی چشم۔ دختر رز۔ اشک شمع۔ دامن کشاں رفتن۔ وغیرہ وغیرہ بولنا ان سب سے ثابت ہوتا ہے کہ فارسی زبان نے عرب کا اثر بہت جلد قبول کیا اور اپنے کو اس قابل بنایا کہ علوم وفنون قدیمہ و جدیدہ کے لئے مختلف اعتبارات سے مفید ثابت ہو۔

عربی زبان ایران میں

تاریخ بتاتی ہے کہ جنگ ذوقار اور قادسیہ کے بعد سے انشاے عجم پر سطوت عرب قائم ہوگئی اور مفتوحین کو فاتحین کے علوم وفنون سیکھنے میں اس قدر انہماک ہوا کہ تحریر وتقریر بیشتر عربی میں ہونے لگی۔ دواوین ودفاتر کی زبان عربی تھی۔ غرض ان ڈھائی تین صدیوں میں ایسا کچھ ہوا کہ اسلامی علوم وفنون کے بیشتر ائمہ عجمی نژاد لوگ ہوئے۔ حدیث۔ تفسیر۔ فقہ۔ اصول۔ معانی بیان وغیرہ میں جس قدر بیش بہا کتابیں ایرانیوں کے قلم سے نکلی ہیں اگر ان کا احصا کیا جاے تو ایرانی زبان کی تاریخ کے بجائے یہ کتاب عربی زبان کی تاریخ ہوجائیگی۔

عرب جاہلیت

اب دیکھنا یہ ہے کہ عربی علوم وخیالات کا اثر اہل عجم پر تدریجاً کیونکر ہوا؟ زمانۂ سرورکائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک

عرب کے تمدن و معاشرت کے متعلق مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملوک حمیر و غسّان وغیرہ کے درباروں کے علاوہ اس ملک میں بدویت غالب تھی اور صرافتِ نسب۔ حمیّت قوم آزادی خیال یہاں کے رہنے والوں کے خاص جوہر تھے۔ یہ قوم اگرچہ قعر جہالت میں پڑی تھی اور (بقول گبن) علوم و فنون کی لہریں اوپر ہی اوپر گذر جاتی تھیں اور ان لوگوں کو خبر بھی نہ ہوتی تھی لیکن فنِ شعر و خطابت میں انھیں ید طولیٰ ہو گیا تھا۔

حقیقت — حقیقت شعر[1] کے جاننے والے اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ شاعری ایک وجدانی اور ذوقی چیز ہے جس کا تعلق احساس سے ہے۔ احساس کسی اثر ڈالنے والے واقعے سے متاثر ہونے کو کہتے ہیں اور ادراک اشیا کا معلوم کرنا اور استدلال و استنباط سے کام لیتا ہے۔ مثلاً کسی واقعے سے صدمہ ہونا یا کسی بات پر حیرت ہونا یا کسی امر سے خوش ہو جانا یہ سب احساسات ہیں اور شعر فی الحقیقت احساسات کی تصویر ہے جو الفاظ میں کھینچی جاتی ہے اس غرض سے کہ یہ تصویر دوسروں کے دلوں پر وہی اثر ڈالے جو قائل کے دل پر پیدا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض محققین فلک نیلگوں۔ نجم درخشاں۔ نسیم صبح۔ شادابی چمن۔ ویرانی بیابان وغیرہ کو شعر سمجھتے ہیں کیونکہ ان چیزوں سے دل پر اثر ہوتا ہے۔

محاکات — اس تصویر کشی کا علمی نام محاکات ہے جس کا موقلم تخییل ہے

[1] مولانا شبلی نعمانی نے شعر العجم کی چوتھی جلد میں اس پر محققانہ بحث لکھی ہے جو قابل ملاحظہ ہے۔ یہاں بھی بیشتر وہیں سے درج کیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شاعر جب کسی کیفیت قلبی یا موجود خارجی کی تصویر شعر کے ذریعے سے کھینچنا چاہتا ہے تو اُن امور کا برتنا فرض سمجھتا ہے جنسے سامع پر بھی اثر ہو اور تناسب الفاظ۔حد بیان اور لہجۂ ادا کا پورا خیال رکھتا ہے جسکے مجموعے کو عروضی اصطلاح میں وزن و بحر وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ہم دیکھتے ہیں کہ شعرائے کاملین جس امر کا اظہار چاہتے ہیں یا جیسا اثر ڈالنا چاہتے ہیں اُسکے مناسب بحر و ردیف و قافیہ وغیرہ اختیار کرتے ہیں اور محض لفاظی کے شاعر کسی خیال کے موزوں کر لینے کو شعر سمجھتے ہیں حالانکہ چند الفاظ کا کسی بحر عروضی کے مطابق کر لینا اور بات ہے اور اپنے خیال کے لئے مناسب وزن کا منتخب کرنا اور بات ہے۔

دانند آنکس [illegible] کلامے دارد ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

کہتے ہیں [illegible] ہندی شاعر شیخ علی حزیں کے سامنے یہ شعر بغرض اصلاح لے گیا۔

سیہ چوری بدست آں نگار نازنیں دیدم
بشاخِ صندلیں پیچیدہ مارے عنبریں دیدم

اُنھوں نے آخری دو لفظ دونوں مصرعوں سے کاٹ دئے اور کہا کہ جبتک انتخابِ بحر کا سلیقہ نہ ہو شعر کہنا بیکار ہے۔اب شعر یوں رہ گیا:۔

سیہ چوری بدست آں نگارے بشاخِ صندلیں پیچیدہ مارے

اہل ذوق سمجھتے ہیں کہ محض بحر کے بدلنے سے شعر کا اثر کیا سے کیا ہو گیا۔

تخیئیل قوت اختراع کا نام ہے جو احساسات کے چربے میں رنگ آمیزی

کرتی ہے بلکہ اگر ادراکات بھی قیدِ وزن و قافیہ وغیرہ میں آتے ہیں تو اُن پر بھی شاعرانہ رنگ چڑھا دینا اسی قوتِ اختراع کا کام ہے مثلاً آفتاب کا وقت طلوع سُرخی مائل ہونا۔ دریاؤں کا بہنا۔ حبابوں کا اُبھرنا اور پھوٹنا۔ موجوں کا دریا کے کناروں سے ٹکرانا۔ ان موجوداتِ خارجی کا حال اتنے ہی الفاظ میں بیان کر دینا محاکات ہے جیسا کہ اکثر نیچرل نظموں میں آجکل نظر آتا ہے۔ انیس نے بھی اسی حالت کا نقش کھینچا ہے اور اس محاکات پر دو طرح کے رنگ چڑھائے ہیں۔ ایک رنگ وہ ہے جو ہر صاحب ذوق کو روزانہ نظر آتا ہے اور شاعر کی قوتِ تخییل ان موجودات کے مشابہات بیان کرکے تصویر میں رنگ بھرتی ہے (اس مثال میں محض آفتاب نکلنے کا ذکر ہے) :-

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح گلزارِ شب خزاں ہوا آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح سرگرمِ ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح

تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

دوسرا سماں صبحِ عاشور کا ہے۔ شاعر موجوداتِ خارجیہ کی تصویر کھینچتا ہے مگر اسی رنگ میں جو اُسے نظر آتا ہے کیونکہ خود سماں ان سے اور حسینؑ مظلوم کا ماتمدار :-

تھا بسکہ روزِ قتلِ شہِ آسماں جناب تھا خوں کو ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب
تھی نہرِ علقمہ بھی خجالت سے آب آب روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں ہر حباب

اک دھوم تھی جو قتلِ شہِ کائنات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

محاکات کا کمال

غرضکہ محاکات کا کمال یہ ہے کہ مطابقِ اصل ہو اور اگر ضرورت ہو تو جزئیات کا بھی استقصا کر لیا جائے تاکہ پوری شے کی تصویر نظر آجائے بلکہ الفاظ کی نرمی و درشتی اور آوازوں کی بلندی و پستی سے بھی حسب ضرورت کام لیا جائے ورنہ محاکات ناقص رہ جائیگی۔ مثلاً طوفان نوح کا زور شور جب حد سے گذرا تو حکم الٰہی ہوا کہ بارش موقوف ہو اور زمین کا پانی بھی خشک ہو جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں حکم خدا کے یہ الفاظ ہیں:۔

يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ

اے زمین اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان صاف ہو جا اور پانی سوکھ گیا

وَقُضِيَ الْأَمْرُ

اور حکم پورا ہو گیا۔

الفاظ کی آوازیں عربی میں خود ظاہر کرتی ہیں کہ یہ کوئی ہیبت کا مقام جس کا نقشہ اردو ترجمہ نہ کھینچ سکا کیونکہ یہ محاکات حکایت الصوت پر مبنی ہے جو عربی سے اس مقام پر مخصوص ہے۔ اسی طرح معانی میں بھی مقتضائے حال کا خیال رکھا جاتا ہے مثلاً شاعر کے خیال میں امام حسینؑ کے پاس کربلا میں ایک مسافر آیا مگر فرزند رسول کو اس حالِ زار میں دیکھ کے نہ پہچان سکا۔ اس نے پوچھا کہ "آپ کون شخص ہیں" جواب کامل یوں ہو تاکہ بتلایا جاتا ہیں بہت بڑی عزت والا شخص ہوں فرزند رسول ہوں۔ زمیں و آسمان پر میرا تصرف ہے لیکن مقتضائے حال ان تمام تفصیلوں کو روکتا ہے۔ انیس کو اس موقع کا پورا لحاظ ہے اپنے اعتقاد یا حقیقت حال کو پہلے مصرع میں ظاہر کئے دیتے ہیں لیکن محاکات کو اس رنگ آمیزی سے الگ رکھتے ہیں کہ تصویر کی

نفاست میں فرق نہ آئے۔

یہ تو نہ کہہ سکے کہ شتر مشر قلین ہوں　　مولانے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

تخییل کا زور یہ ہے کہ شاعر کائنات کو اپنے رنگ میں کھینچ لاتا ہے۔ تخییل کا زو

بادشاہ کے تاج کے لئے موتی درکار ہوتے ہیں تو یوں کہتا ہے:۔

علم برکش ای آفتابِ بلند　　خراماں شوای ابرِ مشکیں پرند

بیارای ہوا قطرۂ ناب را　　بگیرای صدف دُرکن آں آب را

برآای دُر از قعر دریای خویش　　بہ تاجِ سرِ شاہ کُن جای خویش

اگران اشعار میں قوت تخییل خطاب کا رنگ نہ بھرتی تو محاکاتِ محض تھی کیونکہ اُس زمانے کے لوگ موتی کی پیدائش یوں ہی مانتے تھے مگر قوتِ تخییل نے خطاب کا رنگ بھر کے سطوت شاہانہ کو ظاہر کردیا جس کے بغیر تصویر ناقص رہی جاتی تھی یا مثلاً باز وغیرہ کی عادت ہوتی ہے کہ بار بار اُس تسمے کو نوچتے ہیں جن سے پاؤں بندھا ہوتا ہے۔ بادشاہ کے ہاتھ پر یہی باز بیٹھا ہے سلمان ساوجی محاکات کے ساتھ ساتھ صنعت حسن تعلیل اپنی قوت تخییل سے پیدا کرتا ہے اور یوں کہتا ہے:۔

گشتست پای باز مشرّف بدست تو　　بر پای خویش بوسہ بیابی ازاں دہد

یا مثلاً مسائل فلسفہ و منطقیہ وغیرہ پر نظر ثانی کی جاتی ہے تو قوت تخییل اُن رازوں کو کھول دیتی ہے جو روکھا سوکھا فلسفہ کبھی ادا نہ کرسکتا۔

موجیم کہ آسودگیٔ ما عدم ماست　　ما زندہ بہ آنیم کہ آرام نگیریم

دیکھنا کس لطف سے اس مسئلہ کا انکشاف ہوا کہ جو چیز ساکن نظر آرہی اُس کے بھی ذرّات ضرور متحرک ہونگے کیونکہ سکونِ محض کا نتیجہ عدم ہے اور وجود حرکت کا نتیجہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اہل فلسفہ اسے قضیہ شعریہ

کہہ کے مغالطات کی فہرست میں جگہ دیں مگر اثر کے لحاظ سے جو اس تخییل کا مرتبہ ہے اسے اہل ذوق ہی خوب سمجھتے ہیں۔ اسی قوت نے تشبیہ و استعارہ۔ صنائع و بدائع حسنِ بندش و ترکیب وغیرہ کو خلق کیا ہے۔ صاحب ذوق سلیم اپنے اندازۂ صحیح کی بنا پر ان سے کام لیتا ہے اور محسوسات بلکہ معقولات تک کی تصویریں نہایت عمدہ رنگ میں کھینچتا ہے مگر جن کا مذاق بگڑا ہوتا ہے وہ محاکات و تخییل کے استعمال میں بے اعتدالی کرتے ہیں اور شعر ان کا بے اثر ہو جاتا ہے۔

شعر جاہلیت

شعرائے جاہلیت ان بے اعتدالیوں سے اکثر بری تھے۔ جس حرّیت و شرافت کی آب و ہوا میں ان کی پرورش ہو رہی تھی وہاں تملّق اور چاپلوسی کا گذر نہ تھا۔ یہ لوگ اپنے رنگ میں مست تھے اور اسی مستی کے عالم میں شعر بھی کہہ گذرتے تھے جو سراسر حقیقت ہوتا تھا۔ گرم ملک میں نشو و نما۔ خون کا رگوں میں جوش مارنا۔ قوم آزاد اور آزادی پرست! ایسے عالم میں ارادے بڑھے ہوتے ہیں اور امنگوں کا زور ہوتا ہے۔ فسق ہو یا تقوی۔ خیر ہو یا شر۔ جنگ ہو یا صلح۔ غرض ہر بات بالارادہ آزادی سے کی جاتی تھی اور جب کامیابی ہوتی تھی تو اس پر فخریہ شعر کہے جاتے تھے حسّان بن ثابت کے وقت تک یہ حالت تھی جنھوں نے زمانۂ اسلام کو بھی دیکھا تھا کہ جب ان سے اچھے شعر کی تعریف پوچھی گئی تو کہا۔

وان اشعر بیت انت قائلہ   بیت یقال اذا انشدتہ صدقا

سب سے اچھا شعر جو تونے کہا ہے وہ شعر ہے کہ جب تو اسے پڑھے تو کہا جائے کہ سچ کہا۔ قوت تخییل بھی بقدر مناسب استعمال ہوتی تھی بلکہ جدّتِ خیال

کبھی کبھی حقیقت سے بھی دور ہو جاتی تھی مگر ایسی جدّت معیوب تھی۔ نابغہ نے عمدہ شعر کی تعریف میں جو کہا تھا اُس کا نظامی نے یوں ترجمہ کیا ہے۔

در شعر مپیچ و در فن او ... چوں اکذب اوست احسن او

یہ بھی ایک آزادی خیال کی دلیل ہے ورنہ قضیۂ شعریہ کے سلسلے میں بھی بیان ہو چکا ہے کہ جدّت تخییل سے کیا کیا فائدے ہوتے ہیں۔ اس قوم کے عشق و حسن کے افسانے بھی بالکل نیچرل ہیں اور اُس کے عنوان اظہار بھی سراسر موافق فطرت ہیں۔ بنی اُمیہ کے دور میں سلطنت قائم ہوئی تو آزادی خیال پر دوسرے تمدّن کا اثر ہوا جس زمانے میں جھوٹی حدیثیں بنانا آسان ہو، اگر شعر بھی جھوٹی طرح سرائیوں کے کام میں آنے لگا ہو تو مستبعد نہیں۔ خلفائے عباسیہ کے دور میں تو کچھ ایسا ہوا کہ فن شعر پرانی روش سے بالکل جدا ہو گیا۔ سلاطین و وزرا کو خوش کرنا اور انعامات و جائزات حاصل کرنا شاعروں کا پیشہ ہو گیا۔ یہ زمانہ خالی محاکات یا سچی تعریفوں کو کہاں پسند کر سکتا تھا۔ قوت تخییل نے غلبہ حاصل کیا۔ جدّت طرازیاں اور رنگ آمیزیاں ہونے لگیں۔ ہر شاعر یہ چاہتا تھا کہ کوئی نیا مضمون باندھے تاکہ زیادہ انعام ملے۔ غرض کہ اس عہد (۸۰۰ھ) میں نازک خیالی اور مضمون آفرینی کا دور ہو گیا اور متنبّی اور ابو العلاء معرّی وغیرہ کا رنگ پھیل گیا۔

عجم میں تقلید عرب

ایرانیوں میں جو علمی رنگ عربوں کا اچھی طرح پھیلنے لگا وہ اسی زمانے کا رنگ تھا۔ یہ رنگ زیادہ تر خطابت کا تھا جو شعر کے رنگ پر غالب آ گیا تھا۔ سامعین کو محظوظ و متاثر کرنا شاعروں کا فرض تھا ورنہ حقیقت میں

یہ فرض خطیب کا ہے کہ اپنے لکچر کے اثر سے سننے والوں کو متاثر کرے۔ شاعر محض کیفیات قلبی کا بیان کرنے والا ہے۔ گویا اپنے شعر کا مخاطب صحیح خود ہی ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد۔

اختلاف مذہب

اسی سلسلے میں عرب کی مذہبی تاریخ پر بھی نظر رکھنا چاہیئے۔ اصولی اختلافات نے مسلمانوں کو تین فرقوں پر منقسم کر دیا تھا۔ سنّی۔ شیعہ۔ خارجی۔ پھر ہر شعبہ میں فروعی اختلافات ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر گروہ کئی کئی گروہوں پر تقسیم ہو گیا۔ ہمیں اس مقام پر بخوف طول اس تاریخ کو ترک کرنا پڑتا ہے اگرچہ عجم کی انشا پردازی اور انشا پروری پر اختلاف مذاہب کا بھی خاص اثر ہوا ہے اور مختصراً اتنا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت وقت کی عنایت جس فرقے پر ہوئی یا پبلک کا انہماک جس رنگ کی طرف ہوا اُس قسم کی انشا میں خاص قوت پیدا ہو گئی۔ خصوصاً علمِ کلام کے اختلافات نے خیالاتِ عوام پر جو اثر ڈالا اُس کا نتیجہ انشا میں بالخصوص نظر آتا ہے۔ عدلیہ۔ جبریہ۔ مفوضہ۔ غُلاۃ۔ قدریہ نے اپنے اپنے خیالات پھیلانے کے لئے کبھی نثر کو ذریعہ قرار دیا کبھی قضیہ شعریہ سے مدد لی تھیں۔ ایسے ہنگاموں میں ایک گروہ صوفیوں کا ظاہر ہوا جس کا اثر فارسی کی نثر و نظم پر بلکہ مذہب پر بھی کافی طور سے طاری ہوا ہے۔

تصوف

تصوف کا لفظ بظاہر "صوف" سے مشتق ہے جس کے معنے ہیں بالوں کا کپڑا۔ اور چونکہ بیشتر حضرات صوفیہ لباس صوف پہنتے تھے اس وجہ سے صوفی کہلاتے تھے۔ فارسی زبان میں ان لوگوں کو "پشمینہ پوش" بھی کہتے ہیں جس سے اس اشتقاق کی تصدیق ہوتی ہے ورنہ اہل لغت نے "صفا" (صفائے قلب) سے بھی مشتق کیا ہے اور ان لوگوں کو اہل الصفا

کہا ہے اور بعض نے یونانی لفظ "سفاس" سے اسکا اشتقاق کیا ہے۔ اس فرقے کی ابتدا اُس مخالفت سے بتائی گئی ہے جو دنیوی تلذّذ اور عیش سے زہّاد قوم میں پیدا ہو جاتی ہے اور لباسِ صوف سے اس امر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو دنیوی لذتوں سے کوئی سروکار نہیں جس زمانے میں فارسی لٹریچر کی بعدِ ظہورِ اسلام ابتدا ہونے والی تھی اُس وقت تک حسن بصری۔ سفیان ثوری فضیل بن عیاض۔ ابراہیم ادہم۔ رابعۂ عدویہ وغیرہ گذر چکے تھے جو اس فرقے کے سلف صالح کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں کا اعتقاد تھا کہ خدا فاعل مطلق ہے اور خیر و شر محض اُن اعتبارات کے نام ہیں جو انسانوں نے قائم کئے ہیں۔ رفتہ رفتہ وحدت حقیقی کا پرتو ان لوگوں کو نظر آیا اور "ہمہ اوست" کا اعتقاد راسخ ہوا۔ انکے اقطاب و اوتاد وغیرہ کے حالات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وحدت الوجود کے ساتھ ساتھ بے ثباتی عالم پر وثوق بلکہ وجود اشیا کو موہوم سمجھکر اُن سے کنارہ کشی۔ ریاضتہائے شاقہ میں عمر بسر کرنا اور فنا ہو کر بقا حاصل کرنا اس فرقے کے خصوصیات میں سے تھا اور جن انشاپردازوں پر اس رنگ کا اثر پڑا ہے انکے اقوال سے فلسفۂ اخلاق اور الٰہیات کے عجیب عجیب مسائل حل ہوئے ہیں جن کا ذکر مناسب مقاموں پر آئے گا حسن مطلق سے عشق انکا شعار تھا اور مجاز کو حقیقت کا زینہ سمجھتے تھے۔ توحید باری سے مراد انکے نزدیک محض نفی شرک نہیں بلکہ ماسوی اللہ کو بے حقیقت سمجھنا ہے اور حقیقت محض اُسی کی "ذات واحد" کو ماننا ہے۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ چونکہ خدا ایک خزانۂ مخفی تھا اور (موافق الفاظ حدیث قدسی) اُس نے محض اپنی معرفت کے لئے خلق کو پیدا کیا

لہذا اسی معرفت کے لئے اضداد کو ظہور میں لایا ظلمت اس لئے کہ نور ممتاز ہو۔ شر اس لئے کہ خیر کی معرفت ہو۔ مرض کی غرض یہ ہے کہ صحت کی برکت کا احساس ہو ورنہ ذات بحت ان تمام امور سے بلند تر ہے البتہ ہر فرد ماسوی اللہ کے کسی نہ کسی اسم الٰہی کا مظہر ہے۔

اب بخوف طول تشریح ترک کی جاتی ہے اور یہ مضمون اتنے تبصرے پر ختم کیا جاتا ہے کہ تصوف میں اہل عجم کو امتیاز خاص حاصل ہوا اور انھیں کے تصانیف عربیہ و فارسیہ سے خیالات و حالات صوفیہ اہل اسلام میں پھیلے۔



باب چہارم

طاہریہ وصفاریہ

جنگ قادسیہ سے مامون الرشید کے عہد تک تقریباً دو سو برس کا زمانہ گذرتا ہے۔ اس اثنا میں عجم پر علوم عرب کا کیا اثر ہوا اس کی تفصیل کے لئے اُن مصنفات علمیہ کو دیکھنا چاہیئے جو اہل عجم کے قلم سے عربی زبان میں لکھے گئے کیونکہ نئی روشنی نے اس زمانے کے لوگوں کو ایسے عالم انوار میں پہونچا دیا جہاں قبل اسلام کی زبان اور خیالات کا رنگ بالکل ماند ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے آئمۂ حدیث و لغت و فلسفہ و فقہ و اصول بھی ایرانی لوگ تھے اور نشر علوم اسلامیہ و اصلاح معارف ملیہ میں جسقدر کوشش ایرانیوں کے دست و قلم سے ہوئی اُس کا اندازہ تاریخ اسلام کے پڑھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ فارسی زبان میں لکھنے پڑھنے کا آغاز مامون رشید کے عہد میں معلوم ہوتا ہے اور مرو کا ایک شاعر ابوالعباس اس قابل نظر آتا ہے جس کا نام ابتدا میں لیا جائے[1]۔ اس نے مامون رشید کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کے آخری اشعار میں فارسی کا پہلا شاعر ہونے کا دعوےٰ کیا ہے۔

مامون الرشید کا زمانہ

ابوالعباس مروزی

ای رسانیدہ بدولت فرق خود بر فرقدین
گسترانیدہ بہ فضل وجود در عالم یدین

---

[1] صاحب مجمع الفصحا نے اس سے قبل بہرام اور ابوحفص سعدی کا ذکر کیا ہے۔

مر خلافت را تو شائستہ چو مردم دیدہ را
دین یزداں را تو بائستہ چو رخ را ہر دو عین

. . . .

. . . .

کس بدیں منوال پیش از من چنیں شعرے نگفت
مر زبان پارسی را ہست با ایں نوع بین
لیک ازاں گفتم من ایں مدحت ترا دراین لغت
گیرد از مدح وثنائے حضرتِ تو زیب و زین

ان اشعار سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ بحر عربی سے حاصل کی گئی ہے مگر نفاست طبع نے ارکان افاعیل کو اسی قالب میں ڈھالا ہے جو فارسی کے لئے موزوں ہیں اور ترقی کے معنے بھی یہی ہیں جیسا کہ سکاکی نے بحور عروضی کے گننے کے بعد کہا ہے :-

"ترقی باواز بلند پکار رہی ہے۔ کہہ دو طبع سلیم سے کہ جو چاہے ان پہ بڑھائے یہاں سلامتی طبع کے سوا کسی کی حکومت نہیں"

ہم آگے بڑھ کے دیکھیں گے کہ شعرائے عجم نے نہ صرف بعض زحافات کو زبان فارسی کی شاعری کے لئے مخصوص کیا بلکہ نئی نئی بحریں اور نئے نئے اقسام شعر بھی پیدا کئے ورنہ عرب سے صرف قصیدہ گوئی ملی تھی اور ابتدائی شعرائے عجم بھی قصیدہ گوئی پہ اکتفا کرتے نظر آتے ہیں اور وہ بھی محض مدح سلاطین میں۔

اسی بادشاہ کے عہد میں جب تیسری صدی کا آغاز ہوا تو دربارِ خلافت کے سپہ سالار **طاہر ذوالیمینین** کو خراسان کی گورنری ملی۔ طاہر کو خود مختاری کا دعویٰ نہ تھا مگر سطوت واقتدار نے اس کو

اور اسکے خاندان کو مثل خود مختار حکمرانوں کے بتا دیا تھا۔ یہ خاندان عربی نژاد تھا لیکن دربار کی زینت کے لئے شعرا کا ہونا بھی لازم تھا اس لئے بعض شاعر پیدا ہو گئے۔

حنظلہ بادغیسی غالباً پہلا شخص ہے جس نے باقاعدہ شاعری اختیار کی۔ صاحب چہار مقالہ نے اسے صاحب دیوان کہا ہے۔ چند اشعار یہ ہیں۔

یارم سپند گرچہ بر آتش ہمی فگند از بہر چشم تا نرسد مر ورا گزند
او را سپند و مجمرہ ناید ہمیں بکار با روے ہمچو آتش و با خال چوں سپند

اسی حنظلہ کے دو شعر **چہار مقالہ** میں درج ہیں جنھیں پڑھ کے احمد خجستانی حکومت کے شوق میں اپنے گدھے بیچ کے نکل کھڑا ہوا اور رفتہ رفتہ بیہق و خواف و نیشاپور پر قابض ہو گیا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر دیوان حنظلہ نہ بڑھتا تو یہ حکومت نہ ملتی (پروفیسر براؤن کا قیاس ہے کہ سامانیوں کے زمانے میں اس عہد کے فارسی اشعار زبان زد خاص و عام تھے۔ اگرچہ شعرا کے نام نہیں ملتے نہ کلام ملتا ہے) سال وفات حنظلہ کا ۲۱۹ھ ہے۔

محمود وراق ۲۲۱ھ میں فوت ہوا۔ محمد بن طاہر کا درباری تھا۔ دو شعر اسکے نقل کئے گئے ہیں :۔

نگارینا بہ نقد جانت ندہم گرانی در بہا ارزانت ندہم
گرفتستم بہ جاں دامانِ وصلت نہم جاں از کف و دامانت ندہم

دیکھنا! ان اشعار میں غزل گوئی کی ابتدا نظر آتی ہے۔ عربی تشبیبِ قصیدہ میں عاشقانہ اشعار کہتے تھے۔ شاید اسی ٹکڑے کو ایرانیوں نے

جدا کر لیا ہے اور بعد کے شعرا نے اُس کا غزل نام رکھ کے ایک علٰحدہ صنف نظم کی قرار دیدی ہے۔ محمود کا مذاق شعر بھی ایرانی رنگ میں آگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عرب سے کوئی سروکار نہیں۔

فیروز مشرقی یمنی الاصل تھا۔ ۲۸۳ھ میں وفات پائی۔ چند شعر منقول ہیں:-

مرغیست خدنگ او عجب دیدی | مرغیکہ شکار او ہمہ جانا
داده پر خویش کرگسش ہدیہ | تا بچہ اش را بردیہ مہمانا

دلہ

سرو سیمین ترا در مشک تر | زلف مشکین تو سر تا پا گرفت

صفاریہ خاندان طاہریہ کے آخری حکمراں محمد بن طاہر کو ۲۵۹ھ میں **یعقوب بن لیث صفار** نے گرفتار کر کے اس خاندان کا خاتمہ کیا اور خراسان و فارس پر **صفاری** خاندان کی حکومت ہوئی۔ ۲۹۰ھ میں یعقوب کا انتقال ہوا اور اُس کا بھائی **عمرو بن لیث** جانشین ہوا پھر اس کا پوتا **طاہر بن محمد** چند روز کی حکمرانی کے بعد آل سامان کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور اسی ۲۹۰ھ میں اس خاندان کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اس چند روزہ خاندان کے عہد حکومت میں چند شعرا پیدا ہوئے جن میں **ابو سلیک گورگانی** قابل ذکر ہے۔ کہتا ہے:-

بہ مژده دل زمن بُرد زدیدی | ای بلب قاضی و مژگان دزد
مزد خواہی کہ دل زمن بردی | ای شگفتا کہ دیده دزدی و مزد

دیکھو فارسی مذاق کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی۔ کہیں حلاوت ہے کہیں نمکینی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اکثر دوبیتیں کہتے تھے۔

عیش کے متوالے انھیں گاتے تھے اور جی بہلاتے تھے۔ مگر ان
چٹکلوں سے حقیقی شاعری کا قائم ہونا دشوار ہے۔

رباعی آغاز

صفاری خاندان کی ایک عظیم یادگار عالم شعر میں آجتک باقی ہے
جسے رباعی کہتے ہیں۔ یعقوب کا ایک کمسن بچہ دوسرے بچوں
کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ شرط یہ تھی ایک گڑھے میں اخروٹ تاک تاک
کے ڈالے جائیں۔ اس بچے نے جو اخروٹ پھینکا تو گڑھے میں نہ گیا۔
اداس ہوگیا۔ اتفاقاً وہ اخروٹ لڑھکتا ہوا الٹا پلٹ آیا اور گڑھے میں
گرگیا۔ بچہ فرط جوش میں کہنے لگا "غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گو"
باپ کو یہ کلام موزوں پسند آیا۔ شعرا سے کہا کہ اسکی تقطیع کرو۔ اسوقت تک
اس بحر میں شعر نہیں کہے گئے تھے۔ تقطیع میں دشواری ہوئی۔ بعد
جد و جہد ہزج میں تقطیع ہوگئی۔ پھر تین مصرعے لگا کر رنگ زمانہ
کے موافق دو بیتی بنالی۔ مدتوں یہی صنف دو بیتی کہلائی پھر
رباعی نام ہوگیا۔ کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی ابتدا عمر خیام اور سحابی
کے سے رباعی گو پیدا کریگی جو فارسی شعر کے لئے مایہ ناز ہوجائیں گے۔

باب پنجم

سامانیہ

نہ کس بودند زآل ساماں مذکور — دائم بہ امارت خراساں مشہور
اسمٰعیلے و احمدے و نصرے — دو نوح و دو عبدالملک و دو منصور

(عنصری)

خود مختار ریاستیں

تیسری صدی کے وسط میں خلافت عباسیہ کا آفتاب ڈھلنے لگا۔ **مامون** کی علم دوستی نے جسقدر شہرت و عزت اس خاندان کے لئے تاریخی دنیا میں پیدا کردی تھی اُس کا عکس **متوکل** کی متعصبانہ رفتار نے دکھلا دیا۔ نہ وہ علوم و فنون کا دَور دورہ رہا نہ وہ عظمت و سطوت کا شہرہ۔ **طاہریہ** خانداں مامون کا قائم کیا ہوا تھا۔ **یعقوب** صفار نے متوکل کی بدنظمی سلطنت سے فائدہ اُٹھا کر طاہریوں کو مٹایا۔ اور رفتہ رفتہ بلخ۔ طخرستان۔ سندھ۔ نیشاپور۔ فارس۔ طبرستان۔ رام ہرمز و اور اہواز پر قبضہ کرلیا اور صفاریوں کی حکومت قائم کی۔ اسی زمانے میں **حسن بن زید علوی** نے **طبرستان** میں علویوں کی سلطنت قائم کی اور اس خاندان کے حکمرانوں نے علوم و فنون کے نشر میں فراخدلی سے کام لیا۔ اہل افریقہ نے ایک انقلاب پھیلانے کی کوشش کی اور بصرہ و واسط میں طوفان عظیم برپا کیا۔ اسی طرح اور بھی امور پیش آنے لگے جو زوال سطوت عباسیہ کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں۔

آل سامان کا آغاز

مامون الرشید کا جب مرو میں قیام تھا تو ایک شخص اسد بن سامان دربار میں حاضر ہوا تھا جو کھرا ایرانی تھا اور بہرام چوبین کی نسل میں سمجھا جاتا تھا۔ مامون کی مرحمت سے اس کے چاروں بیٹوں کو مختلف بلاد کی حکومتیں ملیں۔ نوح کو سمرقند ملا۔ احمد کو فرغانہ۔ یحییٰ کو بشناس اور الیاس کو ہرات۔ نوح کے بعد اس کا بیٹا احمد حاکم سمرقند ہوا۔ لیکن چند روز کے بعد اپنے بیٹے نصر کو قائمقام کر کے خود گوشہ نشین ہو گیا۔

۲۶۱ھ میں معتضد باللہ نے اُسے ماوراء النہر کی حکومت دی۔ اس نے اپنی طرف سے اسمٰعیل کو بخارا کا حاکم مقرر کیا۔ دراندازوں نے دونوں بھائیوں کو لڑوا دیا اور نصر گرفتار ہو کے اسمٰعیل کے سامنے آیا مگر اسمٰعیل نے باوجودِ فتح دست بستہ معذرت کی اور نصر کا ماتحت رہا۔ اُس کے انتقال کے بعد ۲۷۹ھ میں اسمٰعیل کو سمرقند کی بھی حکومت ملی۔

آل سامان کی حکومت

اسی تاریخ سے آل سامان کی حکومت کا آغاز ہوا اور اسمٰعیل سامانیوں کا پہلا حکمراں قرار پایا۔ اسی نے صفاریوں کا بھی خاتمہ کیا یہاں تک کہ ۲۹۵ھ میں انتقال کر گیا۔ اسمٰعیل کے بعد احمد بن اسمٰعیل جانشین ہوا اُس کے بعد نصر بن احمد تخت نشین ہوا۔ رودکی اسی کی خوان دولت کا پروردہ ہے جو آدم الشعرا کہلاتا ہے۔ ۳۳۱ھ میں نصر نے وفات پائی اور اُس کا بیٹا نوح وارث تخت ہوا۔ یہ بھی مربی علوم و فنون تھا خلفائے عباسیہ کے زمانے میں یونانی فلسفہ کا ترجمہ خوب ہو چکا تھا لیکن بعض باتیں مبہم رہ گئی تھیں۔ نوح نے ابو نصر فارابی کو حکم دیا کہ سب ترجموں کو سامنے رکھ کے ایک جامع اور معتبر ترجمہ تیار کرے چنانچہ تعمیل حکم کی گئی اور کتاب کا نام تعلیم الثانی رکھا گیا جسکی وجہ سے ابو نصر فارابی کا لقب بھی معلم ثانی

ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ دفتروں کی زبان بھی اسی وقت سے فارسی ہو گئی نوح کا انتقال ۳۴۳ھ میں ہوا اسکے بعد **عبد الملک** اور عبد الملک کے بعد منصور بن نوح تخت نشین ہوا جسکے وزیر نے **تاریخ طبری** کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اُس کی وفات کے بعد **نوح ثانی** وارث حکومت ہوا۔ **دقیقی** اسی کے دربار کا شاعر ہے۔ نوح ثانی کے **منصور ثانی** پھر **عبد الملک ثانی** پھر **اسمٰعیل بن عبد الملک** فرمانروا ہوا جو اس خاندان کا آخری حکمران تھا۔ ۳۹۵ھ میں یہ خاندان تقریباً ایک سو دس برس حکومت کر کے ختم ہو گیا۔

آل زیاد

آل سامان کے زمانے میں ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ طبرستان کا علاقہ ان سے جدا تھا جو **نصر ثانی** کے زمانے تک **حسن بن علی اطروش** کے قبضے میں رہا۔ پھر **مرداوج بن زیار** نے اس صوبے پر قبضہ کر کے خاندان زیاریہ کو قائم کیا جنکی علمی تربیت آل سامان کے ساتھ ساتھ جاری رہی خصوصاً **شمس المعالی امیر قابوس بن وشمگیر** کے زمانے میں بڑے بڑے اساتذہ فن کی تربیت ہوئی۔ بالآخر سامانیوں کی طرح یہ خاندان بھی غزنویوں کے ہاتھوں ختم ہوا۔ **آل بویہ** کی تربیت کی ابتدا بھی **مرداوج** کی ذات سے وابستہ ہے جن کا ذکر آئندہ آئے گا۔

بنی فاطمہ

تاریخی تعلقات قائم رکھنے کے لئے یہ بھی قابل ذکر ہے کہ مصر کے **خلفائے بنی فاطمہ** کی حکومت سامانیوں ہی کے زمانے میں قائم ہوئی

قرامطہ

اور **قرامطہ** کا ظہور بھی اسی عصر میں ہوا جنکے اذکار سے تاریخ عرب بھری پڑی ہے۔ یہ فرقہ ابتدا میں شیعوں کا ہم خیال تھا مگر رفتہ رفتہ جادۂ اسلام سے بہت دور ہو گیا۔ **فردوسی** کو تعریضاً سلطان **محمود** نے اسی فرقے سے منسوب

کیا تھا حالانکہ یہ انتساب بالکل بے بنیاد تھا۔ اسی عہد میں آل بویہ ترقی کی معراج پر پہونچگئے جو بہرام گور کی نسل میں تھے اور منصب امیر الامرائی پر فائض ہو کے تمام کاروبار خلافت کے مالک بن گئے تھے اور دیلمیوں اور گیلانیوں کی مدد سے بویہ کے تینوں بیٹے عماد الدولہ۔ رکن الدولہ اور معز الدولہ کا قبضہ اصفہان۔ نوبندجان۔ گازروں شیراز اور کرمان وغیرہ پر ہو گیا تھا حقیقت یہ ہے کہ علمی اعتبار سے یہ انقلابات نہایت مفید ثابت ہوے۔ ہر خاندان اپنے اپنے مقام پر تربیت اہل علم میں مصروف تھا۔ اساطین حکما و علما و مورخین و شعرا وغیرہ کا ظہور اسی زمانے میں ہوا۔ اگر تاریخ انشاے عرب لکھنے کا موقع ہوتا تو معلوم ہوتا کہ متنبی سا شاعر۔ ابن زکریا سا طبیب۔ طبری سا مورخ اور شیعوں اور سنیوں کے کامل فقیہ و محدث وغیرہ اسی عہد میں گزرے۔ حسن بن منصور حلاج کا ظہور بھی اسی عصر میں ہوا جس نے تصوف کی روح بلاد اسلام میں پھونک دی لیکن انشاے عجم کا تعلق چونکہ آل سامان سے ہے لہذا اب اصل مقصود کیطرف توجہ کی جاتی ہے۔

ترجمہ تاریخ طبری

فارسی نثر کی پہلی کتاب منصور[1] بن نوح نے اپنے وزیر سے لکھوائی یعنے تاریخ طبری کا فارسی ترجمہ[2]۔ اس کی خوبی کے متعلق شمس العلما آزاد دہلوی لکھتے ہیں کہ "تم نے پڑھے طوطے اور بولتی مینا کو دیکھا ہوگا۔ جبتک پنجرے میں ہوتے ہیں سیکھی ہوئی بولیاں بولتے ہیں جب پنجرے سے چھٹ جاتے ہیں تو درختوں پر جاتے ہی اپنا جنگلا بولنے لگتے ہیں۔

---

[1] وفات ۳۶۵ھ۔ [2] تعجب ہے کہ بعض واقعات اصل کتاب میں موجود ہیں وہ ترجمے میں نہیں ہیں اور بعض واقعات جو ترجمے میں نہیں ہیں وہ اصل کتاب میں نہیں ملتے

اُس وقت کے تعلیم یافتہ کچھ ایرانی نسلوں سے تھے کچھ عربوں کی نسل سے خلط ملط تھے۔ کئی سو برس کے بعد جو سیکھی سکھائی زبان چھوڑ کر اپنے عزیز بزرگوں کی بولی بولنے اور لکھنے کا موقع پایا تو طبعی آوازیں پھر نکلنے لگیں۔ اُن کا قدیمی انداز تم ابھی سن چکے ہو۔ اب اگرچہ تین سو برس کی مدت نے محاورے کو بہت توڑا ہے۔ پھر بھی تازہ تصنیفوں میں دیکھو وہی چھوٹے چھوٹے فقرے اصلی مطلب کو ادا کرتے ہیں۔ سادی عبارتیں استعارہ۔ تشبیہ اور مبالغہ کی رنگ آمیزی سے پاک ہیں۔ مرادف فقرہ یا مرادف لفظ کا نام نہیں۔ جو ہیں مطلب کی باتیں ہیں،، اسکے بعد **ابو علی محمد بن محمد البلعمی کی ترجمہ تاریخ طبری کا اقتباس** کیا ہے اور بالمقابل آجکل کی رائج فارسی لکھی ہے تاکہ فرق معلوم ہو سکے۔ مثلاً

حال افریدوں	حال افریدوں
پس جہاں بہ افریدوں درست شد	پس سلطنت برافریدوں مسلم شد
وکاوہ بہ مال وخزینہ کہ حاصل کردہ	وکاوہ مال وخزینہ کہ حاصل کردہ
بود تمام بدوے سپرد ولشکر برداشت	بود ہمہ را بوے سپرد ویس لشکر برداشت
وگرد جہاں برآمد و ہمہ جہاں از	وعالمے را تسخیر نمود وجہاں را از دشمن
مخالف واز ظالم پاک کرد و ہر کجا	وظالم پاک کرد و ہر جا کہ جنگ میکرد
حرب کردے آں علم پیش داشتے	ہماں علم خود را پیش خود می داشت
فیروز یافتے	وفیروزی می یافت

اِس ترجمے کو غور سے دیکھا جائے گا تو معلوم ہو گا کہ بیشتر مقامات پر جملوں کی ترکیبیں اور حروف وافعال کے استعمال بالکل عربی ہیں

کہیں کہیں خالص فارسی کی بھی چاشنی ہے۔ مگر بندشیں نہایت ڈھیلی۔
ابھی عالم طفولیت ہے۔ شباب کے زمانے میں انشا کا رنگ بدلے گا۔

شعرائے عصر

شعرائے عصر کی تعداد سینکڑوں تک پہونچتی ہے مگر مشہور نام یہ ہیں۔ ابو العباس۔ ابو المثل۔ ابو اسحٰق جوئباری خبازی نیشاپوری۔ ابو الحسن کسائی۔ شہید بلخی۔ ابو عبد اللہ فرالاوی۔ رودکی۔ دقیقی۔ رابعہ فرداری۔ معمر جرجانی۔ ابو المظفر نصر بن محمد نیشاپوری وغیرہ۔ جن میں سے ابو عبد اللہ فرالاوی اور شہید بلخی کو شاید اقدمیت کا شرف حاصل ہے۔ رودکی نے شہید کا مرثیہ بھی کہا ہے:۔

کاروانِ شہید رفت از پیش | وانِ ما رفتہ گیر و می اندیش
از شمارِ دو چشم یکتن کم | وز شمارِ خرد ہزاراں بیش

رابعہ

رابعہ کے نام نے اس عہد میں ایک خصوصیت اور ظاہر کی وہ یہ کہ عورتیں بھی شعر کا مذاق رکھتی تھیں۔ اس کا باپ کعب اعراب میں سے تھا۔ خود عجم میں پیدا ہوئی تھی۔ نہایت حسین اور صاحب فضل و کمال تھی۔ بکتاش نام غلام سے اسے الفت تھی۔ مجازی حالت جب حد سے گذری تو حقیقت کا مرتبہ آیا اور صوفیہ میں شمار ہونے لگا۔ مگر اسلامی جماعت میں عورت کا اجنبی مرد سے محبت کرنا معیوب تھا لہذا لوگوں نے رابعہ کو قتل کر ڈالا۔ مولانا شبلی نے یہ دو شعر منتخب فرمائے ہیں۔

دعوتِ من بر تو آں شد ایزدت عاشق کناد
بر یکے سنگیں دلے نامہرباں چوں خویشتن

تا بدانی درد عشق و داغ ہجر و غم کشی
چوں بہ ہجر اندر بپیچی پس بدانی قدر من

ابتدائی دور تغزل اور یہ سوز و گداز! واقعی حالت اگر نظم ہو جاتی ہے تو اثر ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔

رودکی — رودکی اس دور کا مشہور شاعر ہے اور تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ پہلا دیوان فارسی میں اسی نے مرتب کیا یہی وجہ ہے کہ کوئی اسے مقدم الشعرا کہتا ہے کوئی آدم الشعرا۔ پورا نام و نسب اس کا ابو عبداللہ جعفر بن محمد بن حاکم بن عبدالرحمن بن آدم ہے اور ابوالفضل البلعمی کا خیال ہے کہ عرب و عجم میں اس سے بہتر شاعر نہیں ہوا۔ عنصری کہتا ہے کہ رودکی کی طرح میری غزل نہیں ہوتی۔ تخلص کی وجہ یا تو یہ ہے کہ رودک[1] کا رہنے والا تھا یا رود[2] خوب بجاتا تھا۔ بچپنے سے نابینا تھا لیکن علم و عقل میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ موسیقی میں بھی کمال تھا اور آواز میں بھی سوز و گداز تھا۔ آخر قسمت نے یاوری کی اور امیر نصر سامانی کا ندیم ہو گیا اور اسی کے حکم سے کلیلہ و دمنہ[3] کو فارسی میں نظم کیا جس کے صلے میں چالیس ہزار درہم ملے۔ افسوس کہ یہ کتاب اب نہیں ملتی ورنہ رودکی کی واقعہ نگاری پر تنقید نہایت

---

[1] ایک گاؤں کا نام جو نخشب میں ہے اور نخشب کو نسف بھی کہتے ہیں۔

[2] باجے کا نام۔ [3] یہ کتاب اصل میں سنسکرت میں ہے اور ہتوپدیش نام ہے۔ ساسانیوں کے زمانے میں اس کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔ پھر عبداللہ بن المقفع نے عربی میں ترجمہ کیا۔ رودکی کا ترجمہ ابن المقفع کی عربی سے ہے۔ دوسری طرف عربی و سریانی میں اس کے ترجمے ہوئے۔ پھر ان ترجموں کے ترجمے لاطینی میں ہوئے جس سے مختلف زبانوں میں یورپ کی ترجمے ہوگئے۔ پلپیز فیبلیس انگریزی میں اس کا نام ہے۔

اچھی ہو سکتی۔ عنصری نے اس کا ذکر کیا ہے۔

چہل ہزار درم رودکی زمہتر خویش   عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور

ایک مرتبہ امیر نصر بادغیس میں آیا جہاں کی آب و ہوا اتنی پسند آئی کہ چار برس مقیم رہا۔ آخر اُمرا و اہل فوج عاجز آ گئے اور چاہا کہ وطن واپس جائیں۔ رودکی سے کہا کہ پانچ ہزار اشرفیاں دینگے اگر امیر کو یہاں سے لے چلو۔ رودکی نے منظور کر لیا اور امیر کے سامنے یہ اشعار گائے:۔

بوے جوے مولیاں آید ہمی   یاد یار مہرباں آید ہمی
ریگ آموی و درشتیہای آں   زیر پایم پرنیاں آید ہمی
آب جیحوں با ہمہ پہنا وری   خنک مارا تامیاں آید ہمی
ای بخارا شاد باش و شاد زی   شاہ سویت میہماں آید ہمی
شاہ سرو است و بخارا بوستاں   سرو سوے بوستاں آید ہمی
شاہ ماہ است و بخارا آسماں   ماہ سوے آسماں آید ہمی

نصر کی نظروں میں وطن کا نقشہ پھر گیا اور ایسا خوش ہوا کہ موزے تک نہ پہنے اور گھوڑے پر سوار ہو کر چل کھڑا ہوا یہاں تک کہ ایک منزل پر جا کے دم لیا۔ یہ ہے حقیقی شاعری کا اثر۔ اندھا شاعر اتنا ہی کہتا ہے جتنا احساس ہوتا ہے۔ اپنے وطن کی نہر مولیاں کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ صرف خوشبو پر اکتفا کی ہے۔ وطن کی صعوبتوں کو کتنا آسان سمجھتا ہے کہ دریا کی ریت اُسے ریشم معلوم ہوتی ہے۔ دولت شاہ وغیرہ کے زمانے میں مذاق اتنا بدل گیا تھا کہ ان اشعار کے موثر ہونے پر اُسے تعجب ہے لیکن اس زمانے کے لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ جدید نیچرل نظموں سے یہ نظم کچھ کم نہیں صاحب

[1] دریائے جیحون

چہار مقالہ کی خوش مذاقی دیکھو کہ لکھا ہے :۔

"ہنوز این قصیدہ را کسے جواب نگفتہ است کہ مجال آن ندیدہ اند کہ ازیں مضائق بیروں روند"۔

رودکی کی پُرگوئی کا یہ حال تھا کہ رشید سمرقندی نے اس کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے۔ شاعری کا دائرہ بھی اچھا خاصہ وسیع تھا۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ "واقعہ نگاری۔ خیال بندی۔ موعظت و نصیحت۔ عشق و محبت۔ مدح و ثنا۔ صنائع و بدائع۔ سب چیزیں پائی جاتی ہیں اور درجۂ کمال پر پائی جاتی ہیں"۔ نمونے ملاحظہ ہوں[1] :۔

(۱) اخلاق و موعظت۔

زمانہ پندے آزادہ وار داد مرا
زمانہ را چو نکو بنگری ہمہ پند است

بروز نیک کساں گفت غم مخور زنہار
بسا کسا کہ بروز تو آرزومند است

زمانے نے ایک مرتبہ احرار کی شان سے مجھے نصیحت کی۔ اگر غور سے دیکھو تو سارا زمانہ نصیحت ہی نصیحت ہے (ذرا اس خیال کا زور دیکھو اور ابتدائی شاعری کو دیکھو!) اُس نے کہا کہ دوسروں کی خوش حالی پر حسد نہ کر کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو چاہتے ہیں کہ تیری حالت تک پہونچ جائیں۔

(۲) عمر خیام کا فلسفہ یاد کرو اور رودکی کے یہ شعر دیکھو:۔

شاد زی با سیاہ چشماں شاد
کہ جہاں نیست جز فسانہ و باد

ز آمدہ شادماں نباید بود
وز گزشتہ نکرد باید یاد

---

[1] تفصیل کے لئے شعر العجم جلد اول ملاحظہ ہو۔

بادو ایں است ایں جہاں افسوس	بادہ پیش آر ہر چہ بادا باد

اللہ ری سادگیِ ادا اور بے تکلفی اور یہ فلسفیانہ مضمون!

(۳) مدحیہ رنگ میں قوت تخیل دیکھو:۔

شاہے کہ بروز رزم از رادی	زرّین نہد بہ تیر در پیکاں
تا کشتۂ او ازاں کفن سازد	تا خستۂ او ازاں کند درماں

(سخاوت ۱۲ — اعلانِ نون ۱۲ — اس کی قیمت سے ۱۲)

(۴) واقعہ نگاری کا نمونہ بادغیس کے واقعے میں درج ہوا۔

(۵) مرثیہ کا نمونہ شہید بلخی کے حال میں لکھا جا چکا۔

(۶) غزل نے مستقل صورت اختیار نہیں کی تھی قصیدے کی تشبیب میں عاشقانہ رنگ کے اشعار اس کا نمونہ ہو سکتے ہیں۔ عنصری نے اس صنف میں رودکی کے کمال کا اعتراف کیا ہے جیسا کہ مذکور ہوا۔

(۷) قصیدہ گوئی کے حدود ایسے قائم کیے کہ آجتک اضافہ نہ ہو سکا۔ تشبیب۔ تخلص۔ مدح۔ خاتمہ کے مقامات قابل دیکھنے کے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ الفاظ میں جزالت و متانت اور معانی میں قوتِ تخیل کامل طور سے نظر آتی ہے۔ ایک تشبیب ملاحظہ ہو:۔

بیار آں می کہ پنداری رواں یاقوت نابستی	ویا چوں برکشیدہ تیغ اندر آفتابستی
بپاکی گوئی اندر جام مانند گلابستی	بخوشی گوئی اندر دیدۂ بیخواب خوابستی
سحابستی قدح گوئی و می قطرۂ سحابستی	طرب گوئی کہ اندر دل دعای مستجابستی
اگر می نیستی یکسر ہمہ دلہا خرابستی	اگر در کالبد جاں را ندیدستی شرابستی

(یای زائدہ ۱۲ — پرانا تلفظ ۱۲ — سلہ)

ظہوری کے ساقی نامہ میں پیچ در پیچ تخیل نے سادگیِ ادا کو مٹا دیا۔

سلہ متوسطین و متاخرین نے اس تلفظ کو ترک کر دیا تھا قاآنی وغیرہ نے پھر اختیار کیا ہے۔

پرانا بڈھا اچھا کہ سیدھی سادی بندش میں خدا جانے کیا کیا کہہ گیا۔ رودکی نے رباعیاں اور قطعے بھی کہے ہیں اور اچھے کہے ہیں۔ ایک قطعہ ملاحظہ ہو:۔

شعر

نگارینا شنیدستم کہ گاہِ محنت و راحت — سہ پیراہن سلب بودست یوسف را بہ عمر اندر
یکے از کید شد پُر خون دوم شد چاک از تہمت — سوم یعقوب را از بوی روشن کرد چشمِ تر
رخم ماند بداں اول دلم ماند بداں دوم — نصیبِ من شود در وصلِ آن پیراہنِ دیگر

دقیقی

دقیقی ۔ ابو منصور محمد بن احمد بلخی (یا سمرقندی) سامانیوں کے آخری دور کی یادگار ہے۔ امیر ابو المظفر محتاج چغانی کی ذات سے اس کی ابتدائی تربیت ہوئی پھر نوح بن منصور سامانی نے اپنے دربار میں بلایا اور شاہنامہ تصنیف کرنے کا حکم دیا۔ کوئی کہتا ہے کہ بیس ہزار شعر نظم کر ڈالے۔ کوئی کہتا ہے صرف ایک ہزار شعر نظم کر چکا تھا کہ محبوب ترکی غلام کے ہاتھ سے زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ مجمع الفصحا میں یہ واقعہ ۳۴۱ھ کا بتایا گیا ہے۔ بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آخر عمر میں امیر نصر بن ناصر الدین سبکتگین کے دربار میں بھی شرفیاب ہوا اور بعضوں نے اسے بھی شعرائے دربار محمود غزنوی میں شمار کیا ہے لیکن صحیح ترین روایت یہی معلوم ہوتی ہے کہ نوح بن منصور سامانی کے دربار کا شاعر تھا۔ مولانا آزاد دہلوی کا ان ہزار شعروں کے بارے میں خیال ہے کہ اسکے "کلام میں بیان ماجرا کا سلسلہ کہیں درہم برہم اور کہیں بیچ میں سے کترا ہوا ہے۔ جس بات کی تفصیل کو جی ڈھونڈھتا ہے۔ اُسے گول مول کر جاتا ہے۔ جو معمولی بات ہے اُسے تفصیل دیتا ہے۔ اکثر جگہ پہلے مصرعہ میں داستان کا مطلب کہتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں آگے کا مطلب نہیں ہوتا فضول الفاظ سے بھرتی کر کے قافیہ کا فرض ادا کر دیتا ہے"۔ مولانا شبلی نعمانی اُسے فردوسی سے پست ضرور

سمجھتے ہیں مگر "رتبۂ کلام" کو مانتے ہیں اور معرکہ آرائی کے بیان کا نمونہ پیش کرتے ہیں کہ تقابل کا اہلِ نظر کو موقع مل جائے :-

زبس بانگِ اسپان و جوش و خروش — ہمی نالۂ کس نشنیدہ گوش
درفشانِ بسیار افراشتہ — سرِ نیزہا زابر بگذاشتہ
چو رستہ [عَلَم ۱۲] درخت از برِ کوہسار — چو بیشۂ نیستاں بوقتِ بہار
ز تاریکیٔ گرد و بانگِ سپاہ — کسے روز روشن نمیدید راہ
بکردند یک تیرباران نخست — بسانِ تگرگِ بہاران درست
بپوشیدہ شد چشمۂ آفتاب — ز پیکانہائے درخشاں چو آب
تو گفتی ہوا ابر آرد ہمی — وزاں ابر الماس بارد ہمی

ایک مرتبہ فردوسی نے دقیقی کو خواب میں دیکھا تھا کہ وہ اپنے گشتاسپ و ارجاسپ کی لڑائی کے بھی ہزار اشعار شاہنامہ میں داخل کرنے کی فرمایش کرتا ہے۔ فردوسی شاہنامہ میں کہتا ہے :-

پذیرفتم و داشتم زو سپاس — مرا در دل آمد ز ہر سو ہراس
کہ روزے مرا ہم بباید گزشت — ز گفتار او در نشاید گزشت

غرض یہ اشعار نقل کئے۔ اسکے بعد شاعرانہ تعلّی کا جوش ہوا۔ ختم کرکے کہتا ہے :-

دو گوہر[۱] نمودم بہ گوہر فروش — کنوں شاہ دارد بگفتار گوش
سخن چوں بدینگونہ بایدت گفت [محمود غزنوی ۱۲] — مگوی و مکن رنج با طبع جفت
چو طبعت نہ باشد چو آبِ رواں — مبر دست زی نامۂ خسرواں

مولانا شبلی کہتے ہیں کہ دقیقی پہلا شخص ہے جس [سوسی ۱۲] نے فارسی کو عربی

۱؎ یعنے اپنے اور دقیقی کے اشعار۔

کی آمیزش سے پاک کرکے مستقل زبان کی حیثیت قائم کی ہے۔ پھر چند اشعار نقل کرکے فرمایا ہے کہ "ان اشعار میں جا بجا فک اضافت اور الف اشباع ہے جو آجکل متروک و معیوب ہے"۔ دقیقی نے مثنوی کے ساتھ قصیدہ اور غزل کو بھی ترقی دی۔ اس نے بعض مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں اور یہ اُس زمانے کے اعتبار سے بالکل نئی بات ہے.... آجکل جس چیز کو لوگ نیچرل شاعری کہتے ہیں فارسی میں غالباً[1] سب سے پہلے اسی نے بنیاد قائم کی۔

سحرگاہاں کہ بادِ نرم جنبد — بجنبانَد درختِ سرخ و اصفر

تو پنداری کہ از گردوں ستارہ — ہمی بارید بر دیبائے اخضر

نگاراندر نگار و لون در لون — ہزاراں در شدہ پیکر بہ پیکر

ایک مسلسل غزل بہار کی رنگینی اور مے و معشوق پر لکھی ہے:-

درافگند ای صنم ابرِ بہشتی — زمیں را خلعتِ اردی بہشتی

زمیں بر سان خوں آلودہ دیبا — ہوا بر سان مشک اندودہ دشتی

بداں ماند کہ گوئی از مے و مشک — مثالِ دوست بر صحرا نوشتی

تصویر ۱۲

× × × × × × × ×

دقیقی چار خصلت برگزیدست — بہ گیتی از ہمہ خوبی و زشتی

لب یاقوت رنگ و نالۂ چنگ — مئے خوں رنگ و کیش زردہشتی"

تعجب ہے کہ اس آخری مصرعے سے نولدیکے۔ ہارن اور ایتھے وغیرہ نے قیاس کیا ہے کہ دقیقی مذہب زرتشت کا ماننے والا تھا۔ حالانکہ یہ محض ایشیائی شاعری ہے اور دقیقی نے اتنی بات پسند کی ہے کہ یہ مذہب شراب پینے کو منع نہیں کرتا۔ پروفیسر براؤن اس نکتے کو سمجھ گئے اور

---

[1] کیونکہ رودکی کے اشعار نیچرل شاعری کی بہترین مثال ہیں۔

اُسے پکا مسلمان کہتے ہیں مجمع الفصحا وغیرہ میں اسکے وعظیہ و مدحیہ اشعار بھی درج ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر صنف میں کچھ نہ کچھ کہتا ضرور رہے۔

منجیک — اسی عصر کے اور شعرا ہیں جن کا کلام کم ملتا ہے مثلاً منجیک جو امرائے چغانیہ کا مداح تھا۔ صاحب مجمع الفصحا نے اسکے اشعار ملوک صفاریۂ سیستان کی تعریف میں بھی نقل کئے ہیں۔ اسی طرح منطقی رازی کے اشعار درج ہیں

منطقی — جو دیلمیوں کے وزیر صاحب بن عباد کا مداح تھا۔ پروفیسر براؤن کا خیال ہے کہ اسے حسن تعلیل وغیرہ کا بہت شوق تھا اور اسے دربار عراق کا اثر سمجھا ہے جہاں شاعری میں اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی جتنی آل سامان کے دربار میں پائی جاتی تھی۔

جنیدی — ابو عبداللہ محمد جنیدی بھی صاحب بن عباد کے شعرا میں سے تھا۔ امیر قابوس کے دربار میں نہایت اچھے اچھے شاعر تھے۔ بعضے غزنویوں کے عہد میں بہت مشہور ہوئے جنکا ذکر آیندہ باب میں آئے گا اور بعضے سامانیوں کے عہد میں ختم ہو گئے۔

خاتمۂ باب میں اُن امرا و ملوک کا ذکر کرنا ضروری ہے جنھوں نے علاوہ

اسمٰعیل سامانی — انشا پروری کے خود بھی انشا پردازی کی ہے خصوصاً ابو ابراہیم اسمٰعیل سامانی جسکے بعض اشعار سے اندازہ ہوگا کہ ان لوگوں کی ہمتیں کتنی بلند تھیں اور زبانیں کیسی شستہ تھیں۔

گویند مرا خود زچہ رو خوب نسازی — منزل گہ آراستہ و فرش ملوّن
بانعرۂ گرداں چہ کنم لحن اغانی — یا پویۂ اسپاں چہ کنم مجلس گلشن
اسپ است و سلاح است مرا بزم گہ و کاخ — تیر است و سناں است مرا لالہ و سوسن
جوش مَی و نوش لب ساقی بچہ کار است — جوشیدن خوں باید بر علیۂ و جوشن

منصور ثانی سامانی بھی شاعر تھا اور اچھا شاعر تھا۔ معاصرین میں امیر

قابوس

قابوس بن دشمگیر کی علم دوستی نے البیرونی سا مورخ اور ابوعلی سینا سا حکیم پیدا کر دیا۔ عربی و فارسی کے کئی رسالے اسکی تصنیف سے ہیں خصوصاً کمال البلاغہ اور سیر الملوک اسی کے قلم سے نکلتے ہیں۔ یہ امیر خوش تدبیر خاندان قارن سے تھا جسے عرب کے مورخ اہل البیوتات کہتے ہیں اور سلسلہ نسب قباد پسر نوشیرواں عادل سے ملتا تھا۔ فلسفہ و نجوم و ہیئت کے علاوہ فن فصاحت و بلاغت کو خوب جانتا تھا۔ ایک رسالہ اسطرلاب پر بھی اس نے لکھا تھا۔ افسوس ہے کہ ظالم و بدخو تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منوچہر کے ہاتھوں مارا گیا۔ حکیم سنائی نے اسی وجہ سے کہا ہے :۔

فقہ خواں لیک در جہنم جاہ ہمچو قابوس وشمگیر مباش

قابوس کی شاعری کا انداز ذیل کے اشعار سے معلوم ہو سکتا ہے :۔

کارِ جہاں سراسر آزست یا نیاز من پیشِ دل نیارم آز و نیاز را

من ہشت چیز را ز جہاں برگزیدہ ام تا ہم بداں گذارم عمر دراز را

میدان و گوی و بارگہ و رزم و بزم را اسپ و سلاح و جود و دعا و نماز را

ولہ

گل شاہ نشاط آمد و مے میر طرب زاں تر وی بدیں دو میکنم عیش طلب

خواہی کہ دریں بدانی ای ماہ سبب گل رنگ رخت دارد و مے رنگ لب

اس عہد کی ترقیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ فارسی نثر میں کتابیں تصنیف ہونے لگیں جن کی زبان پرانی تھی اور طرز ادا سادی۔ نظم میں قصیدہ باضابطہ طور سے جاری ہو گیا اور اتنا لطیف تھا کہ باید و شاید۔ رباعی کا آغاز ہو گیا مگر کوئی کامل شاعر

اس صنف میں نہیں ہوا۔ مثنوی بھی دقیقی نے شروع کردی۔ قطعات کا سلسلہ تو پہلے ہی قائم تھا وہ اور بھی پر لطف ہوگیا۔ غزل البتہ معرض خفا میں رہی۔ علوم و فنون کی کتابیں اب بھی عربی میں کثرت سے لکھی جاتی تھیں اگرچہ لکھنے والے بیشتر عجمی الاصل ہوتے تھے جن کی تفصیل تاریخ انشائے عرب سے تعلق رکھتی ہے۔



باب ششم

غزنویہ

سلاطین غزنویہ کا عہد اگرچہ زیادہ دیرپا نہیں ہے مگر فارسی لٹریچر

الپتگین — کی جان ہے۔ عبد الملک بن نوح سامانی کا ایک غلام **الپتگین** نام ترقی کرکے خراسان کا گورنر ہوگیا۔ منصور بن عبد الملک کے عہد حکومت میں وہ غزنین چلا گیا اور سولہ برس حکومت کرکے وہیں فوت ہوگیا۔ پھر **ابو اسحٰق** بن الپتگیں وارث ہوا لیکن چندروز کے بعد مرگیا۔ الپتگین کا ایک

سبکتگین — غلام **سبکتگین** تھا جس کی قابلیت کے اعتراف کی وجہ سے **جمہور** نے اُسے غزنین کا حاکم مقرر کیا۔ یہی خاندان غزنویہ کا موسس ہے **جیپال** کو ہندوستان میں اسی نے بار بار شکست دی اور **سامانی** دربار سے **ناصر الدین** کا خطاب پایا۔ اسکی وفات کے بعد اس کا بیٹا **اسمٰعیل**

محمود — جو الپتگیں کا نواسا تھا بلخ میں تخت نشین ہوا۔ **محمود** اُس وقت غزنین میں تھا۔ اُس نے بھائی کو لکھا کہ آپ بلخ کی حکومت کیجئے اور مجھے غزنین کا حاکم رہنے دیجئے۔ مگر **اسمٰعیل** نے نہ مانا۔ لڑائی چھڑی تو **اسمٰعیل** نے شکست کھائی اور **محمود** کی بادشاہی مسلم ہوگئی۔ اسے سامانی دربار سے **سیف الدولہ** کا خطاب مل چکا تھا۔ فتوحات ہندوستان وغیرہ کے بعد اثر اچھا خاصہ ہوگیا اور دربار خلافت سے **یمین الدولہ ولی امیر المومنین** لقب ملا۔

معاصرین — اسکی ہمعصر سلطنتوں کا ہم ذکر کرچکے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک

قدردانی علم و کمال کے لئے یکتا تھی۔ آل بویہ بغداد میں نہایت شان سے بسر کر رہے تھے اور اہل علم زبان عرب میں بیش بہا تصانیف ان کے فیض سے شائع کر رہے تھے۔ فارسی شعرا بھی بقدر ضرورت موجود تھے۔ منطقی اور خسروی سرخسی کے نام اسی دربار سے وابستہ ہیں۔ سادات حسنی اور اُن کے بعد زیاریوں کی حکومت طبرستان میں تھی خصوصاً امیر قابوس بن وشمگیر کی علمی قابلیت اور قدردانی تاریخ انشا کا ایک مستقل جزو ہوگئی ہے۔ ماموی امرائے خوارزم ایک طرف اہل علم کے لئے منازل ترقی بنا رہے تھے۔ حکیم ابوعلی سینا جو ارسطوئے مشرق تھا اسی دربار میں پناہ گزین ہوا۔ ابوریحان بیرونی۔ ابونصر عراق۔ حکیم ابوسہل مسیحی۔ ابوالحسن خمار طبیب۔ یہ سب خوارزمشاہیوں کے خوان کرم کے زلہ ربا تھے۔

محمود کے فتوحات

سلطان محمود نے جب ملک گیری شروع کی تو ہندوستاں کی طرح سامانیوں اور زیاریوں کے ملک بھی تسخیر کر لئے اور ان درباروں کے بیشتر کاملین فن مجبور ہو کے غزنین کے دربار میں آ گئے۔ محمود کی حکومت بخارا و سمرقند سے گجرات و قنوج تک ہو گئی۔ افغانستان۔ ماوراء النہر۔ خراسان۔ طبرستان۔ سیستان۔ کشمیر اور بیشتر بلادِ ہندوستان اسکے زیرنگیں تھے۔ امرائے اسلام میں یہ پہلا امیر ہے جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا اور ظل اللہ فی ارضہ اپنے نام کے ساتھ لکھوانا شروع کیا ورنہ اس وقت تک "امیر" "الشہید" وغیرہ اُن امرائے اسلام کے لقب تھے جو خلافت عباسیہ کے بزرگ مان کے حکومت کرتے تھے۔ محمود کا پورا نام مع القاب وغیرہ یوں تھا۔

"الامیر السعید الملک المؤید یمین الدولۃ و امین الملۃ ابوالقاسم محمود بن ناصر الدین ابی منصور سبکتگین ملک المشرق بجنبیہ ظل اللہ فی ارضہ"

محمود کی علمی حالت

یہ فضیلیہ ور سلطان جس طرح صاحب سیف تھا اُسی طرح صاحب قلم بھی تھا۔ جواہر مضیئہ میں اس کا فقہاے اہل سنت میں شمار ہے۔ کہتے ہیں کہ فقہ میں اس نے ایک مبسوط کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ غزنین میں ایک یونیورسٹی اور ایک کتب خانہ اور ایک عجائب خانہ اسی نے قائم کردیا تھا جنکا ممالک عالم میں نظیر مشکل سے ملتا تھا۔ چند اشعار بھی کہے ہیں منجملہ اُنکے یہ قطعہ ہے۔

زنخت را اگر فتم از سر لطف — خون من ریختی و عذرت ہست
زانکہ ہنگام رگ زدن شرطست — گوی سیمیں گرفتن اندر دست

محمود کی اخلاقی عادات

محمود کی اخلاقی حالت کی مورخین نے نہایت تعریف کی ہے۔ ہاں! ہر شخص میں کچھ کمزوریاں بھی ہوتی ہیں اور محمود ان سے خالی نہ تھا۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ دولت کی طمع بہت تھی اور جہاں کہیں دولت کا نام سُن پاتا تھا کچھ نہ کچھ وصول وہاں سے ضرور کرلیتا تھا۔ مثلاً لکھا ہے کہ ایک شخص نیشاپور میں بہت دولتمند تھا۔ محمود نے سن پایا تو اُسے غزنین میں بلا کے کہا کہ میں نے سُنا ہے کہ تو قرمطی ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ میں قرمطی نہیں ہوں بلکہ میرے پاس دولت ہے۔ بادشاہ اُس میں سے جس قدر چاہے قبول کرلے اور یہ لقب میرے نام سے ہٹا دے۔ محمود نے روپیہ لے لیا اور اُسے سند دیدی کہ قرمطی نہیں ہے۔ پروفیسر براؤن نے لکھا ہے کہ وہ اہلِ علم کو گھیر کے کسی نہ کسی طرح اپنے دربار میں ضرور لاتا تھا چنانچہ جب اسے معلوم ہوا کہ مامون خوارزمشاہ کے یہاں بڑے بڑے کملا کا مجمع ہے خصوصاً بوعلی سینا سا کامل حکیم اور طبیب موجود ہے۔ اس نے کہلا بھیجا کہ سب کو فی الفور حاضر دربار کرو۔ محمود کی سطوت ایسی نہ تھی کہ یہ چھوٹے چھوٹے بادشاہ اُس کے حکم سے سرتابی کرسکتے۔ ابوریحان

بیرونی اور خمار اور عراق تو غزنین چلے گئے مگر بوعلی سینا اور مسیحی نے انکار کر دیا اور خوارزم شاہ کے یہاں سے بھاگ گئے۔ مسیحی کی جان بادِ سموم کے نذر ہو گئی۔ بوعلی سینا بھاگتا ہوا امیر قابوس کے یہاں گیا جہاں اُس کی بڑی قدر و منزلت کی گئی پھر علاء الدولہ محمد کے یہاں گیا اور وزیر ہو گیا۔ آخر ۴۲۷ھ میں انتقال کر گیا۔ بوعلی سینا

ابوریحان بیرونی ایک کامل منجم اور مورخ تھا جو خوارزم شاہیوں کے یہاں سے حسب الطلب دربار غزنین میں آ گیا تھا سلطان محمود نے[1] امتحاناً کہا کہ اپنے نجوم کے ذریعے سے بتلاؤ کہ میں اس عمارت کے باہر کس دروازے سے جاؤنگا۔ اُس نے اس کا جواب لکھ کے رکھ دیا۔ محمود دیوار توڑوا کے باہر نکلا اور جواب کا کاغذ پڑھا تو یہی لکھا تھا کہ بادشاہ کسی دروازے سے نہ جائے گا بلکہ دیوار توڑوا کر باہر جائے گا۔ محمود کھسیانا ہوا اور حکم دیا کہ ابوریحان کو کوٹھے کے نیچے پھینکدیں۔ جب وہ گرایا گیا تو اتفاقاً ایک مسہری کے پردے پر گرا اور زندہ بچ گیا۔ جب سلطان محمود کے سامنے پیش کیا گیا تو اُس نے اپنی نوٹ بک نکالی اور یہ پیشین گوئی بھی دکھائی جو پوری اُتری تھی۔ اب بادشاہ کا غصہ اور بڑھ گیا اور غریب ابوریحان کو قید کر دیا۔ چھ ماہ کے بعد وزیر نے سفارش کی اور کہا کہ اے بادشاہ آج سوائے بوعلی سینا کے اس حکیم کا مثل روئے زمین پر نہیں ہے۔ اب اس پر رحم کیجئے۔ دوسرے دن بادشاہ نے رہائی کا حکم دیا اور ایک ہزار دینار۔ ایک غلام۔ ایک کنیز اور ایک خلعت عطا کیا۔ ابوریحان بیرونی

پروفیسر براؤن نے لکھا ہے کہ فردوسی کے ساتھ بھی تشدد کی

---

[1] چہار مقالہ۔

ایسی ہی مکافات کی گئی تھی اور ملا جامی نے بھی کہا ہے :۔

گذشت شوکت محمود و در فسانہ نماند جز این قدر کہ ندانست قدر فردوسی

غرض سلطان محمود کا انتقال ۴۲۱ھ میں ہوا اور ۶۹ برس کی عمر پائی۔ زوال غزنویہ
حسب وصیت حکومت خراسان و عراق و جرجان و مضافات بڑے بیٹے
مسعود کو ملی اور غزنین و کابل و ہند کا وارث چھوٹا بیٹا محمد ہوا مگر دونوں بھائیوں
میں لڑائی ہوئی اور مسعود کو محمد نے قتل کیا۔ پھر مودود بن مسعود نے اپنے
چچا محمد اور اُس کے فرزند کو قتل کیا اور آل سبکتگین کے اقبال کو زوال آ گیا۔
انھیں خانہ جنگیوں کے زمانے میں آل سلجوق نے خروج کیا اور خراسان و
عراق پر قبضہ کر لیا۔

غزنویہ عہد میں نثر نے بہت زیادہ ترقی نہیں کی۔ ترجمہ تاریخ طبری
اور قرابادین ابو منصور الموفق سامانیوں کے عہد میں لکھی جا چکی تھیں۔ ایک نثر
فارسی تفسیر قرآن مجید بھی سامانیوں کے عہد کی کیمبرج یونیورسٹی میں موجود
ہے۔ عہد غزنویہ کے اضافوں میں دانش نامہ علائی حکیم بوعلی سینا کا لکھا
ہوا۔ بہرامی کا خجستہ نامہ اور فرخی کا ترجمان البلاغہ ہے مگر یہ کتابیں
اب نایاب ہیں۔ طبرستان کی زبان میں مرزبان نامہ لکھا گیا تھا
مگر وہ بھی نہیں ملتا۔ کہتے ہیں کہ اسدی نے ایک فارسی کا لغت لکھا تھا
اور صنائع و بدائع پر بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ مصطلحات فارسی کو ہلگین نے
چھاپ کے شائع کر دیا ہے اگر دیکھنے میں آتی تو ضرور کچھ اقتباس کیا جاتا۔
شیخ بوعلی سینا کی حکمت فارسیہ کا نمونہ پیش ہے اور مقابل میں مذاق حال
کی فارسی درج ہے تاکہ موازنہ میں سہولت ہو :۔

فرمود تا کتابے تصنیف کنم بہ پارسی دری	فرمود تا کتابے در فارسی دری تصنیف کنم

که اندروے اصلہا و نکتہائے پنج علم از
علمہائے حکمت پیشینگاں گرد آورم بغایت مختصر
یکے علم منطق که او علم ترازوست دوم علم
طبیعیات که آں علم چیزہاست بہ حس تعلق
دارند۔ سوم علم ہیئت و نہاد عالم وحال
وصورت جنبش آسمانہا و ستارگان چنانکه
باز نموده اند که چوں شائست حقیقت
آں دانستن۔ چہارم علم موسیقی
و باز نمودن سبب ساز و ناساز آوازہا
و نہاد لحنہا۔ پنجم علم آنچه بیروں از طبیعت است
و چناں اختیار افتاد که چوں پرداختہ
شده آید از علم منطق۔ حیلت کرده
آید که آغاز علم بریں کرده شود و
بتدریج بعلمہائے زیریں شده آید الخ

و دراں اصول و نکات پنج علم از
حکمت قدیمه بدرغایت اختصار فراہم آوردم
یکے علم منطق که آں علم میزان است دوم علم
طبیعیات و آں علم اشیاست که بحس تعلق
دارند۔ سوم علم ہیئت وضع عالم وحال
وصورت حرکت افلاک و انجم چنانچه
شرح داده اند که چگونه باید
دانست آنرا۔ چہارم علم موسیقی
و سبب ساز و ناساز آوازہا و وضع
لحنہا۔ پنجم علم آنچه ما بعد الطبیعة است
و مناسب چناں نمود که چوں
از علم منطق فراغت آید
علویات آغاز کرده بتدریج
بربیان سفلیات آئیم الخ

دیکھو پہلے کے بہ نسبت عربی الفاظ زیادہ ہوتے جاتے ہیں مگر ترکیبِ عبارت اور استعمال حروف اور تقدیم و تاخیر میں ابھی پرانے عہد کے نشان باقی ہیں۔ اصطلاحات وضع کرنے کا بھی شوق ہو گیا ہے۔ دیکھیں آئندہ زبان کس لفظ کو ٹکسالی قرار دیتی ہے اور کسے ٹکسال باہر کرتی ہے۔

نظم کا آفتاب اس زمانے میں بیت الشرف میں داخل ہو چکا تھا فردوسی سا قدمائے سخن عنصری سا ملک الشعرا عسجدی۔ فرخی۔ غضائری غرض چار سو شاعر محض سلطان محمود کے دربار میں تھے اسکے علاوہ دوسرے

معاصرین کے یہاں بھی کمی نہ تھی۔ بعض کے حالات ملاحظہ ہوں:۔

ابوالفتح بستی

ابوالفتح بستی سلطان محمود کے باپ کے وقت سے دربار غزنین میں موجود تھا۔ اس کا عربی قصیدہ زیادۃ المرء فی الدنیا ء نقصان آج تک زبان زد ہے۔ فارسی اشعار بھی کہے ہیں مگر اس پایہ کے نہیں کہ عنصری وغیرہ کے مقابلے میں پیش کئے جائیں۔ یہی حال بیرونی اور بوعلی سینا وغیرہ کی شاعری کا ہے۔ بہترین رباعی شیخ الرئیس کی یہ ہے۔

بوعلی سینا کی رباعی

دل گرچہ دریں بادیہ بسیار شتافت — یکموے ندانست ولے موے شگافت
اندر دل من ہزار خورشید بتافت — آخر بکمال ذرۂ راہ نیافت

دیکھنا کتنی موشگافی کی ہے اس فلسفیانہ خیال کے ظاہر کرنے میں کہ مظاہر کے پرتو پڑنا اور بات ہے اور کسی مظہر کی حقیقت سمجھنا اور بات! معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد۔ ارباب قال کی حد سے یہ نکتہ باہر ہے۔ اصحاب حال اس کی توضیح کرینگے۔

عنصری

عنصری۔ وہی بلخ کا مردم خیز خطہ جو بوعلی سینا کا ایسا حکیم اور مولانا روم کا ایسا عارف پیدا کرنے پر قادر ہے سلطان محمود کی سلطنت شعر کا سرتاج بھی پیدا کرتا ہے۔ ابوالقاسم حسن بن احمد کو عنصری تخلص عطا کر کے نصر بن ناصر الدین سبکتگیں کی خدمت میں پیش کیا۔ نصر نے اپنے بھائی محمود کے دربار میں تقریب کر دی۔ پھر کیا تھا؟ کوکب اقبال چمک اُٹھا۔ ملک الشعرا کا خطاب۔ چارسو زریں کمر غلام۔ دولت و مال غرض سب کچھ ملا۔ خاقانی کہتا ہے:۔

شنیدم کہ از نقرہ زد دیگداں — ز زر ساخت آلات خواں عنصری

کہتے ہیں کہ اس کا آبائی پیشہ تجارت تھا۔ خود بھی تجارت کرنے

نکلا مگر ڈاکوؤں نے سارا مال لوٹ لیا مجبور ہو کے طلب علم کیطرف متوجہ ہوا اور خوب پڑھ گیا۔ اسی سلسلے میں شاعری کا بھی شوق ہوا اور وہی شوق اس کی ناموری اور ترقی کا باعث ہوا۔ محمود کے دس برس بعد ۴۳۱ھ میں وفات پائی۔ اسکے اشعار کی تعداد ۳۰ ہزار بیان کی جاتی ہے مگر اب محض تین ہزار ملتے ہیں۔ افسوس کہ اسکی مثنویاں وامق و عذرا یسرخ بت و خنگ وغیرہ نہیں ملتیں ورنہ موازنہ کا موقع خوب ہاتھ آتا۔ بدیہہ گوئی میں خاص مہارت تھی صاحب آتشکدہ لکھتے ہیں کہ ایک شب میں ایک مرتبہ ایک ہزار شعر کہہ ڈالے تھے۔ محمود نے ایک دن نشہ کے عالم میں ایاز کی زلفیں کٹوا دیں۔ ہوش میں آیا تو رنج ہو عنصری نے برجستہ کہا:۔

گر عیب سر زلف بت از کاستن است　　نہ جائے بہ غم نشستن و خاستن است
وقت طرب و شادی و مے خواستن است　　کاراستن سرو ز پیراستن است

محمود خوش ہو گیا اور عنصری کا منہ جواہرات سے بھر دیا۔ شاعری پر تفصیلی ریویو شعر العجم میں موجود ہے۔ خلاصہ اُس کا درج کیا جاتا ہے۔

(۱) قصیدہ گوئی میں متاخرین کو ناز ہے کہ گریز انکے یہاں جتنی نازک ہوتی ہے اسلاف کے یہاں نہیں ہوتی۔ ذرا انصاف سے یہ قصیدہ دیکھو:۔

غنود مستند آں ماہِ منور　　خط و زلفین آں مہروی دلبر
یکے را سنبل نورستہ بالیں　　یکے را لالۂ خود روی بستر
یکے سیلے دو و سال و ماہ تیرہ　　یکے بیلے نور روز و شب منور
مرا بہرہ دو چیز آمد بہ گیتی　　دل پاک و زبان مدح گستر
یکے بر حال جانان وقف کردم　　یکے بر مدح شاہنشاہ کشور

(۲) قصیدہ سے محض مدح سرائی کا کام نہیں لیا بلکہ واقعہ نگاری کا

بھی کام لیا ہے چنانچہ ایک قصیدے میں سلطان محمود کے فتوحات و غزوات
۲۷ اشعروں میں نظم کئے ہیں۔ اشعار یہ ہیں :-

شنیدہ خبر شاہ ہندواں جیپال ۔۔۔ کہ بر سپہر بلندش ہمی بسود افسر

× × × × × × × × ×

خدائگان خراساں بدشت پیشاور ۔۔۔ بہ حملۂ بپراگند آں ہمہ لشکر
حکایت سفر مولتاں ہمی دانی ۔۔۔ وگرنہ دانی تاج الفتوح پیش آر
اگر ز دجلہ فریدوں گذشت بے کشتی ۔۔۔ بہ شاہنامہ بر آں بر حکایت است
از آں سپس کہ دو رود ہم راشبد پایاب ۔۔۔ وز آں سپس کہ براں باد رانہ بود عبر
بہ مولتاں شد و در رہ دو یست قلعہ کشاد ۔۔۔ کہ ہر یکے را صد بندہ بود چوں خیبر

اسی طرح اور قصائد میں بھی واقعہ نگاری کی ہے۔

(۳) صنائع و بدائع کو بھی اُسی حد تک باریاب ہونے دیا ہے جتنے آرائش کلام کے لئے ضروری ہیں۔ متاخرین کی طرح سے حسن کلام کو ان زیوروں سے لاد کے بھدا انہیں کر دیا :-

تضاد
کہ آں آراستہ زلفش زرہ گردد گہی چنبر
کہ آں پیراستہ جعدش بیارد مشک وگہ عنبر

تشبیہ و ترصیع
رخی چوں تو شگفتہ گل ہمہ گلبن برنگ گل
ہمہ شمشاد پر سنبل ہمہ بیجادہ پر شکر

تضاد و ترصیع و تجنیس
زمین طاعت و زد فرماں ہمو رزق و ہمو حرماں
ہمو دردو ہمو درماں ہمو ذرد و ہمو داد ر

تنسیق الصفات و حسن تکرار
سمن بوئے شبہ موئے بلا جوئے جفا گوئے
پریزادے پریروئے پری چہرے پری پیکر الخ

یہ ہیں وہ داغ بیلیں جن پر سلمان ساوجی اور قاآنی نے اپنے کمالات کی عمارتیں قائم کی ہیں۔ سارا قصیدہ ایک ہی زور میں گیا ہے اور ایک شعر بھی کمزور نہیں ہے۔

(۴) مناظر قدرت کی تصویریں صفائی سے کھینچی ہیں :۔

ابر نوروزی ہمی گوہر بارد دبست گر شود ۔۔۔ تا ز صنعش ہر درختے لعبتے دیگر شود ۔۔۔ ہمچون الفاظ
باغ ہمچوں کلبۂ بزاز پر دیبا شود ۔۔۔ باد ہمچوں طبلہ عطار پر عنبر شود
روی بند ہر زمینے حلۂ چینی شود ۔۔۔ گوشوار ہر درختے رشتۂ گوہر شود
چوں حجابی لعبتاں خورشید رابینی کہ باز ۔۔۔ گہ بروں آید زمیغ وگہ بہ میغ اندر شود الخ

(۵) مضمون آفرینی بھی حد اعتدال میں ہے :۔

بہ نور وظلمت ماند زمین وابر ہمی ۔۔۔ بہ در و مینا ماند سرشک ابر و گیا
فریفتہ است زمیں ابر تیرہ راکہ ازو ۔۔۔ ہمی ستاند در و ہمی دہد مینا

کتنا لطف ہے۔ مینھ کی بوندیں موتی ہیں۔ گھاس وغیرہ سبز شیشے۔ بادل زمین کے قریب میں آگئے۔ موتی دے دیکے شیشے مول لے رہے ہیں۔

غزل ابھی تک ترقی پذیر نہیں ہوئی۔ ملاحظہ ہو :۔

مشکیں شود چو باد بزلف تو بگذرد ۔۔۔ عاشق شود کسیکہ بروی تو بنگرد
بر غالیہ بماند بر عارض تو باد ۔۔۔ گاہش بر و بمالد وگہ باز بسترد
نیرنگ چینیا نہ دار تنگ چینیاں ۔۔۔ ہر شب بہ نزد چشم و رخ توکہ آورد
واں صد ہزار حلقۂ مشکیں پرشکن ۔۔۔ ہر ساعتے بہ گرد گل توکہ گسترد
چشم تراست مایۂ نیرنگ و دلبری ۔۔۔ نرگس ندیدہ ام کہ بہ نیرنگ دل برد

رباعیاں یا درباری فردوں سے کہی ہیں یا عاشقانہ ہیں۔ مثلاً

تا در دو جہاں قضائے معبود بود ۔۔۔ تا خلق جہاں و چرخ موجود بود
گر ملک بود بدست محمود بود ۔۔۔ اقبال وظفر نصیب مسعود بود

عاشقانہ رنگ یہ ہے :-

ای شب نہ گفتی اینہمہ پرخاش کہ دوش | رازِ دلِ من چناں مکن فاش کہ دوش
دیدی چہ دراز بود دوشینہ شبم | ہاں ای شب وصل آنچناں باش کہ دوش

فرخی فرخی - ابوالحسن علی بن قلوغ[1] سبستانی - ادب و موسیقی میں تعلیم پائی تھی اور چنگ خوب بجاتا تھا - ابتدا میں خلف بن احمد حاکم سیستان کے دربار میں رہا ضیق معاش نے مجبور کیا تو بلخ چلا گیا - ان دنوں یہاں کا امیر سلطان محمود کی طرف سے ابو المظفر چغانی تھا - دارالحکومت میں پہونچکے معلوم ہوا کہ امیر داغگاہ میں ہے لیکن اُس کا مختار کل عمید اسعد موجود ہے - عمید کے پاس گیا تو اُسکی نظروں میں نہ سمایا - سمجھا کہ کوئی دیہاتی ہے - شاعری سے اسے کیا واسطہ مگر تہذیباً وعدہ کر لیا کہ امیر کے دربار میں حاضر کر دونگا بشرطیکہ داغگاہ کی تعریف میں شعر کہہ لاؤ - نقشہ اُس کا بتا دیا کہ کوسوں کا میدان ہوتا ہے - سبزہ زار اور چشمے جابجا نزہت افزائی کرتے ہیں گانا بجانا ہوتا ہے اور شراب کا دور چلتا ہے - امیر ایک ہاتھ میں پیالہ اور دوسرے میں کمند لیکے بیٹھتا ہے - شراب پیتا جاتا ہے اور لوگوں کو گھوڑے انعام میں دیتا ہے - رات بھر میں فرخی نے قصیدہ کہا جس کے بعض اشعار یہ ہیں :-

چوں پرند نیلگوں بر روی پوشد مرغزار | پرنیانِ ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار
خاک راچوں نافِ آہو مشک زاید بیقیاس | بید راچوں پرِ طوطی برگ روید بیشمار

× × × × × × × ×

داغگاہِ شہریار اکنوں چناں خرم شود | کاندرو از خرمی خیرہ بماند روزگار
سبزہ اندر سبزہ بینی چوں سپہر اندر سپہر | خیمہ اندر خیمہ بینی چوں حصار اندر حصار

---

[1] براؤن نے جاولغ لکھا ہے -

ہر کجا خیمہ است خفتہ عاشقے با دوست | ہر کجا سبزہ است شاداں یارے از دیدار یار

\+ + + + + + + +

بر در پردہ سرائے خسروِ پیروز بخت | از پئے داغ آتشے افروختہ خورشید وار
داغہا چو شاخہائے بُسّدِ یاقوت رنگ | ہر یکے چوں ناردانہ گشتہ اندر زیر نار
کودکانِ خواب نادیدہ مصاف اندر مصاف | مرکبانِ داغ ناکردہ قطار اندر قطار

\+ + + + + + + +

خسروِ فرخ سیر بر بارۂ دریا گزر | با کمند اندر میانِ دشت چوں اسفندیار الخ

عمید قصیدے کو سن کر پھڑک گیا فی الفور ابو المظفر کے پاس لے کے پہونچا اور کہا کہ آج وہ شاعر لایا ہوں جس کا مثل دقیقی کے بعد سے آجتک پیدا نہیں ہوا ابو المظفر نے اُسے دربار میں جگہ دی۔ شراب کا دور چلا اور سرور کا عالم ہوا تو فرخی نے قصیدہ پڑھا۔ امیر بھی بیحد مسرور ہوا اور کہا کہ ہزار بچھیرے کمیت موجود ہیں جتنے چاہو پکڑ لو۔ فرخی بدمستی میں نہ پکڑ سکا اور تھک کر سو گیا صبح کو جب ابو المظفر نے کیفیت سُنی تو ہنسا اور اپنا اسپ خاصہ۔ ایک خیمہ۔ تین اونٹ۔ پانچ غلام اور کپڑے وغیرہ دئے پھر جب معلوم ہوا کہ فرخی نے جس گلّہ پر ہاتھ ڈالا تھا اُس میں بیالیس بچھیرے تھے تو وہ سب بھی عطا کر دئے۔ چند روز کے بعد بڑے سازو سامان سے فرخی دربار سلطان محمود میں گیا حیثیت دیکھ کے فی الفور عزت افزائی ہوئی اور شعرائے خاص میں داخل کیا گیا۔ رفتہ رفتہ اتنا صاحب ثروت ہو گیا کہ بیس غلام زریں کمر ہمراہ رکاب چلتے تھے۔ سلطان محمود کے محبوب غلام ایاز سے بھی بڑی دوستی ہو گئی اور اس کی تعریف میں بھی اشعار لکھے ہیں۔ فرخی کا انتقال ۴۲۹ھ میں ہوا۔

صاحب مجمع الفصحا لکھتے ہیں " الحاصل حکیم فرخی را در شاعری طرزے کلام برائے

مرغوب است و تغزلات شیریں عاشقانہ مسرت انگیز دارد و سخن وے سہل ممتنع است۔ وے در میان مدیح گویان زمانہ خود چنانست کہ سعدی در غزل گویاں" حقیقت بھی ہے کہ فصاحت و سلاست خاص اس کا حصہ ہے اور زور طبیعت نے قصائد کو بیحد موثر بنا دیا ہے :-

برآمد نیلگوں ابرے ز روے نیلگوں دریا چو راے عاشقاں گرداں چو طبع بیدلاں شیدا
بیارید و زہم بگسست و گرداں گشت بر گردوں چو پیلانِ پراگندہ میانِ آبگوں صحرا
تو گفتی گرد زنگارست بر مرآتِ چینی تو گفتی موے سنجاب است بر پیروزہ گوں دیبا
ہمی رفت از بر گردوں گہے تارے گہے روشن وز و گہ آسماں پیدا و گہ خورشید ناپیدا
[illegible]ان سوہاں زدہ بر لوحِ پیروزہ بگردارِ عبیر بیختہ بر صفحۂ مینا
ہوا [illegible]ش از رنگش متغیر گشت و شد تیرہ چو جانِ دشمن گشتہ بہ تیغ خسرو والا
یمین دولت و دولت بدو پیراستہ گیتی امین ملت و ملت بدو آراستہ دنیا
قوامِ دینِ پیغمبر ملک محمود دیں پرور ملک فعل و ملک سیرت ملک سہم و ملک سیما
طوافِ شاعراں قائم بگرد قصر تو دائم ہمانا قصر تو کعبہ است و گرد قصر تو بطحا

یہ انتخاب فرخی کی جزالت و بلاغت کی کافی دلیل ہے۔ صنائع و بدائع کا مناسب استعمال۔ مناظر قدرت کا دلکش فوٹو۔ مدح ممدوح کی طرف نازک تخلص۔ مبالغہ۔ اغراق۔ تشبیہ و استعارہ کا لطف سب کچھ موجود ہے۔ واقعات کی تصویر ابو المظفر کی مدح میں گذر چکی ہے۔ اس صنف خاص کی عمدہ مثالیں اس کے قصائد میں متعدد ملتی ہیں بلکہ اس کا رنگ یہی ہے کہ غیر واقعی چیزوں کی بھی ایک خیالی تصویر پہلے دل میں کھینچ لیتا ہے پھر واقعہ نگاری کی شکل میں اسے بیان کرتا ہے تو خاص لطف پیدا ہوتا ہے۔ محفلِ عیش کا رنگ دیکھئے :-

سرو ساقی و ماہ رود نواز | پردۂ بستہ در رہ شہناز
زخمۂ رود زن نہ پست و نہ تیز | زلف ساقی نہ کوتہ و نہ دراز
مجلسے خوب خسروانی وار | از سخن چیں تہی و از غماز
بوستانے ز لالہ و سوسن | ہمچو روئے تذرو و سینۂ باز
دوستانے مساعد و یکدل | کہ تواں گفت پیش ایشاں راز
ماہ روئے نشاندہ اندر پیش | خوش زباں و موافق و دمساز
جعد او بر پرند کشتی گیر | زلف او بر حریر چوگاں باز
بادۂ چوں گلاب روشن و تلخ | ماندہ در خم زگاہ آدم باز
از چنیں مجلس و چنیں بادہ | ہیچ زاہد مرا ندارد باز

مرثیہ گوئی میں اسے امتیاز خاص ہے جو اس سے پہلے کسی شاعر کے لئے نہیں پایا جاتا۔ محمود کی وفات پر جو مرثیہ کہا ہے اس میں اصول مرثیہ گوئی خوب برتے ہیں۔ ممدوح کی عظمت۔ اس کے مرنے پر ملک میں رنج۔ پھر متوفی سے مخاطبت جس سے بین کا انداز پیدا ہو۔ یہ سب باتیں ملاحظہ ہوں:۔

شہر غزنین نہ ہمانست کہ من دیدم پار | چہ فتادست کہ امسال دگرگوں شد کار
کوئیہا بینم پر شورش و سرتا سر کوئے | ہمہ پر جوشن و جوشن در و پر خیل و سوار
مہتراں بینم بر روی زناں ہمچو زناں | چشمہا کردہ ز خونابہ برنگ گلنار
ملک امسال دگر بار نیامد ز غزا | دشمنے روے نہادست درین شہر و دیار
میر مے خوردہ مگر دی کہ بخفتست امروز | دیر تر خاست مگر رنج رسیدش ز خمار
خیز شاہا کہ رسولان شہاں آمدہ اند | ہدیہا دارند آوردہ فراوان و نثار
کہ تواند کہ برانگیزد ازیں خواب ترا | خفتنی خفتی کز خواب نگردی بیدار
بحصار از فزع و بیم تو رفتند شہاں | تو شہا از فزع و بیم کہ رفتی بحصار الخ

غیر مانوس بحروں میں بھی اشعار کہے ہیں اور اچھے کہے ہیں۔ تغزل کے خیالات وہی تشبیب میں ہیں یا رباعیوں میں جنکا ذکر بخوف طول ترک کیا جاتا ہے۔

عسجدی

عسجدی حکیم ابونظر عبدالعزیز بن منصور مروزی بھی اسی زمانے کے فحول شعرا میں ہے۔ سلطان محمود کے دربار میں اسکی بھی کرسی تھی اور انعامات و جائزات بہت پائے تھے۔ سنہ ۴۳۲ھ سال وفات ہے۔ صاحب مجمع الفصحا کہتے ہیں کہ "زر کلامش بر محک اہل کمال کامل عیار و بے غل و غش شدہ"۔ **دولت شاہ** وغیرہ نے صرف ایک رباعی اسکی نقل کی ہے:-

از شرب مدام لاف مشرب توبہ — وز عشق بتان سیم غبغب توبہ
دل در ہوس گناہ و برلب توبہ — زیں توبہ نادراست یارب توبہ

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طبیعت میں شوخی خاص طور پر تھی ایک قصیدے میں ساقی کو قبلۂ زردشت کہا ہے۔ یہ بھی شوخ اختراع ہے۔

برخیز و برافروز ہلا قبلۂ زردشت — بنشین و برافگن شکم قاقم بر پشت
بس کس کہ ز زردشت بگردید و دگربار — ناچار کند روے سوے قبلۂ زردشت

+ + + + + + + +

آنکس کہ ترا کشت ترا کشت و مرا زاد — وانکس کہ ترا زاد ترا زاد و مرا کشت الخ

حسن تکرار کے چند شعر یہ ہیں:-

باران قطرہ قطرہ ہمی بارم ابروار — ہر روز خیرہ خیرہ ازیں چشم سیل بار
اعلان لان

زاں قطرہ قطرہ قطرۂ باراں شدہ خجل — زاں خیرہ خیرہ خیرہ دل من زہجر یار۔

یاریکہ ذرہ ذرہ نماید ہمی نظر — ہجرانش بارہ بارہ بمن برنہادہ بار

زاں ذرہ ذرہ ذرہ بدل آمدم چو کوہ — زاں بارہ بارہ بارۂ چشم آمدم غبار الخ

عمر خیام کا رنگ ملاحظہ ہو:-

صبح است و صبا مشک فشاں می گذرد | دریاب کہ از کوی فلاں می گذرد
برخیز چہ خسپی کہ جہاں می گذرد | بوئے بستاں کہ کارواں می گذرد

فردوسی کے حالات

فردوسی۔ ابوالقاسم[۱] حسن بن اسحٰق بن شرف شاہ۔ مضافات طوس کا رہنے والا۔ غالباً ۳۲۹ھ میں پیدا ہوا۔ آزاد ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے طبیعت میں خاصہ زور پیدا ہو گیا۔ علمی مشاغل میں بسر ہوتی تھی اور شاعری کا جوہر اپنا رنگ دکھاتا تھا۔ سنا کہ دقیقی نے شاہنامہ نظم کرنا شروع کیا تھا مگر ہزار شعر کہہ کے مقتول ہو گیا۔ خود بھی شوق ہوا۔ زوالِ جمشید و عروجِ ضحاک کی داستان نظم کی تو سننے والوں کو بہت پسند آئی۔ اب کیا تھا اسی کام پر متوجہ ہو گیا۔ طوس کے عامل ابو منصور نے حوصلہ افزائی کی۔ پھر سلان خان نے بھی توجہ کی۔ سلطان محمود کو خبر پہونچی کہ فردوسی طوس میں شاہنامہ نظم کر رہا ہے۔ سلان خان کو حکم بھیجا کہ فردوسی کو روانہ کر دو۔ حکم شاہی کا ماننا واجب! فردوسی غزنین کی طرف چلا۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ دراندازیاں شروع ہو گئیں اور شعرائے دربار کو یہ خیال ہوا کہ اگر وہ آ گیا تو سب کا رنگ پھیکا پڑ جائیگا۔ کہتے ہیں کہ عنصری کی ترغیب سے ایک شخص نے لکھ بھیجا کہ یہاں نہ آنا۔ پھر اسی شخص سے جب عنصری کشیدہ ہو گیا تو لکھ بھیجا کہ پہلا خط عنصری کی شرارت سے لکھا تھا تم ضرور آؤ۔ شیخ معشوق طوسی نے پیشین گوئی کی تھی کہ شاہنامہ بہت کامیاب ہوگا۔ لہذا فردوسی ان باتوں سے کبیدہ

---

[۱] علامہ شبلی نعمانی نے نہایت محققانہ طور سے حالات لکھے ہیں اور کلام کی تنقید بھی ادبی اور تاریخی حیثیتوں سے بے نظیر کی ہے۔ یہاں بھی بیشتر شعر العجم ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔

نہ ہوا بلکہ جواب میں لکھ بھیجا :۔

بگوش از سرِ وشم بسے مژدہاست — دلم گنج گوہر زباں اژدہاست

چہ سنجد بمیزان من عنصری — گیا چوں کشد پیش گلبن سری

غرض غزنین میں آکے پہلے ایک باغ میں ٹھہرا۔ وہاں عنصری۔ فرخی اور عسجدی بھی سیر کرنے آئے تھے۔ یہ درباری تکلفات کے دل دادہ۔ فردوسی دامن صحرا کا تربیت یافتہ۔ پہلے یہ لوگ ہنسے اور کہا کہ یہاں سوائے شاعر کے کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ فردوسی نے کہا کہ میں بھی شعر کہتا ہوں۔ چاہو امتحان لے لو۔ سب ہنس پڑے اور کہا کہ اچھا آؤ۔ ہم سب ایک ایک مصرع کہتے ہیں۔ تم بھی کہو :۔

عنصری — چوں عارض تو ماہ نباشد روشن

فرخی — مانند رخت گل نبود در گلشن

عسجدی — مژگانت ہمی کند گزار از جوشن

شین کا التزام تھا شگفتہ قافیہ کہاں سے ملتا؟ فردوسی نے کہا۔

مانند سنانِ گیو در جنگِ پشن

اب روایتیں مختلف ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ عنصری خوش ہو گیا اور دربار میں لے گیا۔ کسی کا بیان ہے کہ ماہک سے دوستی ہو گئی اُس نے فضل بن احمد وزیر سے ذکر کیا اور وزیر بادشاہ کے پاس لے گیا۔ غرض فردوسی نے اپنے اشعار سنائے تو بادشاہ اور اہل دربار سب محو حیرت ہو گئے۔ ابتدا بادشاہ کی تعریف سے کی :۔

ز یزدان ابر شاہ باد آفریں — کہ تازہ دبا و تخت و تاج و نگیں

جہان آفریں تا جہاں آفرید — چو او مرزبانے نیامد پدید

زکشمیر تا پیش دریائے چین | بر و شہریاراں کنند آفرین
چو کودک لب از شیر مادر بشست | ز گہوارہ محمود[۱] گوید نخست
بہ بزم اندران آسمان و فاست | بہ رزم اندران شیر جنگ آزماست
بتن ژندہ پیل و بجاں جبرئیل | بکف ابر بہمن بدل رود نیل

پھر اپنی برسوں کی محنت کا نتیجہ سنایا یعنے شاہنامہ کے اشعار۔ محمود کو عرصے سے خواہش تھی کہ یہ کتاب نظم ہو جائے۔ فردوسی کو حکم دیا کہ اسے تمام کرو۔ ایک باغ رہنے کو دیا اور فی شعر ایک دینار دینے کو کہا اور حکم دیدیا کہ جب ہزار شعر ہو جائیں تو ہزار اشرفیاں دیدی جایا کریں۔ فردوسی کے وطن میں بارش کے موسم میں سیلاب آتا تھا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ یہاں کے روپیہ سے بند بندھوا دے اس لئے متفرق لینا پسند نہ کیا بلکہ کہا کہ ختم کتاب کے بعد اکٹھا لے لوں گا۔ مگر بقول علامہ شبلی نعمانی "علمی تاریخ کا یہ ایک ناگوار واقعہ ہے کہ فردوسی کو اُسکی اعجاز بیانی کی داد نہیں ملی" یعنے جب شاہنامہ تیار ہوا تو اُس کو اشرفیوں کے بجائے روپئے دلوائے گئے۔ وجہ یہ ہوئی کہ ایاز ہو یا حسن میمندی حسن محمد ہو یا کوئی اور شخص کسی نے بادشاہ سے کہدیا کہ فردوسی متعصب شیعہ ہے۔ اسوجہ سے بادشاہ ناراض ہو گیا۔ کوئی کہتا ہے کہ فخر الدولہ دیلمی کا تحفہ قبول کر لیا جو متعصب شیعہ تھا اور محمود کو اُس سے علاوہ مذہبی اختلاف کے پولیٹکل عداوت بھی تھی۔ غرض کچھ ہو فردوسی پر ظلم ہوا۔ جس وقت یہ روپیہ پہونچا ہے فردوسی حمام میں تھا۔ دل ٹوٹ گیا اور

[۱] مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ بچہ جب پہلے پہل بولتا ہے تو خدا کا نام لیتا ہے محمود بھی منجملہ اسمائے الٰہی ہے۔ لہذا لطف تخییل ظاہر ہے۔

وہ روپیہ وہیں سب لٹا کے کہلا بھیجا کہ میں نے یہ خون جگر سفید دانوں کے لئے نہیں کھایا تھا۔ جب محمود نے سنا تو دراندازوں پر خفا ہوا کہ تمنے مجھے بدنام کیا۔ مگر ان لوگوں نے کہا کہ فردوسی نے گستاخی کی۔ اگر بادشاہ خاک بھی دیتا تو اسے آنکھوں پر رکھنا تھا۔ بادشاہ اور جل گیا اور کہا کہ اس قرمطی[۱] کو گستاخی کا مزا چکھاؤں گا۔ صبح کو محمود باغ میں گیا تو فردوسی پانوں پر گر پڑا اور کہنے لگا:۔

چو در ملک سلطان کہ جہ خش ستود — بسے ہست ترساؤ گبر و یہود
گرفتند در ظل عدلش قرار — شدہ ایمن از گردش روزگار
چہ باشد کہ سلطان گردوں شکوہ — یہی راشمارد ازاں یک گروہ

بادشاہ کو رحم آگیا اور تقصیر معاف کردی۔ اب فردوسی غزنین سے بھاگا اور چلتے وقت ایاز کو ایک لفافہ دے گیا کہ بیس روز کے بعد بادشاہ کو دینا۔ محمود نے جو مہر کھولی تو ہجو کے اشعار تھے۔ کلام کی قوت دیکھو کہ محمود نے بڑی بڑی سلطنتیں مٹادیں مگر یہ ہجو نہ مٹا سکا اور آجتک شاہنامے کے ابتدا میں درج ہوتی ہے۔ بدنصیب شاعر بھاگ کے ہرات پہونچا تو شاہی جاسوس تعاقب میں پہونچے۔ چھ ماہ روپوش رہا۔ پھر طوس گیا اور وہاں سے قہستان پہونچا جہاں کے حاکم نے ہجو کے اشعار بحساب فی شعر ایک اشرفی مول لئے اور کہا کہ اسے شاہنامے سے مٹادو۔ فردوسی نے ایسا ہی کیا مگر وہ مشہور ہو چکی تھی اور زبان زد ہونے کی وجہ سے مٹنا دشوار ہو گیا۔ ناصر الملک نے محمود کو عریضہ بھیجا کہ فردوسی کے حق میں بڑا ظلم ہوا۔ فردوسی جب غزنین سے چلا تھا تو جامع مسجد پر یہ شعر لکھ آیا تھا:۔

---

[۱] دیکھو صفحہ ۵۴

خجستہ درگہ محمود غزنوی دریاست	چگونہ دریا کاں را کرانہ پیدا نیست
چہ غوطہا زدم و اندرو ندیدم دُر	گناہ بخت من است ایں گناہ دریا نیست

سلطان جامع مسجد میں نماز پڑھنے آیا تو ان شعروں پر نظر پڑی۔ نہایت متاسف ہوا۔ واپس آ کے ناصر ملک کا عریضہ ملا۔ دل کانپ گیا اور دوراندازوں کی زجر و توبیخ کی۔ اُدھر فردوسی مارا مارا پھرتا تھا۔ کبھی ماژندراں گیا۔ کبھی دارالمرز۔ کبھی کہیں۔ کبھی کہیں۔ مگر محمود کے خوف سے کسی امیر نے پناہ نہ دی۔ آخر بغداد آیا اور دیالمہ کو خوش کرنے کے لئے یوسف زلیخا نظم کی مگر ٹوٹے ہوئے دل میں وہ طاقت کہاں جو شاہنامہ کے تصنیف کے وقت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مثنوی بجھی رہی۔ کچھ دنوں وہاں رہ کے فردوسی وطن واپس آیا۔ ادھر محمود کو کسی ہندوستان کے راجہ سے مقابلہ کرنا تھا۔ خط بھیجا تھا جواب کا انتظار تھا۔ ایک دن وزیر سے کہنے لگا کہ میرے خلاف جواب آیا تو کیا ہونا چاہئے۔ اُس نے کہا:۔

اگر جز بکام من آید جواب	من و گرز و میدان و افراسیاب

محمود پھڑک گیا پوچھا کس کا شعر ہے۔ کہا اُسی بدنصیب فردوسی کا۔ محمود کو بہت رنج ہوا اور فی الفور ساٹھ ہزار اشرفیاں بھجوائیں مگر اُس وقت پہونچیں جب فردوسی کا جنازہ دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ پھر یہ صلہ اُسکی لڑکی کو دیا مگر اُس نے لینے سے انکار کیا۔ آخر حاکم طوس نے ایک کاروانسرا بحکم سلطانی فردوسی کی یادگار میں بنوا دی جسے ناصر خسرو وغیرہ نے دیکھا ہے۔
فردوسی کا مزار مدتوں آباد رہا اور سنہ ا ھ تک لوگوں نے اُس کی زیارت کی۔ ایک مولوی صاحب ابوالقاسم گرگانی کہتے ہیں انھوں نے فردوسی کے جنازے پر نماز نہیں پڑھی اور کہا یہ مجوسیوں کا مداح تھا

اور خود بھی انھیں خیالات کی پیروی کرتا تھا۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ
فردوسی بہشت میں نہایت شان سے ہے۔ پوچھا کہ تیری مغفرت کیونکر
ہوئی کہا اس شعر کی بدولت:

جہاں را بلندی و پستی توئی — ندانم چہ ہر چہ ہستی توئی

سال وفات ۴۱۱ھ ہے۔ صاحب مجمع الفصحا نے ۴۶۱ھ لکھا
ہے۔ معلوم نہیں اتنا اختلاف کیوں ہے۔ حالانکہ فردوسی نے ختم
شاہنامہ کی تاریخ خود لکھی ہے:۔

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار — کہ گفتم من ایں نامۂ شہریار

شاہنامہ کی تاریخی حیثیت

یعنے ۴۰۰ھ میں شاہنامہ ختم ہوا۔ اسکے بعد چند ہی سال زندہ رہا۔
۴۱۱ھ تک بھی بہت زائد زمانہ ہوتا ہے نہ کہ ۴۶۱ھ۔

فردوسی کی تصانیف میں شاہنامہ اور یوسف زلیخا ہیں اور کچھ
غزلیات اشعار و قطعات وغیرہ لیکن جس تصنیف نے اسے "خدائے سخن"
کا لقب دلایا ہے وہ شاہنامہ ہے جو تیس برس کی محنت کا نتیجہ ہے۔
تاریخی حیثیت اسکی اتنی مضبوط ہے کہ پروفیسر براؤن بہت کچھ تحقیق کرنے
کے بعد کہتے ہیں کہ "ہماری نظر میں اسکی وقعت یہ دیکھ کے بڑھ جاتی ہے
کہ جن کتابوں سے اس نے شاہنامہ لکھا ہے ان سے ترتیب وار
مطابقت پائی جاتی ہے"۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شاہنامہ کا ماخذ کیا ہے؟
مجمع الفصحا سے معلوم ہوتا ہے کہ جاماسپ نامہ۔ آئین بہمن۔ داراب نامہ
دانش افزائے نوشیروانی۔ باستان نامہ۔ دانشور نامہ۔ خرد نامہ وغیرہ
کا وجود فردوسی کے زمانے میں تھا اور ان کتابوں سے اس نے پوری
مدد لی ہے۔ علاوہ بریں خلفائے بنی امیہ و بنی عباس کے عہد میں

کئی عجم کی تاریخیں عربی میں ترجمہ ہوگئی تھیں مثلاً[1] :۔

تاریخ عجم	مترجمہ جبلہ بن سالم
سیر ملوک الفرس	؍؍ عبداللہ المقفع
؍؍	؍؍ زادویہ اصفہانی
؍؍	؍؍ محمد جہم برمکی
؍؍	؍؍ محمد بن بہرام اصفہانی
سکیران	؍؍ عبداللہ بن المقفع
تاریخ دولت ساسانی	؍؍ ہشام بن قاسم اصفہانی

فارسی میں کارنامۂ نوشیرواں۔ شہزاد و پرویز۔ کارنامہ اردشیر بن بابک۔ بہرام و نرسی نامہ۔ مزدک نامہ وغیرہ کا بھی وجود تھا۔ اس کے علاوہ سلاطین ایران کے فرامین اور وصیت نامے بھی دستیاب ہوگئے تھے اسی وجہ سے طبری ومسعودی و دینوری وغیرہ کو اپنی تاریخوں میں عجم کا حال لکھنا آسان ہوگیا تھا۔ دقیقی نے جب شاہنامہ لکھا تو سامانیوں کا کتب خانہ اس کے استعمال میں تھا جسکے متعلق شیخ الرئیس کہتے تھے کہ اس سے بڑا اور عمدہ کتب خانہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ سامانیوں کے بعد محمود غزنوی کا اس کتب خانے پر قبضہ ہوجانا تعجب خیز نہیں ہے اور فردوسی کے لئے اتنا عمدہ سامان ملنا بھی مستبعد نہیں مگر وہ ان سے مدد لینے کا اقبال نہیں کرتا اور شاہنامہ کا ماخذ یوں بیان کرتا ہے :۔

یکے نامہ بُد از گہ باستاں فراواں بدو اندراں داستاں
پراگندہ در دست ہر موبدے ازو بہرۂ بردہ ہر بخردے

---

[1] شعرالعجم جلد اول۔

یکے پہلوان بود دہقاں نژاد | دلیر و بزرگ و خردمند و راد
ز ہر کشورے موبدے سالخورد | بیاورد و ایں نامہ را گرد کرد
بپرسید شاں از نژاد کیاں | وزاں نامداران فرخ گواں
بگفتند پیشش یکایک جہاں | سخنہائے شاہان و گشت جہاں
چو بشنید ازیں شاں سپہبد سخن | یکے نامور نامہ افگند بن

یہ کتاب دو ہزار برس کی تصنیف تھی اور اسی پر شاہنامہ کے افسانوں کی اکثر بنیاد تھی۔ اسکے علاوہ اور ماخذ بھی ہیں جن کا حوالہ فردوسی برابر دیتا ہے مثلاً شغاد کی داستان کے متعلق لکھا ہے:۔

یکے پیر بد نامش آزاد سرو | کہ با احمد سہل بودے بمرو
کجا نامۂ خسرواں داشتے | تن و پیکر پہلواں داشتے
بسام نریماں کشیدش نژاد | بسے داشتے رزم رستم بیاد
بگویم سخن آنچہ زو یافتم | سخن را یک اندر دگر بافتم

اسی طرح بیژن اور طلحند وغیرہ کی داستانوں کے حوالے بھی ذکر کئے ہیں اور اگر کسی زمانے کی تاریخ نہیں ملی ہے تو صاف صاف لکھدیا ہے۔ مثلاً اشکانیوں کی طوائف الملوکی کا ذکر کرتا ہے۔

ازیں گونہ بگذشت سالے دویست | تو گفتی کہ اندر جہاں شاہ نیست
چو کوتاہ شد شاخ و ہم بیخ شاں | نگوید جہاں دید تاریخ شاں
ازایشاں جز از نام نشنیدہ ام | نہ در نامۂ خسرواں دیدہ ام

تاریخی ایمانداری کا اتنا خیال ہے کہ ہر واقعہ جتنا ملتا ہے اتنا ہی لکھتا ہے۔

گر از داستاں یک سخن کم بدے | روانِ مرا جائے ماتم بدے

شاہنامہ پڑھنے سے اندازہ ہوجائیگا کہ قدیم العہد واقعات میں اجمال
ہے کیونکہ صحیح تاریخ نہیں ملتی اور بعد کے واقعات تدریجاً مفصل ہوتے جاتے
ہیں یہانتک کہ نوشیرواں وغیرہ کے جزوی احکام اور فرامین تک موجود ہیں۔
خود فردوسی کی حیثیت پائے تخت کے مورخ کی ہے اسی وجہ سے ایرانیوں کا
خاص طور سے جنبہ دار ہے مگر اتنا سچا کہ بعض مقاموں پر ایرانیوں کے ظلم بھی
لکھدئے ہیں چنانچہ رستم نے سیاوش کے خون کا انتقام جس طرح لیا ہے
اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے :۔

همه غارت و کشتن اندر گرفت — همه بوم بردست و برسر گرفت
ز توراں زمیں تا بہ سقلاب و روم — ندید ند یک مرز آباد بوم
همه سر بریدند برنا و پیر — زن و کودک خرد کردند اسیر

عربوں کا خاص طور سے مخالف نظر آتا ہے اور ایرانی نژاد اور پائے تخت
کے مورخ کے لئے یہ کیفیت سراسر فطری ہے۔ شاہنامہ ختم کرتے کرتے یزد
جرد کی زبانی کہتا ہے :۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید ست کار
که ملک عجم را کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

اہل یورپ کی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ شاہنامہ کی داستانیں اوستا۔
یات کارزریران۔ کارنامک۔ ارتخشتر پاپکان۔ خدائی نامہ
وغیرہ سے مقابلہ کرنے پر مطابق پائی گئی ہیں۔ ہاں! یہ شکایت ضرور ہے کہ
یونانی مورخین کے بیان سے یہ افسانے بالکل نہیں ملتے لیکن یہ عقدہ علامہ
ثعلبی نے یوں حل کیا ہے کہ ہمارے پاس ایران کی تاریخ کے متعلق دو ماخذ
ہیں۔ یونانی اور ایرانی۔ ہم جانتے ہیں کہ دونوں میں اختلاف ہے لیکن یہ مسلّم

مسئلہ ہے کہ گھر کا حال گھر والا خوب جانتا ہے اسلئے ہم نے یونانیوں کے مقابلے میں ایرانیوں کا زیادہ اعتبار کیا"۔ بعض محققین کہتے ہیں کہ سیمرغ اور دیو سفید وغیرہ کے بے سروپا افسانے درج ہونے کی وجہ سے یہ کتاب پایۂ عتبا سے ساقط ہے مگر فردوسی کو وہی مجبوری ہے جو ہیرودوتوس اور ثعلبی ایسے جلیل القدر مورخوں کو پیش آئی ان افسانوں کا قوم میں مشہور ہونا متقاضی تھا کہ ضرور نقل کردئے جائیں۔

شاہنامہ کے علمی فوائد

علاوہ تاریخ عجم ہونے کے شاہنامہ کی مسلسل نظم سے مختلف زمانوں کے سیاسی اور تمدنی حالات خوب معلوم ہوتے ہیں اور قواعد معاشرت وعقائد مذہبی کی تصویریں اکثر ملتی ہیں کہیں معلوم ہوتا ہے کہ موبدوں کی رائے کے بغیر کوئی کام نہیں کیا جاتا تھا۔ کہیں پتہ لگتا ہے کہ ایرانی لوگ ظالم کے خاندان میں حکومت باقی نہیں رکھتے تھے۔ بعض مقامات پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بادشاہ تخت نشینی کے وقت کھڑے ہو کر تقریر کرتا تھا اور اپنے اصول حکومت ظاہر کردیتا تھا۔ اسی طرح دربار میں بادشاہ کا مقام امراو حجاب کے مقامات و فرائض وغیرہ وغیرہ سب ملتے ہیں۔ مولانا شبلی نے خوب فرمایا ہے کہ ان اعتبارات سے شاہنامہ ایران کا انسائکلوپیڈیا ہے۔

فردوسی کی وقعت

شاعری کی حیثیت سے فردوسی کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ "خدائے سخن" مانا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے:۔

سکہ کاندر سخن فردوسی طوسی نشاند
کافرم گر ہیچکس از جملۂ فرسی نشاند
اول از بالائے کرسی بر زمیں آمد سخن
او دگر دستش گرفت و برسر کرسی نشاند

ایک اور شاعر کا قول ہے۔

درشعر سہ تن پیمبرانند | ہر چند کہ لا نبیَّ بعدی
ابیات وقصیدہ و غزل را | فردوسی و انوری و سعدی

لیکن انوری کہتا ہے:۔

آفریں بر روانِ فردوسی | آن ہمایوں نژاد و فرخندہ
آں نہ استاد بود و ما شاگرد | آن خداوند بود و ما بندہ

نظامی کا قول ہے:۔

سخن گوے پیشینہ دانائے طوس | کہ آراست زلفِ سخن چوں عروس

سعدی کہتے ہیں:۔

چہ خوش گفت فردوسیِ پاک زاد | کہ رحمت برآں تربتِ پاک باد

شاہنامہ کی عظمت

علامہ ابن اثیر کہتے ہیں کہ "عربی زبان باوجود اس وسعت وکثرت الفاظ کے شاہنامہ کا جواب پیش نہیں کر سکتی اور درحقیقت یہ کتاب قرآن العجم ہے" غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاہنامہ نے شعرا کے حوصلے پست کر دیئے۔ ہر زمانے میں یہ کوشش رہی کہ اس کا جواب پیدا ہو مگر

جو بات لاجواب ہو اس کا جواب کیا؟

دولت شاہ کہتا ہے کہ "اکابر وافاضل متفق اند × × × × کہ دریں مدت روزگارِ اسلام مثل فردوسی از کتم عدم پائے بہ معمورۂ وجود ننہادہ والحق داد سخنوری وفصاحت دادہ وشاہد عدل برصدق ایں دعویٰ کتاب شاہنامہ است کہ دریں پانصد سال گذشتہ از شاعران وفصیحان روزگار ہیچ آفریدۂ را یارائے جواب شاہنامہ نبودہ" صاحبِ آتشکدہ کا بیان ہے کہ "دریں ہفت صد سال کسے از زمرۂ شعرا نیامدہ

که راه هم چشمی او نسنجد بلکه اعدے نبود که سر از ربقۂ شاگردی او به پیچد" اور
آجکل صاحب مجمع الفصحاے ناصری نے لکھا ہے کہ "تا ایں غایت شعرائے
عجم در نظم پارسی کتابے مانند شاہنامہ و مثنوی مولوی در عالم بیادگار
نہ گذاشتہ اند" واہل البیت اعرف بما فی البیت۔ تعجب ہے کہ
پروفیسر براؤن کی نظر میں شاہنامہ کی شاعری سکندرنامہ سے پست ہے
حالانکہ مذاق سلیم کا حکم تقابل کے بعد یہی ہے کہ شاہنامہ کہیں بلند ہے
اور بقول مولانا شبلی دونوں میں قطرہ اور دریا کی نسبت ہے۔

شاہنامہ کے خصوصیات

تنقیدی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہنامہ نے فارسی زبان
میں روح پھونک دی ہے اور اس قابل بنا دیا ہے کہ یہ زبان دوسری
قوموں کی نظر میں باوقعت ہوسکے۔ بعض خصوصیات صوری و معنوی
حسب ذیل ہیں :۔

(۱) شاہنامہ عربی زبان کی کشمکش سے بچنا چاہتا ہے۔ بہت بڑا
تغیر فارسی پر اسلام کے غلبے سے یہ ہوا تھا کہ عربی الفاظ زبان میں
بکثرت داخل ہوگئے تھے۔ رودکی وغیرہ کے کلام سے اتنا اندازہ ضرور
ہوگیا ہوگا کہ اسی وقت عربی اتنی خلط ملط ہوگئی تھی کہ زبان کی جزو مستقل معلوم
ہوتی تھی۔ دقیقی پہلا شخص ہے جس نے پرانی فارسی کے الفاظ واپس
لانے کی کوشش کی مگر کسی قدر آورد کے ساتھ۔ فردوسی نے فصاحت
زبان مروجہ کو باقی رکھنے میں خصوصیت برتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
کبھی اپنی زبان کو دری کہتا ہے کبھی پہلوی کہتا ہے۔ اصطلاحات علمیہ
بھی حتی الوسع فارسی زبان کے لاتا ہے اور آمد کے ساتھ :۔

از آغاز باید که دانی درست　　سرمایۂ گوہران از نخست
مادہ　عناصر　ازل

که یزداں زناچیز چیز آفرید — بداں تا توانائی آمد پدید
لاشئی شئی — وجود

وزو مایۂ گوہر آمد چہار — برآوردہ بے رنج و بے روزگار
زمانہ

نخستیں کہ آتش زجنبش دمید — زگرمیش بس خشکی آمد پدید
حرکت — خاک

وزاں پس زآرام سردی نمود — زسردی ہماں باز ترّی فزود الخ
سکون — آب

بوعلی سینا کی حکمت علائیہ سے موازنہ کروگے تو معلوم ہوگا کہ عربی کے تسلط کو اگر توڑا گیا ہے تو مطلب خبط ہو گیا ہے۔ فردوسی پر کسی کا تسلط نہیں۔ وہ خود زبان کا مالک ہے۔

(۲) محاکات کی خوبی یہ ہے کہ جزئیات کی بھی اگر تصویر پوری اُتار دی ہو تو بیان کر دیے جائیں۔ شاہنامہ اگرچہ رزمیہ نظم ہے مگر اکثر مواقع پر زمانۂ قدیم کے رسم و رواج۔ اخلاق و عادات۔ سیاست و تمدّن کا عمدہ نقشہ ہے۔ مثلاً اُس زمانے کے رسوم تجہیز و تکفین کا ذکر نہایت خوبصورتی سے آگیا ہے۔ جہاں رستم نے اسفندیار کا تابوت روانہ کیا ہے:۔

یکے نغز تابوت کرد آہنیں — بگسترد فرشے زدیبائے چیں

دراندود یک روی آہن بہ قیر — پراگندہ بر قیر مشک و عبیر

وزاں پس کہ پوشید روشن برش — زپیروزہ بر سر نہاد افسرش

جنازہ اٹھایا جاتا ہے اور شہزادے کا جنازہ:۔

چہل اشتر آوردہ رستم گزین — زبالا فروہشتہ دیبای چین

یکے اشترے زیر تابوت شاہ — چپ و راست اشتر پس اندر سپاہ

پشوتن ہمی رفت پیش سیاہ — بریدہ فش و دُم اسپ سیاہ

بر او بر نہادہ نگونسار تریں ... زریں اندر آویختہ گرز کیں
ہماں ناموز خود و خفتان اوی ... ہماں ترکش و مغفر جنگجوی

(۳) حسن و عشق کے بیان میں نہایت متین ہے جامی و نظامی کی طرح حد سے باہر نہیں ہوتا۔ اسی طرح بزم کے بیان میں بھی اعتدال پسند ہے۔ یہ اسلام کی شجاعت و ملک گیری کے زمانے کا شاعر ہے۔ سوز و گداز۔ نالہ و فریاد کی ادائیں کیا جانے۔ اسکے ہیرو بھی اسی منش کے ہیں۔ دل دینا اور بات ہے اور مست ہو جانا اور بات ہے۔ سہراب کے ایک حریف کے چہرے سے میدان جنگ میں جھلم ہٹ گئی۔ دیکھا کہ ایک خوبصورت عورت ہے۔ یہ فریفتہ ہو گیا۔ وہ دھوکا دیکے نکل گئی۔ ہجر کا دور ہوا۔ نالوں کا وقت آیا مگر کیونکر:۔

ہمی گفت ازاں پس دریغا دریغ ... کہ شد ماہ تابندہ در زیر میغ
ابر
غریب آہوے آمدم در کمند ... کز از بند جست و مرا کرد بند
میرے کمند میں آیا
زہی چشم بندی کہ آں پُر فسوں ... بہ تیغم تخست و مرا ریخت خوں
شعبدہ ... زخمی نہ کرد
ندانم چہ کرد آں فسونگر بمن ... کہ ناگہ مرا بست راہ سخن
بہ زاری مرا خود بباید گریست ... کہ دلدار خود را ندانم کہ کیست

(۴) ایجاز و اختصار سے کبھی کبھی علم بلاغت کی داد دیتا ہے۔ اور جتلاتا ہے کہ صاحب ذوق سلیم اختصار کے ذریعے سے کلام میں وہ زور پیدا کرتا ہے جو تفصیل میں ممکن نہیں:۔

کنوں جنگ سہراب و رستم شنو ... دگرہا شنیدستی ایں ہم شنو

جنگ کی حالت میں ایک بار مشورے کی ضرورت ہوئی۔ لڑائی کی گھمسان

ہیں کسی نہ کسی طرح ایک گوشۂ عافیت ڈھونڈھ نکالا گیا۔ سرداران فوج نے مشورہ کیا اور پھر لڑائی میں مصروف ہو گئے۔ ایسے وقت کے حالات کی تفصیل کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ واقعہ نگار اگر لکھے تو خلاف واقع ہو گا۔ سچی تصویر ایجاز و اختصار میں کھنچے گی۔

پئے مشورت انجمن ساختند　　نشستند و گفتند و برخاستند

جو اس ایجاز میں لطف ہے بھلا تفصیل میں کہاں؟

(۵) صنائع و بدائع کو یہ سمجھا گیا ہے کہ استحسان کلام کے لئے لازم ہیں اور جس طرح بنے ٹھوس ٹھاس کے لائے ضرور جائیں حالانکہ کلام لطیف میں یہ خوبیاں از خود پیدا ہوتی ہیں اور کوئی نہ کوئی معنوی غرض صحیح لئے ہوئے آتی ہیں۔ مثلاً مبالغہ جو جھوٹ سمجھا گیا ہے مذاق سلیم میں اظہار حقیقت کا بہترین آلہ ہے۔ کسی کو غصہ آتا ہے تو کہتے ہیں "قہر شد" "بخشم آمد" لیکن اگر یہ ظاہر کرنا ہو کہ غصہ کی حالت میں حرارتِ جسم بڑھ جاتی ہے۔ چہرہ تمتمانے لگتا ہے۔ گرم خون رگوں کو توڑ کے باہر نکلنا چاہتا ہے تو کیونکر ادا کریں۔ ادبی نزاکت میں اتنی قوت نہیں کہ مسائل حکمیہ کی ہر وقت متحمل ہو سکے۔ مبالغہ یہ مشکل آسان کرتا ہے اور کہنے والا کہہ دیتا ہے کہ "برافروخت" یا "آتش غضبش برافروخت" اور اسی حال میں دشمن کو مار کر زمین پر گرا دیا تو کہتا ہے کہ "خرمنِ حیاتِ عدو را بسوخت"۔ حسن تعلیل کے متعلق گزشتہ ابواب میں ذکر ہو چکا ہے۔ غرض "خدائے سخن" چاہے مضمون آفرینی کرے چاہے واقعہ نگاری ہمیشہ مصلحت آفرینش پر نظر رکھتا ہے اور خواہ مخواہ نہ محراب عبادت میں گلچینی کرتا ہے نہ باغ میں سجدے۔ کہتا ہے:-

بروز نبرد آں یلِ ارجمند | بہ شمشیر و خنجر بہ گرز و کمند
بُرید و درید و شکست و ببست | یلاں را سر و سینہ و پا و دست

دیکھو کس شان سے معرکۂ قتال کی تصویر کھینچی ہے اور آلات حرب کا برمحل استعمال کس اطمینان قلب اور چابک دستی کا مرقع دکھاتا ہے۔ علمائے بدیع نے اس کا نام لف و نشر رکھدیا اور ہاتنا ہی نظر آسکا۔ مدرسے میں جلکے سُنائی دیگا کہ یہ اشعار لف و نشر کی مثال ہیں۔ ذرا غور سے دیکھو کیا اتنی ہی بات ہے یا کچھ اور بھی ہے۔ یا

فرو شد بہ ماہی و برشد بہ ماہ | بُنِ نیزہ و قبّۂ بارگاہ
زمیں گرد میداں کہ برشد بہ دشت | زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

ذرا انصاف سے کہنا کہ صنعت لف و نشر مرتب اور مبالغہ کہدینے سے ان شعروں کی خوبی ختم ہوگئی یا میدان کارزار کے دیکھنے والوں کی جلالت سے متاثر اور رستخیز سے متحیر دلوں کا نقشہ ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مظفر و منصور فوج کی عظمت و جلالت کا اثر تحت الثریٰ سے لیکے فوق السماء تک ہے۔ اور ہنگامہ اس بلا کا کہ زمین کے طبقے اُڑتے نظر آتے ہیں۔ اس گھبراہٹ میں خدا جانے دیکھنے والے کے دماغ میں کیا کیا خیالات پیدا ہو رہے ہیں اور قوت متخیلہ ان کی تصویریں آنکھوں کے سامنے کس کس رنگ میں پیش کر رہی ہے۔

(۶) پرانی زبان کے باقیات صالحات کی غالباً آخری جلوہ گاہ ہے۔ مردہ محاورات و الفاظ کو زندگی کا عاریتی جامہ پہنا کے میدان سخن میں گلگشت کا موقع دیا گیا ہے۔ لیکن یہ حیات مستعار فردوسی کی زندگانی سے وابستہ ہے۔ خدائے سخن کے بعد ان کا عالم کون و فساد میں باقی رہنا محال ہوگیا۔ نہ اسم و فعل کے بعد الف زائد دکھائی دینگے۔ نہ ہر جگہ الف و

نون سے جمع بنے گی۔ نہ "چناں" کی جگہ "چوناں" نہ "بے" کی جگہ "ابے" یا "بر" کی جگہ "ابر"۔ "ہیچ" یہاں "ایچ" تھا اور "ازیں رو" کو "ازیں را" کہتے تھے۔ چند الفاظ کی فہرست یہ ہے :-

لفظ	معنی	لفظ	معنی
ویژہ	خاص	بسندہ	کافی
آخر	اصطبل	شارسان	شہر
آزرگشسپ	برق	خشت	نیزۂ کوچک
پیسچ	قصد	ایدوں	حالا
پازہر	تریاک	تخش	تیر
پدرام	آراستہ	آغاز	ارادہ
مر	شمار	بگماز	شراب
آزیں	آرائش	شخودن	خراشیدن
افسوس	ظلم	ریمن	مکار[1]

(۷) مذاق حال کی تنقید کا فیصلہ ہے کہ اس رزمیہ نظم میں جن اشخاص کا ذکر ہوا ہے اُن کا کیریکٹر بدلنے نہیں پاتا۔ رستم کی شجاعت۔ عالی ظرفی اور سلطنت ایران سے وفاداری وہاں بھی ظاہر ہے جہاں اسفندیار ولیعہد تاج ایران سے مقابلہ ہوا ہے۔ کہتا ہے کہ بار الہا

تو دانی کہ بیداد کوشد ہمی — بمن جنگ و مردی فروشد ہمی

بہ بادافرہ این گناہم مگیر — توای آفرینندۂ ماہ و تیر

بڈھوں اور جوانوں کے مقابلے میں دونوں کے خصوصیات سن و سال کا

---

[1] تفصیل شعر العجم حصہ اول میں ملیگی۔

لحاظ رکھتا ہے۔ ایک کے یہاں جوشِ جوانی دوسرے کے یہاں تجربہ کاری ہر مقام سے مترشح ہے بہرام گور اور منذر سے جو مکالمہ ہوا ہے اُس سے عرب و عجم کے طرزِ معاشرت اور عنوانِ تخیل کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔ افراسیاب زور و ظلم کا کیرکٹر ہے۔ ضحاک بد طینتی اور ظلم کا ہیرو ہے کیکاؤس میں عظمت و شجاعت کے ساتھ ساتھ راج ہٹ اور کسی قدر کینہ پروری موجود ہے کیخسرو میں اخلاقِ حمیدہ کا توفر ہے اور عظمتِ ایران کا کامل جلوہ۔

(۸) قوانینِ حکمت، اخلاق کا مخزن وہ مواعظ ہیں جو بطورِ استطراد آجاتے ہیں۔ فلسفۂ مذہب پر آزادانہ نظر ہے۔ حق کا جلوہ سب میں ہے۔ صنم سے صمد تک تھوڑا راستہ ہے۔ سپین دخت یہی بات سام سے کہتی ہے:۔

خداوندِ ما و شما خود یکیست | بہ یزدانِ ما ہیچ بیکار نیست
گذشتہ از و قبلۂ ما بت است | چہ در چین و کابل چہ در ہند و بست[۱]
اُس کے علاوہ بت
شما را خود آتش پرَ فروغ | تو دانی کز یں در نگفتم دروغ
مناسب ہے | کہ اس مبحث پر
پرستیدنِ ہر دو راہِ بد است | چو ما را ہمہ آرزو ایزد است[۳]

سیاسیات و اقتصادیات کے مسائل بھی الٰہیات سے کم نہیں پھر بلاغت کی یہ حالت ہے کہ جس مسئلے کا ذکر کرتا ہے مقتضائے حال کو نظر انداز ہونے نہیں دیتا۔ موبدوں کی طرزِ ادا اور ہے۔ پہلوانوں کی اور مضامینِ عشقیہ

---

[۱] جن ممالک کے نام لئے ہیں وہ سب زمانۂ قدیم میں بت پرست تھے۔ محض ضرورتِ شعر سے چند نام بے سمجھے بوجھے نظم نہیں کئے ہیں۔

[۲] معلوم ہوتا ہے کہ آتش پرستی کیانیوں سے بھی پیشتر تھی۔ گشتاسپ کی حیثیت مجدّدِ مذہب کی ہے۔

[۳] فلسفیانہ نظر اور مذاقِ کلامی کا نمونہ۔

ہیں یہ الزام لینا آسان ہے کہ سوز و گداز نہیں مگر بلاغت کو پسِ پشت پھینک دینا ناممکن۔ رستم کے باپ کی عاشقانہ کیفیت اور ہے اور محمود شاہ رنگیلے کا رنگ اور۔ اگر معیار تنقید یوں قائم ہو جائے تو فردوسی سے بہتر شاعر ملنا دشوار ہے۔ محققانہ بحث شعر العجم جلد چہارم میں بالاستیعاب موجود ہے۔ مولف کو اختصار مانع ہے اگرچہ

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم — چنانکہ حرف عصا گفت موسیٰ اندر طور

اسدی۔ ابونصر علی بن احمد طوسی۔ بادشاہان عجم کی اولاد میں ہے۔ تحصیل علوم کے بعد آل بویہ کے دربار میں باریاب ہوا۔ پھر آذربیجان میں ابودلف کرکری تک رسائی ہوئی۔ کہتے ہیں کہ ایک وزیر کی فرمائش سے گرشاسپ نامہ نظم کیا جسے بعض لوگ شاہنامہ سے بہتر سمجھا کئے۔ یہ دس ہزار شعر اب بھی ملتے ہیں جن کی تصحیح صاحب مجمع الفصحا[1] نے کی ہے۔ دولت شاہ کا بیان ہے کہ یہ فردوسی کا استاد تھا جب شاگرد کا آخر وقت آیا تو استاد کو وصیت کی کہ شاہنامہ ناتمام رہ گیا ہے اسے پورا کر دے چنانچہ اسدی نے استیلائے عرب سے لیکے آخر تک چار ہزار شعر کہہ دئے ہیں جو آخر شاہنامہ میں درج ہیں مگر محققین نے بالاتفاق اس روایت کو غلط سمجھا ہے اسدی کی بڑی[2] ایک خصوصیت یہ ہے کہ مناظرے نظم کئے ہیں جن سے اسکی قوت تخییل کا

۱؎ مجمع الفصحا۔ ۲؎ براؤن نے لکھا ہے کہ مناظرہ گو ابونصر احمد بن منصور اسدی طوسی ہے اور مصنف گرشاسپ نامہ و لغت عجم اس کا بیٹا ابونصر علی بن احمد طوسی ہے۔ یہ معاملہ تحقیق طلب ہے مولانا شبلی اور صاحب مجمع الفصحا دونوں کو ایک سمجھتے ہیں اور دوسرے تذکرہ نویس بھی انھیں کے ہم آہنگ ہیں ۱۲

کافی اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مناظرۂ شب و روز۔ مناظرۂ زمین و آسمان۔ مناظرۂ گبر و مسلم۔ مناظرۂ قوس و رمح مجمع الفصحا میں درج ہیں۔ ان میں سے ایک منوچہر بن قابوس کی تعریف میں بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبار یول کے دربار میں بھی گیا تھا سلطان محمود کے سبعۂ سیارہ میں اس کا بھی شمار ہے اور براؤن کی روایت ہے کہ مناظرہ عرب و عجم میں شمس الدولہ اور مجد الدولہ سلاطین آل بویہ کی مدح کی وجہ سے محمود اس سے ناراض ہو گیا تھا۔ وفات سلطان مسعود بن محمود کے زمانے میں ہوئی ہے۔ علاوہ گرشاسپ نامہ اور مناظرات کے ایک لغت مجم بھی اس کی یادگار ہے۔

مناظرات میں قوت تخیل کا زور ہے اور معلومات علمیہ کے اظہار کا ایک نیا راستہ نکالا گیا ہے۔ اگرچہ سوال وجواب کا طریقہ عنصری نے ایجاد کیا ہے لیکن وہ گفتگوے محض تھی اور یہ مخالف کے مقابلے میں اپنی فضیلت ثابت کرنا ہے۔

گردست و مراتب ہستی خدا اے ما ہر سان شگفت بجد از ارض تا سما
نتواں شمرد از یں دو کہ فضل کدام بیش کاندر شمار شاں نتواں یافت انتہا
اندر حکایت است کہ ہر دو را گہی بُد در سخن جدل زرہِ فخر و کبریا
گفت آسماں فعال مرا جملہ حکمت است وز حکمت است در حکما حکمت و ذکا
گفتش زمیں کہ قحط و وبا ہم ز تو بود چہ حکمت است قحط و برآوردن وبا
گفت آسماں مرا ز تو ہیبت فزوں از آنک بر سرم اژدہا ست میان شیر با بلا
گفتش زمیں چہ ہیبت ترا اژدہا و شیر بیش است صد ہزار مرا شیر و اژدہا
گفت آسماں ز قدرت جبار من مدام گردندہ ام معلق و بے جاے و اتکا
گفتش زمیں اگر تو بہ گردش معلقی من نیز ہم معلقم استادہ در ہوا الخ

لہ ان اشعار میں جن الفاظ پر ۔ نشان بنا ہے وہ پرانی زبان کے ہیں۔

زبان ایرانی ضرور ہے مگر تکلفاتِ عربیت سے مملو۔ فردوسی کی طرح دامنِ دشت کی تازی ہوائیں اسکے یہاں نہیں ملتیں۔ شہری آرائش ہے اور ویسی ہی نفاست بھی۔ گردشِ فلکی کا واقعاتِ عالم پیدا کرنے میں موثر ہونا۔ ستاروں کی شکلیں۔ ہیئت و ہندسہ کی اطلاع حرکتِ فلک۔ سکونِ زمین وغیرہ وغیرہ اکثر اشعار میں موجود ہیں۔ پورے قصیدے میں اور بھی لطف ہے گو حرچ بائی ہے۔ اس شاعری پر چاہو جیسی رائے قائم کرو مگر زورِ طبیعت کی داد دینا ہوگی۔ گرشاسب نامہ مثنوی ہے مگر زبان کا رنگ اور تخیل کا مذاق بھی شہری ہے۔ فردوسی کا اوستاد ہونا تو مشکل ہے البتہ بقول مولانا شبلی شاہنامہ اور سکندر نامہ کے بیچ کی کڑی ہے۔ حکیمانہ رنگ میں بہترین اشعار گرشاسب نامہ کے حقیقت روح کے بیان میں ہیں:—

چناں داں کہ جاں برتریں گوہر است | نہ زیں گیتی از گیتی دیگر است
درخشندہ شمعیست از جائے پاک | فتادہ دریں ژرف تارے مغاک
یکے نور بینائے تابندگی | پذیرائے بیداری و زندگی
نہ آرام جوی و نہ جنبش پذیر | نہ از جائے بیروں و نے جائے گیر
سپہر بریں بستۂ بندِ اوست | جہاں ایستادہ بہ پیوندِ اوست
نہاں از نگارست لیک آشکار | ہمی برگرد گونہ گونہ نگار
ببیندت و دیدن ورا روئے نیست | کشد کوہ و ہم سنگ یک موئے نیست
تن او را بکردار جامہ است راست | کہ گر بفگند ور بپوشد رواست
تنت خانۂ داں بباغے درون | چراغش روان زندگانی ستون

سب کچھ سہی مگر فردوسی کی بات کہاں؟

ابو الفرج سنجری ابو الفرج سنجری امیر ابو علی سنجور کے دربار کا شاعر ہے۔ یہ امیر

دولت سامانیہ کے طرف سے حاکم خراسان تھا۔ آخر سلطان محمود نے اسے گرفتار کرلیا اور خود خراسان کا مالک ہو گیا۔ بجور کے حکم سے منجہری آل سبکتگین کی ہجو کرتا تھا۔ محمود نے اسے بھی گرفتار کرایا مگر عنصری نے سفارش کی اور خطا معاف ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ عنصری اس کا شاگرد بھی تھا اور استاد نے شاگرد کی تعریف میں قصائد کہے اور بہت سا مال حاصل کیا۔ سنہ ۴۰۰ھ کے بعد انتقال ہوا کلام کمیاب ہے۔

بندار رازی

بندار رازی۔ خواجہ کمال الدین نام۔ امیر مجد الدولہ دیلمی اور اس کے وزیر صاحب بن عباد کے دربار کا حاضر باش ہے اور رہا۔ انھیں امرا کی مدح گستری میں وقت صرف کیا۔ دیلمی۔ عربی۔ فارسی زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ سنہ ۴۰۱ھ میں وفات پائی اور مجد الدولہ بھی اسی سال مقتول ہوا۔ کلام کمیاب ہے اور یہ قطعہ یادگار :-

از مرگ حذر کردن دو روز روا نیست

روزیکہ قضا باشد و روزیکہ قضا نیست

روزیکہ قضا باشد چیزے نکند سود

روزیکہ قضا نیست درو مرگ روا نیست

منوچہری

منوچہری۔ حکیم ابوالنجم احمد دامغانی۔ علوم و آداب ختم کرنے کے بعد عنفوان شباب میں امیر منوچہر بن قابوس کی خدمت میں باریاب ہوا اور اسی کے نام پر تخلص رکھا۔ اس زمانے میں قادر باللہ عباسی کی خلافت تھی مگر سلطان محمود کا اتنا جاہ و جلال تھا کہ امیر منوچہر کو بچاس ہزار دینار سلطان غزنین کو سالانہ پیشکش کرنا ہوتے تھے۔ منوچہر کو وفاداری کے صلے میں سلطان کی دامادی کا شرف حاصل ہوا۔ سنہ ۴۱۱ھ میں اس امیر

خوش تدبیر کا انتقال ہوگیا اور منوچہری یہاں سے مایوس ہو کے غزنین چلا گیا۔ اگرچہ اسدی کا شاگرد تھا مگر عنصری کا ایسا دور دورہ تھا کہ اُس کی شاگردی کرنی پڑی۔ بعض نقادان فن کی رائے ہے کہ قصیدہ استاد سے بھی اچھا کہتا تھا۔ سلاطین غزنویہ کی مدح سرائی میں زندگی ختم کر دی۔ مولانا شبلی کی تحقیق ہے کہ سلطان محمود کے بعد شعرائے آل غزنین میں آ کے شامل ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ محمود کی تعریف میں کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ محمد بن محمود غزنوی نے اسے ترخانی کا منصب دیا یعنی دربار میں بغیر روک ٹوک کے چلا جاتا تھا۔ مسعود بن محمود نے بھی اتنی قدر دانی کی کہ اور شاعروں کو رشک ہونے لگا اور رفتہ رفتہ اس کا لقب شصت کلہ ہو گیا کوئی کہتا ہے کہ ساٹھ خیمے تھے کوئی شصت گلہ پڑھتا ہے اور ساٹھ گلوں کا مالک سمجھتا ہے۔ سنہ ۴۳۲ھ میں فوت ہوا۔ اس کا کلام اس وقت صاحب مجمع الفصحا کا مرتب کیا ہوا موجود ہے جس میں تین ہزار اشعار ہیں:۔

فرانس میں بھی اس کا دیوان نہایت آب و تاب سے شائع ہوا مولانا شبلی نے اسے دیکھا ہے اور کہتے ہیں کہ "میں نے اس سے فائدہ اُٹھایا ہے"۔

کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ شعرائے عرب کا اتنا دلدادہ ہے کہ اُن کے قصیدوں پر قصیدے فارسی میں نظم کرتا ہے اور بے تکلف اُن کا ذکر کرتا ہے۔ کہتا ہے :۔

من بسے دیوان شعر تازیان دارم زبر
تو ندانی خواند الا ہبی بصحنک فاصبحین[1]

---

[1] عمرو بن کلثوم کا قصیدہ جس کا مطلع ہے۔

الا ہبی بصحنک فاصبحینا ولا تبقی خمور الاندرینا

ولہ

امرؤ القیس[1] و لبید و اخطل و اعشی و قیس

بر طلل با نوحہ کردند ے و بر رسم تلی

آنکہ گفتست اذ تنشا[2] آنکہ گفت آلا ھبی[3]

آنکہ گفت السیف اصدق[4] آنکہ گفت لی الحو[5]

کلام عرب کے تلمیحات وغیرہ بھی اسی وجہ سے اسکے کلام میں بکثرت آگئے ہیں بلکہ بعض قصیدوں کی تشبیہیں بالکل عربی مذاق کی ہیں اور تخییل تک عرب کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ زبان کی شیرینی اور فصاحت و لطافت نے اور بھی دل آویزی پیدا کر دی ہے :۔

اے ترک من امروز نگوئی کہ کجائی | تاکس بفرستیم و بخوانیم و بیائی
آنکس کہ نباید بر ما زود تر آید | تو دیر تر آئی بہ بر ما کہ بیائی
دانی کہ من شیفتہ تر باشم بر تو | عذرے بنہی بر خود و نازے بفزائی
گوئی بر رخ کس منگر جز بر رخ من | اے ترک چنیں شیفتۂ خویش چرائی
من در دگراں زاں نگرم تا بحقیقت | قدر تو بدانم کہ ز خوبی بچہ جائی

مناظر قدرت کا مرقع بھی خوب کھینچتا ہے۔ خزانیہ مسمط سلطان مسعود غزنوی کی مدح میں نظم کرتا ہے :۔

(۱)

خیزید و خز آرید کہ ایام خزانست

باد خنک از جانب خوارزم وزانست

---

[1] شعرائے عرب کے نام۔ [2] حارث بن حلزہ [3] عمرو بن کلثوم [4] ابو تمام۔ [5] متنبی۔

آں برگ رزانست کہ برشاخ رزانست
گوئی بمثل پیرہن رنگ رزانست
دہقان بہ تعجب سرانگشت گزانست
کاندر چمن باغ نہ گل ماند و نہ گلنار

(۲)

طاؤس بہارے را دنبال بکندند — پرش ببریدند و بہ کنجے بفگندند
خستہ بمیاں باغ بزاریش پسندند — با او ننشینند و نگویند و نخندند
واں پر نگارینش بدو باز نہ بندند — تا آذر مہ بگذرد و آید آزار الخ

دیکھو کس قدر کلام میں حلاوت ہے۔ بعض مقام پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیچرل شاعری کا بادشاہ ہے۔ سراپا نظم کرنے کا شاید موجد یہی ہے۔ خیالی تصویروں پر حقیقی تصویر کو فوقیت دیتا ہے اور تنسیق الصفات کی صنعت سے کام لیکے جوش طبیعت کا تماشا دکھاتا ہے۔ ایک عربی گھوڑے کا سراپا دیکھو:۔

حبّذا اسپے محجّل مرکبے تازی نژاد
نعل او پروین نشان و سُمّ او خارا شکن
رام زین و کش خرام و خوش عنان و تیز گام
شخ نورد و راہ جوے و سیل بُرّ و کوہ کن الخ

تشبیہات و استعارات میں جدت کا شوق ہے۔ مبتذل قسموں کو چھوڑ کے غریب صنفوں کیطرف اس کا دل کھینچتا ہے۔ آفتاب طلوع ہونے کا حال نظم کرتا ہے تو یہ خیال آتا ہے کہ روشنی بہ تدریج بڑھتی ہے جیسے جھلملاتا ہوا چراغ کہ جتنا تیل ڈالتے جاؤ گے اتنی روشنی بڑھتی جائے گی۔

کہتا ہے :-

بکردارِ چراغِ نیم مردہ　　کہ ہر ساعت فزوں گردوش روغن

ہلال دیکھ کے خیال آتا ہے کہ کسی معشوق نے اپنے سونے کے کڑے کا منہ کھولدیا ہے :-

چناں چوں دو سرازہم باز کردہ　　ز زرِ سرخ یک دست آورنجن

کڑا

لغزیات بھی یادگار ہیں شمع کے متعلق کہتا ہے :-

چیست آن شخصے چو زرّین سرو چوں سیمین چمن

خویشتن سوزان و گریان و گداز ان ہمچو من

باغ او بزم سلاطین جاے او صدرِ شہان

بارِ او زرّیں سلاسل بیخ او سیمیں لگن

خیز زاں رنگست اگر نورست رنگِ خیز راں

نارون بار است اگر نار است بار نارون

ہر کسے دارد دہن بر روی او دارد بفرق

واندرو نجمِ فروزان چوں سہیل اندر یمن الخ

خاتمہ　　دورۂ غزنویہ کو یہاں پر ختم کردینا مناسب ہے اگرچہ ابھی بہت سے شعراؤ مصنفین کا ذکر باقی رہ گیا ہے۔ مثلاً بہرامی سرخسی مصنف خجستہ نامہ و غایت العروضیین و کنز القافیہ یا لبیبی۔ ایمنی۔ ابو الفضل طالقانی۔ منشوری۔ عطاردی۔ زینت علوی محمودی وغیرہ اور خصوصاً کسائی مروزی جس کا نشو ونما آل سامان کے زمانے میں ہو چکا تھا بلکہ اسنے نوح بن منصور سامانی کا مرثیہ بھی کہا ہے :-

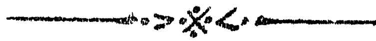
جنازۂ تو ندانم کدام حادثہ بود　　کہ دیدہا ہمہ مصقول ماند و تیغ مجروح

زآب دیدہ چو طوفانِ نوح شد ہمہ رو جنازۂ تو دراں آب ہمچو کشتی نوح

سلطان محمود کی مدح سرائی بھی کی اور آل غزنین کا عروج و زوال سب کچھ دیکھا۔ عروج سلاجقہ جب ہو گیا تو دنیا سے رحلت کی۔ امیر ناصر خسرو کو اس کی تعظیم ملحوظ رہتی تھی اور اکثر اس کے قصیدہ و ں پر قصیدے کہے ہیں۔ ایک مقام پر ناصر خسرو نے کہا ہے :-

من چاکر و غلام کسائی کہ او بگفت جان و خرد رونده بریں چرخ اخضر اند

امیر سعید ابوالخیر کا نشو و نما بھی اسی دور میں ہو گیا تھا مگر ان کا ذکر آل سلجوق کے سلسلے میں آئے گا۔



باب ہفتم

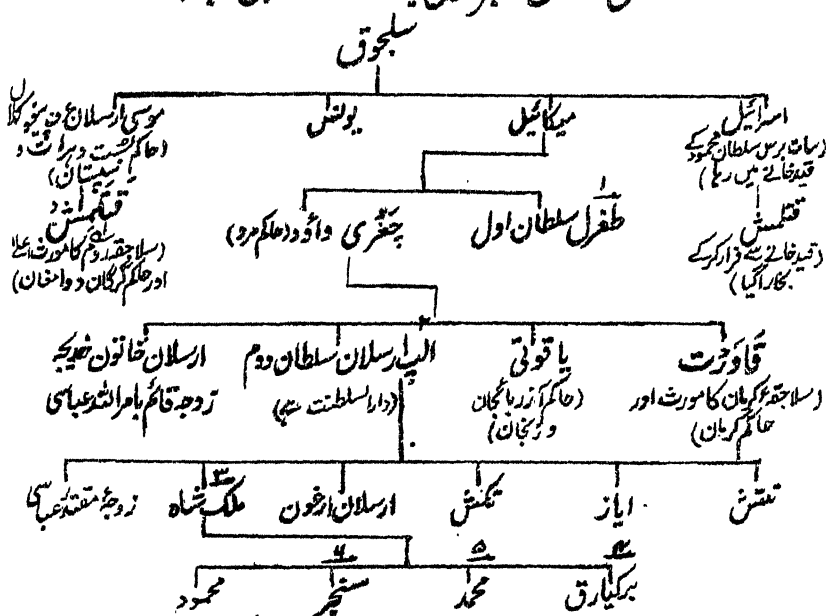
سلجوقیہ

سلجوق

اس خاندان کا عروج دنیائے اسلام میں غزنویوں سے جلد تر ہوا۔ ابن اثیر نے مورث اعلیٰ کا نام تقاق بتایا ہے جس کا بیٹا سلجوق مسلمان ہو گیا۔ گرمیوں کے موسم میں سمرقند ان کا مستقر تھا اور جاڑوں میں بخارا۔ غالباً حافظ شیرازا اپنے معشوق کو ہر موسم میں بہترین مقام دینا چاہتے ہیں بلکہ ہر فصل کی دار السلطنت ترکوں کی دے دیتے ہیں تاکہ ہمیشہ معشوق ہی کی حکومت رہے۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ مارا بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اس خاندان کا شجرہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے :-



محمود غزنوی کی طلب پر یہ لوگ بخارا میں آباد ہوئے تھے مگر ان کی روز افزوں قوت

ل ایشیائے کوچک مراد ہے ۔ ۱۲

دیکھ کے محمود کو کھٹکا پیدا ہو گیا اور اسرائیل کو قلعہ کالنجر میں قید کر دیا جہاں وہ سات برس میں تڑپ تڑپ کے مر گیا۔ آل سلجوق کو اس خون ناحق کے انتقام کا جوش ہوا اور موقع کے منتظر رہے۔ اُدھر محمود کی وفات کے بعد خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں

طغرل اِدھر طغرل نے اس کمزوری کا فائدہ اٹھایا اور محرم ۴۲۹ھ میں مستقل بادشاہ بن کے مرو اور نیشاپور میں اپنا نام خطبہ میں پڑھوا دیا۔ اور رفتہ رفتہ طبرستان وسیستان ہرات۔ زنجان۔ کرمان وغیرہ فتح کر کے ایک وسیع سلطنت قائم کر لی بلکہ مودود غزنوی کو بھی خراسان میں شکست فاش دیدی۔ پھر یہ تمام مفتوحات اہل خاندان پر تقسیم کر کے خود پہلا سلطان آل سلجوق کا بنا اور خلیفہ قائم عباسی سے اجازت سلطنت حاصل کرنے کے لئے بغداد میں بڑے شان وشوکت سے داخل ہوا جہاں دربار خلافت سے سلطان المشرق والمغرب کا خطاب پایا اور تقریباً ۲۴ سال حکومت کر کے ۴۵۵ھ میں انتقال کیا۔

الپ ارسلان طغرل کے بعد اس کا بھتیجا الپ ارسلان وارث سلطنت ہوا اگرچہ عمید الملک وزیر نے چاہا کہ سلیمان کو تخت پر بٹھائے مگر یہ حوصلہ عمید کے حق میں مہلک ثابت ہوا اور نہایت بُری طرح قتل کیا گیا۔ الپ ارسلان کا وزیر نظام الملک طوسی اپنی قابلیت خداداد سے انتظام سلطنت میں کامیاب ہوا اور ترویج علوم میں بڑی کوشش کی۔ مدرسہ نظامیہ بغداد اسی کی یادگار ہے اور سیاست نامہ سی نادر کتاب اسی کے دماغ کا نتیجہ ہے متعصب شافعی ہونیکی وجہ سے اشاعرہ اور شیعوں سے متنفر تھا خصوصاً فرقہ باطنیہ کا دشمن جانی ہو گیا تھا اگرچہ قصّوں میں مشہور ہے کہ حسن بن صباح سرگروہ باطنیہ اس کا ہمدرس رہ چکا تھا۔ مگر ہمدرسی اور ہمدردی امور سلطنت میں لازم وملزوم نہیں ہو سکتے۔ امام غزالی کا عروج اسی کے عصر میں ہوا اور معقولات کی تعلیم کا خصوصیت کے ساتھ

چرچا ہو گیا۔ الپ ارسلان کی سلطنت کا زمانہ صرف نو برس ہے مگر اس عرصے میں بہت سے کارنامے ظاہر ہوئے خلفائے بنی فاطمہ کا اقتدار افریقہ میں جبل الطارق کے حدود سے لیکے مصر تک تھا اور ایشیا کے کوچک سے کہ معظمہ و مدینہ منورہ تک انکا اثر حرمین شریفین اور حلب سے اس نے مٹا دیا اور دیوجانس قیصر روم کو بھی ایک جنگ میں قید کر لیا مگر آخر میں اپنا باجگذار بنا کے جان بخشی کر دی۔ ۴۶۵ھ میں دریائے سیحون کے اُس پار ترکوں سے ایک جنگ عظیم میں مصروف ہوا۔ وہاں ایک شخص نے بھرے دربار میں سلطان کو زخمی کیا یہ زخم مہلک ثابت ہوا اور چند روز کے بعد انتقال کر گیا اور مرو میں دفن کیا گیا۔ ایک شاعر نے کہا ہے :۔

سر الپ ارسلان دیدی ز رفعت رفتہ بر گردوں
بمرو آتا بخاک اندر سر الپ ارسلان بینی

ملک شاہ و نظام الملک

بعد ازاں ملک شاہ اُس کا بھتیجا سترہ برس کی عمر میں وارث سلطنت ہوا۔ اس کا ابتدائی زمانہ نہایت نازک تھا۔ علاوہ امرائے غزنین و سمرقند کے خود قاورت اسکے چچا نے بغاوت کی مگر نظام الملک کی حکمت عملی سے سب کے سب زیر ہو گئے عمر خیام نے اسی عہد میں عروج حاصل کیا اور رصد خانہ ملک شاہی اور زیچ ملک شاہی تیار کی جو علم ہندسہ کے بہترین کارنامے ہیں۔ ابو طاہر خاتونی نے مناقب الشعرا اسی عہد میں لکھی جو اب نایاب ہے۔ ملک شاہ دو مرتبہ اپنی عہد حکومت میں بغداد گیا اور خلیفہ وقت نے بیحد عزت کی۔ سرحد چین سے عدن تک اور کاشغر و ماوراءالنہر سے بلاد روم تک اس کی حکومت کا ڈنکا بجتا تھا اور حق یہی ہے کہ اتنی وسیع سلطنت آل سلجوق کو کبھی نصیب نہ ہوئی۔ آخر عہد میں ترکان خاتون کے بھڑکانے سے ملک شاہ کو نظام الملک سے عداوت ہو گئی اور اُسے معزول کرکے ابوالغنائم تاج الملک کو وزیر کیا۔ نظام الملک کو اس ناقدری پر افسردہ خاطری پیدا ہو گئی اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد رمضان ۴۸۵ھ میں بمقام نہاوند مقتول ہوا اور چالیس روز کے بعد

ملک شاہ نے بھی انتقال کیا۔ نظام الملک کی معزولی پر امیر معزی[ؒ] نے کہا ہے۔

نشناخت ملک سعادتِ افسرِ خویش · · · · در منقبت وزیر خدمت گرِ خویش
بگماشت بلائے تاج بر لشکر خویش · · · · تا در سر تلج کرد تاج سرِ خویش

ملک شاہ کے انتقال کے بعد آل سلجوق کی عظمت پر انقلاب آگیا۔ بڑا بیٹا برکیارق تیرہ سال کی عمر میں بمقام رَے تخت نشین کیا گیا اور سب سے چھوٹے لڑکے محمود کو چار سال کی عمر میں اُس کی ماں ترکان خاتون نے خلیفہ مقتدی باللہ عباسی کے استصواب سے اور ابوالغنائم تاج الملک وغیرہ کی مدد سے اصفہان میں بادشاہ بنایا اور برکیارق سے بغاوت کی مگر انجام کار میں شکست نصیب ہوئی لیکن تلتش اُس کا چچا لطائف الحیل سے برکیارق کو لے آیا اور کوشک میدان میں قید کر کے آنکھیں نکلوا لینے کا ارادہ کیا۔ قضائے کار محمود کے چیچک نکل آئی اور ہلاک ہو گیا اور برکیارق کی شاہی تسلیم کرنی پڑی۔ جب برکیارق کا پورا تسلّط ہو گیا تو اُس نے اپنے بھائی سنجر کو حاکم خراسان مقرر کیا اور خود عراق واپس آیا۔ یہاں اسے اپنے دوسرے بھائی محمد سے مقابلہ کرنا پڑا اور چند لڑائیوں کے بعد دونوں میں صلح ہو گئی۔ بالآخر برکیارق نے اپنے شیرخوار فرزند ملک شاہ ثانی کو ولیعہد مقرر کر کے انتقال کیا۔ برکیارق

اب محمد بن ملک شاہ کی بن آئی اور بھتیجے کو معزول کر کے آنکھیں نکلوالیں اور خود مستقل بادشاہ ہو گیا۔ اسکی عہد سلطنت کا کوئی واقعہ سوائے استیصال ملاحدہ[1] کے نہیں اور تیرہ سال کی سلطنت یوں ہی ختم ہو گئی پھر اُس کا بیٹا محمد غیاث الدین محمد بن ملک شاہ

---

[1] فرقہ اسمٰعیلیہ کا نام تعصب سے رکھا گیا تھا۔ حسن بن صباح و عبد الملک عطاش و محمد عطاش اسکے سرگروہوں میں مشہور رہیں۔ دو سو برس تک ایران کے بڑے بڑے مضبوط قلعے انکے قبضے میں رہے جو تاریخ میں قلاع ملاحدہ کہلاتے ہیں اور سلاطین وقت کو انسے زحمت رہی۔

چودہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا مگر حماقت میں آ کے اپنے چچا سنجر سے لڑ گیا نتیجہ اس جنگ کا بجز شکست کے اور کیا ہو سکتا تھا مگر سنجر نے اسکی خطا معاف کر دی اور عراق کا حاکم کر دیا جہاں چودہ برس اُس نے حکومت کی اور آخر میں سلطان سنجر کا داماد بھی ہو گیا۔

سنجر

سنہ ۵۱۱ھ میں سلطان سنجر کی سلطنت کا اعلان بغداد میں ہو گیا جس نے باوجود زحمت اور کوفت کے اکتالیس سال سلطنت کی علوم وفنون کی ترویج کے لئے یہ عہد تاریخ عجم میں یادگار رہے۔ امیر معزی۔ ارزقی۔ انوری۔ سوزنی وغیرہ شعرائے جلیل القدر اس دور کی یادگار ہیں۔ طوسی طبری۔ نسفی وشہرستانی وغیرہ کے مصنفات عربی میں اسی عہد میں شائع ہوئے۔ مقامات حمیدی۔ تاریخ بیہقی اسی عہد میں تصنیف ہوئیں۔ غرضکہ فارسی لٹریچر میں اس کثرت سے کتابیں شائع ہوئیں اور زبان فارسی بھی ایسی سلیس وشستہ ہو گئی کہ شاید و باید۔ خاص وجہ اس ترقی کی یہ بھی تھی کہ آل سلجوق کا پائے تخت ایران میں تھا اور غزنویہ وسامانیہ سلاطین کا مستقر دولت ایران سے باہر رہا لہذا اس عہد میں خاص ایرانی نژاد لوگوں کو ترقی کا موقع ملا اور زبان کی اچھی خاصی اصلاح ہو گئی۔ سلطان سنجر نے غزنویوں کو عروج دیا اور بہرام شاہ کو شاہ غزنین بنایا جسکی علم دوستی کی تاریخ فرشتہ میں تعریف ہے اور تصوف کی شاعری کی بنیاد اسی کے عہد میں پڑی۔ خوارزم شاہیوں میں سلطان اتسنر اسی عہد میں خود مختار ہو گیا اور سنجر کو بار بار مقابلہ کرنا پڑا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت سلجوقیہ میں کمزوری پیدا ہو گئی۔ پھر ترکوں نے سنجر کو اس طرح گھیرا کہ برائے نام بادشاہ رہ گیا اور مرو۔ سرخس۔ بیہق اور نیشاپور قبضے سے بالکل نکل گئے۔ آخر ۵۵۲ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

سنجر کے بعد سے تاریخ عجم کا خاکہ بدل گیا اور مختلف شہروں میں چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوگئیں اور آل سلجوق کی عظمت برائے نام رہ گئی۔

معاصرین

اسی عہد میں سلاجقہ کرمان کی خود مختار سلطنت قائم ہوئی اور توران شاہ و ایران شاہ وارسلان شاہ و مغیث الدین محمد شاہ علی الترتیب بادشاہ ہوئے۔ خلافت عباسیہ میں بھی کمزوری پیدا ہوگئی مقتدی باللہ کا انتقال ہوا بعد ازاں مستظہر باللہ کا ۲۳ سال خلافت کرنے کے بعد خاتمہ ہوا۔ پھر مسترشد اور راشد اسمٰعیلیوں کے ہاتھ سے اور بعض کہتے ہیں کہ سنجر کے اشارے سے قتل ہوئے کیونکہ آل سلجوق اس زمانے میں خلیفہ گری کا کام کر رہے تھے۔ سلاطین غزنویہ کا خاتمہ علاء الدین حسن غوری کے ہاتھوں ہوگیا اور بہرام شاہ بری طرح مارا گیا۔ خوارزم شاہی جو ملک شاہ کے ساقی انوشتگین کی اولاد میں تھے اور اس گھر سے سلطنت پائے ہوئے تھے اب بالکل خود مختار ہوگئے۔ اتسز کے واقعات لکھے جاچکے۔ شہرستان میں بھی ایک مستقل سلطنت تھی۔ یہ سب کچھ سہی مگر بایں ہمہ علوم و فنون کی ترویج میں کوشاں تھا اور بکثرت شعراء و مصنفین کی تربیت اس عہد میں ہوئی۔ اب ہم بعض مصنفین و شعراء کے حالات لکھتے ہیں:۔

سیاست نامہ نظام الملک

اس زمانے کے لٹریچر میں سیاست نامہ نظام الملک کا ذکر سب سے پہلے آنا چاہیئے جس کا دوسرا نام سیر الملوک ہے۔ پچاس بابوں میں ہر قسم کے نظم و نسق سلطنت کا بیان آگیا ہے اور حسن و قبیح ہر شعبہ کا نہایت خوش اسلوبی سے مبرہن کیا گیا ہے اور اکثر روایات تاریخیہ بھی مذکور ہیں جو مورخین کے لئے خاص طور سے قابل وقعت ہیں۔ عبارت سلیس نثر میں ہے اور بیفائدہ صنائع و بدائع میں جکڑی نہیں گئی ہے۔ ۴۸۴ھ کی نثر کا بہترین نمونہ اور اس زمانے کے مذہبی اور سیاسی خیالات کا عمدہ مرقع ہے۔

ناصر خسرو — امیر ناصر خسرو علوی بھی اسی عہد کے قلِ سر سبد ہیں۔ سالِ ولادت ۳۹۴ھ ہے۔ ۹ برس کی عمر میں قرآن اور احادیثِ کثیرہ کو حفظ کر لیا اور ۲۲ برس کی عمر تک طلب علم میں وقت صرف کرکے ریاضیات و الہیات میں کمال حاصل کیا اور فقہ و تفسیر وغیرہ میں بھی اچھی خاصی مہارت پیدا کر لی بلکہ تورات وانجیل کا بھی درس ختم کیا۔ پھر چھ سال ریاضت میں صرف کئے اور چالیس برس کی عمر میں تسخیرات و نیرنجات وغیرہ میں دسترس پیدا کیا۔ تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ بکثرت امصار و بلاد کے سفر کئے اور حرمین شریفین اور بیت المقدس کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ مستنصر باللہ فاطمی کے یہاں مصر میں تقریباً تین سال قیام کیا اور وہاں سے واپس آکے اسمٰعیلیت کی ترویج میں مصروف ہو گئے[1] بلکہ ایک تفسیر قرآن ملاحدہ کے رنگ میں لکھی جس سے بہت بدنام ہوئے۔ آخر ۴۳۱ھ میں ۱۴۰ برس کی عمر پاکر انتقال کیا۔ ان کے مصنفات میں سفرنامہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ عبارت میں وہی سادگی اور روانی ہے جو قدما میں رائج تھی مثلاً لکھتے ہیں:—

بر سر آں چاہیست کہ نوشادر ازاں حاصل میشود و گویند
کبریت نیز۔ مردم پوست گاؤ می برند و پُر نوشادر می کنند و
از سر کوہ بغلطانند کہ براہ نتواں فرود آوردن۔

یہ نمونہ ۴۵۰ھ کی نثر کا ہے۔ امیر صاحب نے ایک کتاب کنز الحقائق بھی نثر میں لکھی ہے۔ اسکے علاوہ نظم میں روشنائی نامہ اور سعادت نامہ اور زاد المسافرین ہیں اور ایک دیوان تقریباً بارہ ہزار بیت کا ہے دولت شاہ وغیرہ نے قانون اعظم و

[1] صاحب مجمع الفصحا انھیں اثنا عشری سمجھتے ہیں۔

دستور اعظم وغیرہ کو بھی فہرست مصنفات میں ذکر کیا گیا ہے قصیدہ گوئی میں وہی انداز ہے جو قدما کا تھا۔ واقعہ نگاری کا رنگ زیادہ ہے اور تخئیل بقدر مناسب۔ ان اشعار میں اپنے اقوال فلسفہ بھی درج کئے ہیں مثلاً انسان کا فاعل مختار ہونا۔ تاویل کی طرف توجہ ظواہر سے قطع نظر۔ زہد کو بغیر علم و عقل کے بیکار سمجھنا۔ خدا کو حادث و قدم سے بلند تر ماننا۔ انسان کا عالم صغیر ہونا۔ دنیا کا با وجود عدم انتہائے زمان و مکان حادث ہونا اجرام سماوی کا حوادث عالم کے لئے موثر ہونا وغیرہ وغیرہ۔ خلفائے فاطمیین کی مدح اور اہل بیت رسولؐ کی حمایت اکثر کی ہے اور خلفائے بنی عباس سے اختلاف ظاہر کیا ہے۔ مثلاً کہا ہے :۔

چو شبِ دین سیہ و تیرہ شود فاطمیان   صبحِ مشہور و مہ و زہرہ و شمس و قمر ند

اسی قصیدے کے ابتدائی اشعار فلسفیانہ رنگ میں ہیں :۔

ایں رفیقاں کہ بریں گنبد پیروزہ درند   گرچہ زیرند گہی جملہ بمعنی زبرند

ناسزایاں زنی تو ستارہ است ولیکن سوئے عقل   پیشکاران و رقیبانِ قضا و قدرند
(نگہبانان ۱۲)

سوے ما زاں نگرند آری کز جوہر شاں   خرد و جان سخنگوی بما در اثرند

اندریں جائے گیاہان زیانکار بسے است   زیں چراگاہ ازیرا حکما برحذرند
(ازیں روے ۱۲)

غالباً امیر صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے فلسفہ کو شعر میں داخل کیا مگر کسیقدر روکھا سوکھا کیونکہ محض حکایتِ اقوال سے لطف نہیں آتا تا وقتیکہ تخئیل اپنا رنگ نہ چڑھائے۔ موعظت کے میدان میں یہ سادگی البتہ موثر ہوتی ہے مثلاً :۔

زاد برگیر و سبک باش مکن جائے قرار   خانۂ را کہ مقیمانش ہمہ در سفرند

لہ ہائے مختفی کا ساقط کرنا متقدمین میں رائج تھا۔

فلسفہ کی تعریف :۔

حکمت آبیست کجا مردہ بدو زندہ شود　　حکما برلب ایں آب مبارک شجر ند

تخلیص نہایت خوب ہے :۔

شجر حکمت پیغمبر ما بود ہمی　　ہر یک از حکمت او نیز درختی ببر ند

پسرانِ علیؑ امروز ہمرا ور ا بسزا　　پسرانند چو مر دختر ا و را پسر ند

پسرانِ علیؑ آنہا کہ اماماں حق اند　　بجلالت بجہاں در چو پدر شہر اند الخ

دیکھو! پرانی زبان کا اثر باقی ہے ۔زی۔ازیرا۔مر۔ہمی۔کجا وغیرہ بے تکلف مستعمل ہیں اور ترکیبوں میں بھی تراش خراش نہیں ہوئی ہے۔

شب تاریک کا ہول اور اپنے جاگنے کا حال نہایت زور میں نظم کرتا ہے :۔

شبے تارے چو لے ساحل دماں پر قیر دریائے
پر جوش ۱۲

فلک چوں پر ز نسریں برگ۔ قیراندودہ صحرائے
مراد از ستارگان　　از جہتہ تاریکی

زمانہ رخ بہ قطراں شستہ واز رفتن برآسودہ
زیراکہ سیاہ است ۱۲　　حرکت سے رکا ہوا

کہ گوئی تا فرید ستش خدائے فرد فردائے
اسی سے رات بہت طولانی ہو گئی ۱۲

ندیدا ز صعب تاریکی و تنگی اندریں خیمہ
شدت ۱۲　　فضائے عالم ۱۲

نہ چشم تار من شخصے نہ جانِ خفتہ رویائے
مبالغۂ مقبول ۱۲

مرا چوں چشم ۔دل زی خلق۔ چشم من بسوے شب

چو اندر لشکرے خفتہ یکے بیدار دانائے

اگر ستر او ضرّا ور ندید ستی۔ نکو بنگر
راحت ۱۲　مصیبت ۱۲

ستارہ زیر ابر اندر چو ستر از یر ضرائے

۱؎ مشدد کو مخفف کرنا بغرض فصاحت شروع ہو گیا۔

دیکھو بالکل قاآنی کا رنگ ہے۔ تشبیہات کا زور اور بڑھتا جاتا ہے :-

چو در تاریک چہ یوسف شود مشتری در شب — دراو زہرہ بماند دیدہ حیراں چون زلیخائے
کنیسہ مریم استی چرخ گفتی پُر زگوہر ہا — نجوم ایدوں چو رہباناں۔ ثریا چون چلیپائے

پورا قصیدہ جزالت میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہی رنگ بہار وغیرہ صلیب ۱۲
کے نظم کرنے میں ہے اور یہی مداحی میں بھی غالب ہے۔ ایک قصیدے میں غزنویہ
زیاریہ اور سلجوقیہ وغیرہ کے عروج و زوال کو بھی نہایت پُر اثر موعظ کے پیرایہ
میں بیان کیا ہے۔ ان کا کلام بیجا خوشامد سے پاک ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ
پہلے قادر الکلام شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کو اظہارِ عقائد و خیالات کے
لئے محدود کر دیا۔ انکا تخلص کہیں حجت ہے کہیں ناصر۔

امیر ابوسعید ابوالخیر

امیر ابوسعید بن ابوالخیر۔ وطن۔ مہنہ۔ چودہ برس جذب کے عالم میں
رہ کے سلوک اختیار کیا اور پھر ہمیشہ سالک رہے۔ سال وفات ۴۴۰ھ۔
شیخ الرئیس بوعلی سینا کے ہمعصر ہیں۔ امیر صاحب نے ابن سینا کے بارے میں
کہا تھا۔ ”جو میں دیکھتا ہوں وہ جانتا ہے“ اور شیخ نے امیر صاحب کے
متعلق کہا ”جو میں جانتا ہوں وہ دیکھتا ہے“ یعنے شیخ کے لئے مرتبہ علم الیقین
کا تھا اور امیر صاحب کے لئے عین الیقین کا کیونکہ فلسفہ بھی حقائق اشیا کو
جاننا چاہتا ہے اور تصوف بھی مگر فلسفہ حواس خمسہ ظاہری سے بیشتر کام
لیتا ہے اور تصوف اس سے بالا ترجا کے روحانی ترقی کرتا ہے اور
برای العین حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہی فرق علم استدلالی اور علم شہودی
میں ہے۔ غرض امیر ابوسعید پہلے شخص ہیں جنھوں نے مقاماتِ تصوف رباعیوں
میں نظم کئے ہیں مگر رنگ وہی ناصر خسرو کا ہے یعنے مسائل علمیہ کو بغیر رنگ آمیزی کے
بیان کر دینا۔ اختلاف مذاہب کی گتھی سُلجھاتے ہیں اور معشوق حقیقی کو

مخاطب کرتے ہیں:-

راہِ تو بہر قدم کہ پویند خوش است　　وصلِ تو بہر سبب کہ جویند خوش است
روے تو بہر دیدہ کہ بینند نکوست　　نامِ تو بہر زباں کہ گویند خوش است

عشقِ الٰہی کا مرتبہ یوں ظاہر کرتے ہیں:-

غازی برہِ شہادت اندر تگ و پوست
غافل کہ شہیدِ عشق فاضل تر ازو ست
در روز قیامت ایں بداں کی ماند
کیں کشتۂ دشمن است و آں کشتۂ دوست

بابا طاہر عریاں

بابا طاہر عریاں (غالباً ۴۱۰ھ میں انتقال ہوا) سلطان طغرل جب ہمدان میں داخل ہوا تو ایک مقام پر ان سے ملاقات ہوئی۔ بابا طاہر نے کہا "اے ترک اخلقِ خدا کے ساتھ کیا کریگا؟" جواب دیا "جو آپ کا حکم ہو"۔ کہا "نہیں وہ کر جو خدا کا حکم ہے۔ ان اللہ یامر بالعدل والاحسان۔ احسان کر اور عدل کر" سلطان رو دیا اور کہا کہ ایسا ہی کرونگا۔ ان کی زندگی کی حالت جذب میں گذری۔ کلام اپنے وطن کی زبان میں ہے جو عروض کے اعتبار سے قطعات میں داخل ہے۔ مقاماتِ صوفیہ کا حال اور حالت جذب میں جوش و خروش قلب کی تصویر ہے:-

مگر شیر و پلنگی اے دل اے دل　　بما دائم بجنگی اے دل اے دل
اگر دستم فتی خونت بریزم　　وِ وِینم تا چہ رنگی اے دل اے دل

آفتی ۱۲　　ببینیم ۱۲

ولہ

وِشم واشم ازیں عالم بدر شم　　وِشم از چین و ماچین دیرتر شم
بشوم ای برکوم ۱۲ واشم ۱۲ شوم ۱۲

وِشم از حاجیاں حج بسر سم　　کہ اے دیری بسے یا دیرتر شم
ہست فرصت ۱۲

حکیم سنائی ۔ ابوالمجد محمد آدم غزنوی (بعضے بلخی کہتے ہیں) ابتدا میں قصیدہ گو تھے اور بہرام شاہ غزنوی کے مداح ۔ ایک دن شراب خانہ کیطرف گئے تو دیکھا کہ ایک دیوانہ لائے خوار نام شراب مانگتا ہے اور یہ کہتا ہے "بہرام شاہ کے اندھے پن کا صدقہ میرا پیالہ بھردے" ساقی نے کہا کہ "یہ کیا؟ وہ تو بڑا عقلمند بادشاہ ہے" ! کہا کہ "کمبخت اپنے ملک کا انتظام کر نہیں سکتا اور ہندوستان فتح کرنے چلا ہے" پھر کہا "اچھا ! سنائی شاعر کے اندھے پن کا صدقہ میرا جام بھردے" ساقی نے پھر کہا "ارے وہ بڑا عمدہ آدمی ہے اور خوشگو شاعر" کہا کہ "واہ ! وہ تو پکا احمق ہے ۔ چند بے سر و پا باتیں طمع زر میں نظم کرتا ہے اور ایک بیوقوف کے سامنے کھڑے ہو کے پڑھ دیتا ہے ۔ اگر قیامت کے دن سوال کیا گیا کہ کیا تجھے اسی ہرزہ گوئی کے لئے پیدا کیا تھا تو خدا کے لئے کیا جواب دیگا" یہ سنکر سنائی پر رقت طاری ہوئی اور جذب کی حالت میں دنیا کو چھوڑ دیا ۔ حج کرنے سر و پا برہنہ گئے ۔ پھر غزنین واپس آئے اور گوشہ نشین ہو گئے ۔ ۵۲۵ھ[1] میں انتقال کیا ۔ تصانیف میں ایک دیوان قصائد اور سات مثنویاں ہیں ۔ حدیقہ ۔ سیر العباد ۔ طریق التحقیق ۔ عشق نامہ ۔ عقل نامہ ۔ بہروز بہرام ۔ کار نامۂ بلخ ۔

قصائد میں پختگی اور برجستگی اور صفائی ویسی ہی ہے جیسے قدما کے کلام کے لئے مخصوص ہے ۔ اپنے معاصرین میں پایۂ امتیاز ان کا بھی بلند ہے ۔ ایک معمولی واقعہ کے لئے منطقیانہ استدلال پیدا کرنا یا قوت تخیل سے اس میں رنگ پھر دینا انکے کلام میں خاص طور سے نمایاں ہے اور فلسفۂ اخلاق و تصوف کو اسی طریقے سے انہوں نے خوشگوار کر دیا ہے

---

[1] بعض سنائی کی وفات ۵۴۵ھ بتاتے ہیں اور بعض ۵۳۵ھ

مثلاً شراب نوشی کو منع کرتے ہیں :۔

نکند عاقل مستی۔ نخورد دانا مے | ننهد مردم ہشیار سوے مستی پے
گر کنی بخشش۔ گویند کہ مے کرد نہ او | در کنی عربدہ گویند کہ او کرد نہ مے

دیکھو کس خوبی سے سمجھایا ہے کہ مستی کے عالم میں اگر اچھائی کرو تو مست کی بات کا اعتبار کیا۔ وہ تو جو کچھ کیا شراب نے کیا اور اگر برائی کرو تو خمیازہ بھگتو۔ گناہ کی معذرت سنو :۔

بحرص از شربتے خوردم۔ مگیر از من کہ بد کردم
بیاباں بود و تابستان و آبِ سرد و استسقا

ہائے اُستاد مرحوم نے کیا خوب اسی مطلب کو ادا کیا ہے :۔

فرشتو! رحمت حق سے گنہ میرے بتا دینا
مگر اتنا بھی کہہ دینا یہ باتیں تھیں جوانی کی

جوش و سرمستی آتی ہے کہ مولانا روم اور حافظ شیراز کے ایسے مست شُعرا اسی میخانے کے بادہ خوار نظر آتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا ہے :۔

نیم جوشی کردہ ام من نیم خام | از حکیم غزنوی بشنو تمام

ثبوت میں چند اشعار ایک قصیدے کے نقل کیے جاتے ہیں :۔

برگِ بے برگے نداری لاف درویشی مزن
رُخ چو عیاراں میارا جاں چو نامرداں مکن
یا برو ہمچوں زناں رنگے و بوئے پیش گیر
یا چو مرداں اندر آؤ گوئے در میداں فگن
سر برآر از گلشنِ تحقیق تا در کوئے دیں
کشتگان زندہ بینی انجمن در انجمن

در یکے صف کشتگاں بینی بہ تیغے چوں حسینؑ
در دگر صف خستگان بینی بزہرے چوں حسنؑ

راہِ خدا میں مصائب و آلام کی شدّت جتنی بڑھتی جاتی ہے اُتنی ہی روحانی قوت ترقی کرتی ہے۔ قوت تخیل نے موجودات خارجی میں تمثیل ڈھونڈھ لی ہے:۔

درد دیں خود بوالعجب درد است کاندر وے چو شمع
چوں شوی بیمار بہتر گردی از گردن زدن

ریاضت کی ضرورت بیان کرتے ہیں:۔

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

دیکھو کس رنگ میں فیض الٰہی کو آفتاب سے تشبیہ دی ہے اور قلب انسان کو سنگ سے اور کیا نتیجہ نکالا ہے۔ غرض اختصار مانع ہے ورنہ حکیم سنائی کا کلام معرفت اور معنویت سے لبریز ہے حُبِّ آلِ محمدؐ دل میں اس قدر ہے کہ دوسروں کو ان کے برابر دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ حدیقہ اور اکسیر العباد ایسی نایاب کتابوں سے لوگ ناراض ہوگئے کیونکہ ان میں بنی اُمیہ پر طعن کئے گئے تھے اور علمائے ریاکار کی قلعی کھولی گئی تھی:۔

تن شاں زیر و دل زبر دیدم قبلہ شاں روی یکد گر دیدم
مردماں دیدم اندر و جمعے روشن و تیرہ ذات چوں شمعے

یعنے دوسرے کے لئے باعث ہدایت اور خود سیاہ قلب:۔

اصل خود را فدائے خود کردہ خویشتن را غذائے خود کردہ
یاد و معشوقہ نازمی کردند بدو قبلہ نمازمی کردند

یعنے دنیا و دین دونوں کو پوجتے ہیں۔ اہل رضا و توحید کا حال لکھا ہے:۔

صفِ دیگر کہ خاص تر بودند بے دل و دست و پا و سر بودند

خوردہ یک بادہ بزنخ ساقی ۔۔۔ ہرچہ باقی است کردہ در باقی
فارغ از صورت مراد ہمہ ۔۔۔ برتر از کثرت تضاد ہمہ

حقیقت یہ ہے کہ حکیم غزنوی اس اساس کے موسس ہیں۔ خود کو بھی احساس ہے:۔

کس نگفت اینچنیں سخن بجہاں ۔۔۔ ور کسی گفت۔ گو بیا رو بخواں!"
زیں نمط ہرچہ در جہاں سخن است ۔۔۔ گر یکے ور ہزار آنِ من است

عمر خیام — عمر خیام بن ابراہیم نیشاپوری۔ مشہور ہے کہ طلب علم کے زمانے میں اسکے ہمدرس نظام الملک[۱] اور حسن بن صباح تھے۔ تینوں میں صلاح ہوئی کہ جو کوئی ہم میں سے بڑے منصب پر پہونچے اپنے ساتھیوں کو بھی بڑے مرتبے عطا کرے۔ اتفاق روزگار کہ نظام الملک کو وزارت نصیب ہوئی اور حسب معاہدہ دونوں ساتھیوں کے ساتھ سلوک کرنا چاہا مگر حسن بن صباح نے حوصلے بڑھے ہوئے تھے البتہ عمر خیام کو حسب روایت آتشکدہ نیشاپور میں جاگیر عطا کی۔ خیام کی حیثیت اگرچہ معمولی جاگیردار کی تھی مگر علم و فضل کی بدولت نہایت محترم تھا۔ سلاطین وقت اسے اپنے برابر بٹھاتے تھے اور علمائے اسلام فلسفہ و حکمت میں ابن سینا کا ہمسر اور فقہ و حدیث میں "امام خراساں" اور "علامہ زماں"[۲] سمجھتے تھے۔ ریاضیات میں رصدخانہ ملک شاہی (۴۶۷ھ) کی بنا اور زیج ملک شاہی یادگار ہیں۔ تفسیر و قرات میں بھی بلند پایگی کے ثبوت تاریخ الحکمائے شہرزوری وغیرہ میں ملتے ہیں۔ فلسفیانہ مذاق کیوجہ سے علمائے عصر کے قلوب

---

[۱] پروفیسر براؤن کا خیال ہے کہ نوشیرواں بن خالد وزیر آل سلجوق ان کا ہمدرس ہوگا کیونکہ نظام الملک اور ان دونوں کی عمر میں بہت تفاوت ہے ۱۲۔

[۲] تاریخ الحکمائے قفطی۔

خیام سے صاف نہ تھے اور طبیعیات، ریاضیات، وجود اور مسئلہ کون و فساد پر رسائل تصنیف کرتے تھے اور تبھی اس کا مسلک مذہبی عام عقائد سے جدا نظر آتا تھا۔ وفات کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ ایک مرتبہ اسکے وقت ابن سینا کی کتاب الشفا میں وحدت و کثرت کی بحث دیکھتے دیکھتے اٹھا اور عشا کی نماز پڑھی۔ سجدے میں جا کے کہا کہ خداوندا! جتنا ممکن تھا تجھے پہچانا۔ اب میری مغفرت کر دے۔ ایسی الفاظ زبان پر جاری تھے کہ دم نکل گیا۔ سال وفات ۵۱۷ھ[1] ہے۔ تربت بھی ایسی جگہ اتفاقاً بنی کہ سرہانے زردآلو اور امرود کے درخت تھے اور ہر سال اس پر پھول برسا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ خیام اسکی بھی پیشین گوئی کر گیا تھا۔

تعجب ہے کہ باوجود اس فضل و کمال کے عمر خیام کا نام اگر روشن ہوا تو رباعیوں کی وجہ سے۔ یہ رباعیاں بیشتر یورپ کی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں خصوصاً فٹز جیرلڈ کا انگریزی میں منظوم ترجمہ یادگار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چار مصرعوں میں جس لطف سے اپنے خیالات ادا کر دیئے ہیں اُسکی نظیر ملنا دشوار ہے۔ اگرچہ متداول مجموعۂ رباعیات میں انوری، عنصری، ابن سینا، عطار، محقق طوسی وغیرہ تقریباً ڈیڑھ سو سال کے مختلف شعرا کے کلام اسطرح داخل ہو گئے ہیں کہ امتیاز کرنا دشوار ہے۔ پھر بھی جو کچھ عمر خیام کا خالص کلام سمجھا گیا ہے حسنِ اسلوب و عنوان ادا میں دنیائے شاعری کا ایک روشن چراغ ہے جو بجھائے نہ بجھے گا۔ تقریباً آدھی رباعیاں عیش پسندی کیطرف مائل کرتی ہیں اور اسی عالم فانی کے لذات سے بہرہ اندوز ہونے کو غنیمت جانتے ہیں جنکی وجہ سے عمر خیام کو ایشیا کا ایپیکورس سمجھا گیا ہے حالانکہ نہ ایپیکورس کا فلسفہ اسی قدر تھا نہ عمر خیام کا۔ ہاں! دونوں کے مختلف فلسفوں کا مختلف اعتبارات اور وجوہ سے ایک جزو عیش پسندی کو بھی

---

[1] چہار مقالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۳۰ھ سے پیشتر وفات ہو چکی ہوگی۔

کہا جاسکتا ہے خیام کے زمانے میں خود مختار سلطنتوں کا زور تھا اور لوگوں کی خوشحالی اور پریشان حالی سلاطین وقت کے اشاروں پر تھی حکیمانہ مذاق کا آدمی ایسے وقت میں خوشحالی کے لمحوں کی قدر کریگا اور جو اچھائی اپنے یا دوسروں کے لئے کرلے گا وہی غنیمت ہے۔ اسی امر کی طرف خیام کی ترغیب ہے اور چونکہ واقعی شراب خوار تھا اس وجہ سے اخلاقی قوت یا روحانیت کے رنگ و بو سے اسکے شراب وکباب کو خالی سمجھا جاتا ہے ورنہ نظر انصاف حافظ وغیرہ کو اسی خمخانہ میں بادہ کشی کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔

خیام چاہتا ہے کہ آئندہ کی زندگی پر بھروسا نہ کیا جائے چاہے کتنی ہی دلچسپ نظر آتی ہو۔ حور و قصور کو بھی موجودہ عیش کے مقابلہ میں بے اعتبار سمجھتا ہے۔ بہشت و دوزخ کسی چیز کی پروا نہیں۔ دیکھو کس مستی کے عالم میں اپنا خیال ادا کرتا ہے:۔

مائیم خریدار مے کہنہ و نو[۱] ۔۔۔ وانگاہ فروشندۂ عالم بہ دو جو
گفتی کہ "پس از مرگ کجا خواہی رفت؟" ۔۔۔ "مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رو"

بے خودی کا عالم اور سیہ مستی کی حد دیکھو:۔

من بے مئے ناب زیستن نتوانم ۔۔۔ بے جام کشید۔ بار تن نتوانم
من بندۂ آں دمم کہ ساقی گوید ۔۔۔ "یک جام دگر بگیر و من نتوانم"

شوخی و ظرافت کا انداز بھی عجب دلکش ہے۔ ایران میں رمضان مبارک کے زمانے میں شراب فروشی کی بالکل ممانعت ہے اور رسم ملک یہ ہے کہ شرابخوار اس ماہ میں شراب خواری ترک کر دیتے ہیں۔ خیام کہتا ہے:۔

گویند کہ ماہ روزہ نزدیک رسید ۔۔۔ من بعد بہ گرد بادہ نتواں گردید
بعد از اں شراب کے قریب بھی آنا ممکن نہیں ۱۲
در آخر شعبان بخورم چنداں مے ۔۔۔ کاندر رمضان مست بخفتم تا عید

[۱] جو لذت لے چکی ہے اور جو مل رہی ہے۔ نجم ۱۲

بے ثباتی دنیا کا جب نقشہ کھینچتا ہے تو عبرت ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ایک رند بلانوش[1] موجودات عالم پر ایسی معرفت کی نظر رکھتا ہے:۔

ایں کوزہ چو من عاشق زارے بودست — واندر طلب روئے نگارے بودست
ایں دستہ[2] کہ برگردن او می بینی — دستے است کہ برگردن یارے بودست

مغفرت طلبی کا انداز بھی نرالا ہے۔ اپنے گناہوں کا اقرار اور آمرزش پر باوجود اسکے اصرار کچھ عجیب مزہ دیتا ہے۔ ہر رباعی میں ایک نئی دلیل پیش کرکے اپنے کو مستحق عفو ثابت کرتا ہے مثلاً:۔

ناکردہ گناہ درجہاں کیست بگو — واں کس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی — پس فرق میان من و تو چیست بگو

اس سے زیادہ مضبوط دلیل اور پیش کرتا ہے:۔

من بندۂ عاصیم رضائے تو کجاست — تاریک دلم۔ نور صفائے تو کجاست
مارا تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی — آں بیع بود لطف و عطائے تو کجاست

خیام جبر کا قائل ہے اور سمجھتا ہے کہ اپنے افعال ارادی میں بھی انسان فاعل مختار نہیں ہے:۔

سازندۂ کار مردہ و زندہ توئی — دارندۂ ایں چرخ پراگندہ توئی
من گرچہ بدم صاحب ایں بندہ توئی — کس راچہ گنہ چو آفرینندہ توئی

ہم کہہ آئے ہیں کہ فلسفہ کو حقائق اشیا دریافت کرنے کی کوشش ہے اور کامیاب انسانی زندگی وہی ہے جس میں انسانی آغاز و انجام پر نظر رکھ کے افعال و اعمال کئے جائیں۔ مسرت پرست عیش و عشرت دنیوی سے لذت

---

[1] شاعرانہ مذاق کی بنا پر کہدیا ورنہ حقیقت میں وہ اس رنگ کا آدمی نہ تھا بلکہ حکیمانہ رنگ کی جھلک اس کے ہر رنگ میں تھی [2] ہتھا جو صراحیوں میں لگا ہوتا ہے۔

حاصل کرتے ہیں اور سعادت کے تلاش کرنے والے اُن حقائق سے اپنی زندگی کو مرتبط کرنا چاہتے ہیں جن سے ترقی کائنات وابستہ ہے ہمیں سے معلوم ہوتا ہے کہ خیام کا فلسفہ مسرت پرستی کا نہیں۔ وہ ہوا و ہوس سے دور بھاگتا ہے :-

گر از پے شہوت و ہوا خواہی رفت | از من خبرت کہ بے نوا خواہی رفت

میں تجھے بتائے دیتا ہوں کہ انجام بخیر نہیں ۱۲

بنگر چہ کسی و از کجا آمدۂ ؟ | می دان کہ چہ میکنی ؟ کجا خواہی رفت ؟

لیکن فلسفیانہ جد و جہد کا سرحد حقیقت تک پہونچنا دشوار ہے کیونکہ حق الحقائق کا مقام عالم روحانیت ہے بلکہ شاید اس سے بھی بالاتر۔ آج ایک چیز کو علت العلل سمجھتے ہیں۔ کل اُسکے افق دوسری طاقت نظر آتی ہے۔ اس وقت ایک مسئلہ ایک عنوان سے حل ہوتا ہے۔۔۔ دوسرے وقت وہی عنوان باطل نظر آتا ہے اور مسئلہ اسی حالت ابہام میں آجاتا ہے۔ اسی وجہ سے لاعلمیت کا مسلک کامل فلسفیوں کے لئے منتہائے کمال ہے اور مایوسی کا پیش خیمہ۔ اہل مذہب، اور ارباب معرفت کے یہاں لاعلمی کا مرتبہ اعلیٰ اور اتم ضرور ہے مگر وہاں اطمینان قلب ساتھ ہے اور انکشافات عالیہ کی امید سے وابستہ ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے :-

فلسفی سر حقیقت نتوانست کشود | گشت راز دگر آں راز کہ افشا میکرد

خیام کا کلام کبھی فلسفیانہ رنگ کا ہے۔ کبھی اہل مذہب کے رنگ کا۔ خدا جانے حقیقت کیا تھی ؟

آنہا کہ محیط فضل و آداب شدند | در کشف دقیق شمع اصحاب شدند

رہ زیں شب تاریک نبردند بروں | گفتند فسانۂ و در خواب شدند

جہل ۱۲

۱؎ تیرہ اکی زبان کا اثر ہے کہ وہ عظمت [illegible] پیدا ہو گیا۔

اخلاقی رباعیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قناعت و توکل کی طرف بہت رغبت ہے اور ریاکاری سے بیحد نفرت۔ خیام نہیں چاہتا کہ کوئی ایسا منصب خالصاً لوجہ اللہ بھی قبول کیا جائے جو ریاکاروں کے ہاتھ سے خراب ہو چکا ہو۔ اس سے گمنامی کی موت بہتر:-

در راہ چناں رو کہ سلامت نکنند (ترا سلام) باخلق چناں زی کہ قیامت نکنند
در مسجد اگر روی چناں رو کہ ترا در پیش نخوانند و امامت نکنند (زندگانی کن تعظیم تو) (ترا امام)

ابو اسمٰعیل انصاری — شیخ ابو اسمٰعیل عبداللہ انصاری ہروی کا نام بھی اسی عہد کے کاملوں میں لیا جاتا ہے۔ منازل السائرین اور انوار التحقیق نثر میں اور چند رباعیاں نظم میں یادگار رہیں۔ انکے علاوہ کتاب النصیحت۔ الٰہی نامہ۔ زاد العارفین۔ کتاب الاسرار۔ طبقات صوفیہ اور شمس المجالس (یوسف و زلیخا نثر) بھی انھیں سے منسوب ہیں۔

قطران — حکیم قطران تبریزی کا شمار اس عہد کے نامبرآوردہ شاعروں میں ہے بلکہ دولت شاہ کی رائے ہے کہ امیر معزی اور انوری وغیرہ کے دلکش طرز کا موجد یہی ہے۔ آل بویہ اور آل زیار کا مداح ہے اور امیر عنصر المعالی کیکاؤس بن قابوس کے لئے داستان وامق و عذرا نظم کی ہے۔ صنائع و بدائع کا خاص شوق تھا اور اکثر ذو قافیتین قصائد نظم کئے ہیں مثلاً کہتا ہے:-

تا شمر گشت از صبا پرچین چو پرّہ باز باز (تالاب) باغ بلفروداند روچو لعبت طناز ناز (نام طائر دوبارہ)

لیکن جو اشعار ان تکلفات سے بری ہیں انکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاست و عذوبت میں کسی ہمعصر سے کم کا پایہ نہیں۔

فخر الدین اسعد — فخر الدین اسعد جرجانی کا نام مصنف مثنوی ویس و رامین کی حیثیت سے لیا جاتا ہے اگرچہ دولت شاہ کے نزدیک نظامی سمرقندی اس کا مصنف تھا

اور بعضے **نظامی گنجوی** سے منسوب کرتے ہیں۔ اسکی تصنیف کا زمانہ وہی ہے جب طغرل نے رومیوں پر فتح پائی تھی۔ سلطان محمد بن محمود سلجوقی کے زمانے میں مقرب بارگاہ رہا۔ آخر عمر میں دل شکستگی غالب آگئی۔ بعض اشعار مثنوی کے درج کئے جاتے ہیں۔ رامین ویسہ کے فراق میں بیقرار ہے اور دل کی الجھن الفاظ میں ادا کرتا ہے:۔

ندانستم کز آتش آب خیزد — ز شہد ناب زہر ناب خیزد
بگریہ گہ گہی دل را کنم خوش — ہمیخواہم کشم آتش بہ آتش
جہان کردم ز آب دیدہ پر گل — نمرد از آب چشم آتش دل
منم بے یار و از دردم بسے یار — منم بیکار و از عشقم بسے کار
مرا مادر دعا کردست گوئی — کہ از تو دور بادا ہر چہ جوئی
اگر خوانند آرش[1] را کماں گیر — کہ از آمل بہ مرو انداخت یک تیر
تو اندازی بجان من ز گوراب (نام مقام) — ہمی ہر ساعتے (نام مقام) صد تیر پرتاب

عنصر المعالی

امیر عنصر المعالی کیکاؤس پسر زادۂ قابوس نے ۶۳ برس کی عمر میں **قابوس نامہ** اپنے بیٹے **گیلان شاہ** کے لئے تصنیف کیا۔ دیکھو اس عہد کے سلاطین بھی مصنفوں کے گروہ میں امتیاز پیدا کرتے تھے۔ یہ کتاب مفید مضامین کا مجموعہ ہے اور بیش بہا نصیحتوں کا خزانہ۔ عفو و مکافات۔ لطف زندگانی۔ حسن و عشق۔ تعلیم اطفال۔ آداب وزارت۔ خصائل ملوکانہ وغیرہ کے عنوانات پر اپنے

---

[1] برادر زادۂ طمورث۔ کہتے ہیں کہ حکماء نے کہا کہ تم تیر مارو جہاں تک پہنچے گا اتنی زمین تم کو دونگا۔ حکماء نے تیر کے اندر جوف کرکے پارہ بھر دیا۔ آرش نے آفتاب کی طرف رخ کرکے تیر پھینکا۔ حرارت آفتاب کی وجہ سے آمل سے مرو تک چلا گیا۔ دولت شاہ کہتا ہے کہ چالیس منزل تیر کا چلا جانا خلاف عقل ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ یہ نام دو قریوں کے ہوں جنکے درمیان فاصلہ کم ہو۔

خیالات کا اظہار کیا ہے اور قصص و روایات سے استدلال کر کے کتاب کو دلچسپ بنایا ہے۔ زبان ناصر خسرو وغیرہ سے ملتی جلتی ہے فصیحی اسی امیر کا مداح ہے جسکا کلام کمیاب ہو گیا ہے۔

امام غزالی امام ابو حامد محمد غزالی[1] کے عروج کا زمانہ بھی یہی ہے فلسفہ کی تعلیم نہایت کامیابی کے ساتھ انکی ذات سے جاری ہوئی اور معارف اسلامیہ کا انطباق مسائل حکمیہ سے نہایت خوبی سے ہوا۔ اسی وجہ سے دنیائے اسلام میں انکا لقب حجۃ الاسلام ہے۔ مسقط الراس وہی مردم خیز خطۂ طوس ہے جسے فردوسی ایسے شاعر۔ نظام الملک ایسے وزیر اور نصیر الدین طوسی ایسے محقق کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہے سال ولادت ۴۵۰ھ بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بڑی زحمت اور محنت سے اپنے چھوٹے بھائی امام احمد غزالی کے ساتھ درسیات پڑھے۔ جب فارغ التحصیل ہوئے تو نظام الملک تک رسائی ہوئی (۴۸۴ھ) اور نظامیہ بغداد کے استاد مقرر ہوئے۔ چار برس اس مدرسے میں کام کرنے کے بعد اپنے بھائی کو اپنی جگہ چھوڑ کے حج بیت اللہ کیا اور بیت المقدس کی بھی زیارت کی۔ کہتے ہیں کہ احیاء العلوم زبان عربی میں وہیں تصنیف ہوئی تھی جس نے حقایق و معارف کا عظیم الشان خزانہ ملک و ملت کو عطا کیا۔ فارسی میں کیمیائے سعادت مراجعت کے بعد بغداد میں لکھی۔ یہ بھی حقائق و معارف سے لبریز ہے اور ایسی شیریں اور سلیس زبان میں ہے کہ سمجھنے والے کو کوئی زحمت نہیں ہوتی پھر نظامیہ نیشاپور میں گئے اور تدریس کا کام کرنے لگے۔ تقریباً نو سو کتابیں[1] اور رسالے امام صاحب کے تصنیف کئے ہوئے ہیں جن میں سے بعض فلاسفہ اور باطنیہ کی تردید کے لئے مخصوص ہیں۔

---

[1] تفصیل کمالات کے لئے مولانا شبلی کی الغزالی قابل ملاحظہ ہے [2] مجمع الفصحا۔

اشعار میں بھی کمالات صوری و معنوی کا اثر موجود ہے :۔

گفتم دلا تو چندیں بر خویشتن چہ پیچی | با یک طبیب محرم ایں راز درمیان نہ
گفتا کہ ہم طبیبے فرمودہ است با من | گر مہر یار داری صد مہر بر زبان نہ

ولہ

کس را پس پردۂ قضا راہ نشد | در سرّ قدر ہیچکس آگاہ نشد
ہر کس ز سر قیاس چیزے گفتند | معلوم نگشت و قصّہ کوتاہ نشد

امام احمد غزالی بھی صاحب تصانیف تھے۔ سوانح العشاق میں مراتب عشق بیان کئے ہیں اور کئی مصنفات یادگار چھوڑے ہیں۔ ۵۱۷ھ میں انتقال ہوا۔ شعر گوئی میں رنگ بالکل اپنے بھائی کا ہے۔

ارزقی — ارزقی حکیم زین الدین ابو بکر ہروی کا عروج سلطان طغانشاہ بن مؤید سلجوقی کے عہد میں ہوا۔ پہلے بادشاہ کا ندیم ہوا پھر ملک الشعرائی کے مرتبے پر پہونچا۔ ۵۲۶ھ میں وفات پائی۔ کتاب سندباد اور دیوان قصائد وغیرہ یادگار ہیں۔ اکثر معانی نفیسہ اور مضامین عالیہ اسکے کلام میں ملتے ہیں۔ مثلاً ایک قصیدے کی تشبیب میں نہایت لطف سے ابر کا حال نظم کیا ہے کہ ابتدا اس کی پانی کے بخارات سے ہے جو آسمان کی طرف صعود کرتے ہیں اور انتہا میں قطرات باراں کی صورت میں پھر زمین پر واپس آتے ہیں :۔

چہ جرم است اینکہ ہر ساعت ز مہیج نیلگون دریا | زمیں را سائباں بندد بہ پیش گنبد خضرا
چو در پستی بود باشد ز گامش دور بر بالا | چو در بالا بود باشد ز چشمش اشک در پستی
گہے از گوشۂ گردوں زند و بر دامن دریا | گہے از دامن دریا رود بر گوشۂ گردوں
صفائش را بہ پیوند د بگرد دل برکند غوغا | سیاہش را بر انگیزد بدریا برزند غارت
ازاں غوغا بپوشاند زمین را حلۂ دیبا | ازاں غارت بہ بخشاید ہوا را افسر لولو

دیکھو گریز کیا مزے کی ہے:۔

گہے گوہر برافشاند چوں دستِ شاہ در محفل   گہے آتش برافشاند چو تیغِ شاہ در ہیجا

ایک قصیدے میں طغانشاہ کی فتح سیستان کا حال لکھا ہے۔ میدانِ رزم کے بیان میں ایک پرانا مبالغہ ہے کہ خون کے دریا بہا دیئے۔ اسکی قوت تخیل نے اس مبالغہ میں اضافہ کیا۔ سوار اس خونی میدان میں یوں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جیسے دریا میں کشتی۔ پھر خیال آتا ہے جہاں لاشے ملے راستہ رک گیا سواروں کو آگے بڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہذا یہ لاشے اس کشتی کے لئے لنگر کا کام کرتے ہیں ورنہ کشتی ناقص رہتی۔ اتنے بڑے خیال کو چند لفظوں میں ادا کرتا ہے:۔

زمیں دریائے موج انگن شد از خوں   در او کشتی سوار و کشتہ لنگر

مسعود بن سعد بن سلمان

مسعود بن سعد بن سلمان گورگانی کا عروج و زوال ابراہیم شاہ غزنوی کی ذات سے وابستہ ہے۔ آغاز حال میں بڑی قدر رہی یہاں تک کہ حکومت پنجاب بھی مل گئی۔ انجام میں بدگمانی پیدا ہو گئی کہ ملک شاہ سلجوقی سے مل گیا ہے اور غزنویوں کو خاتمہ کرانا چاہتا ہے۔ قہر سلطانی میں جہاں اور لوگ ماخوذ ہوئے۔ یہ بھی قید کر دیا گیا۔ معذرت میں قصیدے کہے مگر کچھ نہ ہوا آخر ابراہیم شاہ کا انتقال ہوا اور بارہ برس کے بعد رہائی ہوئی۔ مگر چند ہی روز کے بعد پھر سلطانِ وقت کو لوگوں نے بھڑکایا اور بیس برس قید میں کاٹنا پڑے جب دوبارہ آزادی ملی تو سلاطین سے نفرت ہو گئی اور گوشہ عبادت میں زندگی کے دن پورے کر کے ۵۱۵ھ میں انتقال کیا۔ شاعری میں عدیم النظیر تھا اور صاحب مجمع الفصحا کی رائے ہے کہ عنصری رنگ میں بے مثل قصائد نظم کئے ہیں۔ عربی۔ ہندی اور فارسی تینوں زبانوں میں دیوان مرتب کئے مگر اب محض فارسی کا کلام ملتا ہے۔ چند اشعار ایک قصیدہ کے درج کئے جاتے ہیں۔ مضمون وہی پانی کا برسنا ہے اور تخییل کا زور و شور۔

ارزقی کے اشعار سے مقابلہ کرو تو اندازہ ہو جائے گا کہ امیر مسعود کا کلام کتنا شستہ ہے:۔

سپاہِ ابرِ نیسانی ز دریا رفت بر صحرا | نثار لولوے لالا بصحرا برد از دریا
از یں پر مشک شد گیتی وزاں پر دُر ہمہ عالم | از یں پر بوئے شد بستاں وزاں پُر نور شد صحرا
گہے چوں تختہ تختہ سادہ سیم اندر ہوا بر ہم | گہے چوں تودہ تودہ سودہ کافور ست بربالا
فلک در سندس نیلی ہوا در چادر کحلی | زمیں در فرش زنگاری کہ اندر حلۂ حمرا
زمینِ خشک شد سیراب باغِ زرد شد اخضر | ہوائے تیرہ شد روشن جہانِ پیر شد برنا

امیر معزی — امیر معزی محمد بن عبدالملک نیشاپوری کو آلِ سلجوق کے دربار میں وہی بات حاصل تھی جو رودکی کو سامانیوں کے یہاں اور عنصری کو سلطان محمود کی بدولت نصیب ہوئی تھی۔ پہلا قدردان **ملک شاہ** سلجوقی تھا اور دوسرا **معز الدین** سنجر جس نے ملک الشعرائی کا خطاب دیا اور اپنے نام پر تخلص کو منسوب کرنے کی اجازت عطا کی۔ ایک دفعہ سنجر اور امرائے دولت استہلال عید کے لئے باہر آئے۔ سب سے پہلے سنجر کی نظر چاند پر پڑی۔ خوشی سے اُچھل پڑا اور سب کو انگلی کے اشارے سے چاند دکھلایا۔ **معزی** کو حکم دیا کہ ماہ نو کی تعریف کرو۔ فی البدیہہ یہ شعر نظم کئے:۔

اے ماہ چو ابروان یاری گوئی | یا ہمچو کمانِ شہریاری گوئی
نعلے زدہ از زرِ عیاری گوئی | در گوشِ سپہر گوشواری گوئی

آج یہ تشبیہیں پیش پا افتادہ معلوم ہوتی ہیں لیکن جن دماغوں نے پہلے پہل اِن کو پیدا کیا ہو گا اُن کے کمال میں کیا شک ہے۔ بادشاہ نے خاصہ کا گھوڑا اور پانچ ہزار درہم عطا کئے۔ قدردانی نے شاعر کے دل میں اور اُمنگ پیدا کی۔ شکریہ ادا کیا تو صنعت تضاد کا لطف دکھایا اور عناصر اربعہ کو یکجا کر کے پیش کیا:۔

چوں آتشِ خاطرِ مرا شاہ بدید   از خاک مرا برز برِ ماہ کشید
چوں آبِ یکے ترانہ از من بشنید   چوں باد یکے مرکبِ خاصم بخشید

پھر انعام لیا اور رخصت ہوا۔ انھیں قدر دانیوں نے اہل قلم کے دلوں کو بڑھا دیا تھا اور نظم و نثر کو معراج کمال تک پہونچا دیا تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ تیراندازی کر رہا تھا اتفاقاً معزی نشانہ ہو گیا مگر اوچھا سا زخم لگا اور جان بچ گئی۔ شکریہ میں کہا:۔

منت خدائے راکہ بہ تیر خدائگاں   من بندہ بے گنہ نشدم کشتہ رائگاں

آخر ۵۴۲ھ میں انتقال کیا اور حکیم سنائی نے اُس کا مرثیہ کہا۔ صاحب مجمع الفصحا کی رائے ہے کہ غزل میں فرخی کا رنگ ہے اور مدح میں عنصری کا۔ کلام کی پختگی اور تخیل کی رنگینی خصوصیت کے ساتھ اُسکے دیوان میں پائی جاتی ہے۔ ایک قصیدہ کی تشبیب میں بہار کا حال نظم کیا ہے اور ہجرِ معشوق میں اپنی سراسیمگی دکھائی ہے۔ تقابل بھی ہے۔ اور وارفتگی بھی۔ تشبیہیں بھی ہیں اور نازک خیالیاں بھی۔

اگرچہ خرمیِ عالم از بہار بود   ہمیشہ خرمیِ من ز روئے یار بود
سرشکِ ابر گر افزوں بود بوقتِ بہار   سرشکِ من بدلِ ہر یکے ہزار بود

فصل بہار نے اتنا جوش پیدا کر دیا کہ ایک طرف ابر زار زار رو رہا ہے ایک طرف میں۔ فرق اتنا ہے کہ اُس کے ایک ایک قطرۂ اشک کے مقابلے میں ہزار ہزار قطرات اشک میرے رخسارے پر جاری ہیں۔ اور تقابل دیکھو:۔

بخار آب ہمہ دُر فشاں بود ز ہوا   بخارِ عشق ز چشمم عقیق بار بود

اب معشوق کی یاد میں باغوں کی سیر ہے۔ لالہ زار دیکھا تو رو دیا۔ حالانکہ لالہ کوئی چیز نہیں معشوق کی لالہ رخی کی بدولت یہ رنگ نصیب ہوا۔ سرو کو

دیکھا تو دل بھر آیا حالانکہ معشوق اگر کھڑا ہوتا تو نہر کی واقعی زینت ہو جاتی۔ ان خیالات کی تصویر کھینچتا ہے اور سراسیمگی کا مرقع ساتھ ہی ساتھ دکھاتا ہے:۔

به لاله زار شوم پیشِ لاله ناله کنم — اگرچه رنگ رخش رنگ لاله زار بود
(چہرہ معشوق)
بجوئبار شوم پیشِ سرو سجده کنم — اگرچه قامت او سرو جوئبار بود
(معشوق — یعنی نہر کی واقعی زینت)

استعارات کا لطف دیکھو۔ ایجاد کرنے والے کی زبان سے کتنے اچھے معلوم ہوتے ہیں اور نقل کرنے والوں کے لئے کس قدر معمولی:۔

عاشقِ آنم که عنابش ہمی بارد شکر — فتنهٔ آنم که سنجابش ہمی پوشد حجر
خستهٔ آنم که از گل توده دارد بر سمن — بستهٔ آنم که از شب حلقه دارد بر کمر
از شرر ہرگز جدا آتش نخیزد پس چرا — بر رخ او آتش است و چشم من بارد شرر الخ

رشید وطواط

رشید وطواط۔ رشید الدین محمد بن عبد الجلیل الکاتب العمری بلخ میں پیدا ہوا اور خوارزم میں سلطان اتسز خوارزم شاہی کی بدولت عروج پایا۔ دولت شاہ کہتا ہے کہ تیز زبان اور کم جثہ شخص تھا اسی سے وطواط (چمگادڑ یا) کہلاتا ہے۔ اتسز نے جب ملکشاہ سے بغاوت کی اور ہزار اسپ (نام مقام) میں محصور ہوا تو انوری نے یہ رباعی سلجوقیوں کی طرف سے کہی:۔

ای شاه ہمه ملک جہان حسب تراست — وز دولت و اقبال جہان کسب تراست
امروز بیک حمله ہزار اسپ بگیر — فردا خوارزم و صد ہزار اسپ تراست

رشید نے جواب دیا:۔

شاہا که بجامت مئ صافیست نه دُرد — اعدای ترا ز غصه خون باید خورد
گر خصم تو ای شاه بود رستم گرد — یک خر ز ہزار اسپ نتواند بُرد

ملکشاہ کو غصہ آگیا اور قسم کھائی کہ جب قلعہ فتح کروں گا تو رشید کے سات ٹکڑے کر ڈالوں گا۔ آخر جب اتسز ہزیمت کھا کے بھاگا تو رشید پکڑ کے

بادشاہ کے سامنے لایا گیا مگر بدیع الزمان کاتب نے کہا کہ اے بادشاہ وطواط بہت چھوٹی چڑیا ہے۔ اس کے سات ٹکڑے نہ ہوسکیں گے دو ہی ٹکڑے کرائیے۔ بادشاہ ہنس پڑا اور رشید کی خطا کو معاف کردیا۔ جب زمانہ اتسز کے موافق ہوا تو رشید اُسی کے پاس چلا گیا اور وہیں رہا۔ اتسز کا ۵۵۱ھ میں انتقال ہوا تو رشید اُس کے تابوت کے سرہانے کھڑے ہوکے بہت رویا اور یہ شعر پڑھے :۔

شاہا فلک از سیاستت می لرزید   پیش تو بطوع بندگی می ورزید
صاحب نظرے کجاست تا در نگرد   تا آنہمہ سلطنت بدیں می ارزید

اتسز کے بعد بھی رشید زندہ رہا اور ۹۷ برس کی عمر میں ۵۷۸ھ میں انتقال کرگیا۔ حدائق السحر صنائع و بدائع میں اور صد کلمہ علی علیہ السلام کا فارسی ترجمہ علاوہ دیوان شعر کے اس کی یادگار ہیں۔ اپنے زمانے میں مسلم الثبوت اُستاد تھا اور معاصرین کے رنگ میں نظم کرتا تھا۔ طبیعت کا اندازہ اس قصیدے سے ہوجائیگا :۔

زہے فروختہ روئے تو در جہاں آتش   زدہ غم تو مرا در میان جان آتش
نماند ز آتش دل آب چشم و ترسم از انکہ   بجائے آب ز چشم شود روان آتش

ایک قصیدہ لف و نشر میں نہایت اچھا ہے :۔

بہ بزم و عزم و حزم و رزم گوئی عاریت داری
کف از حاتم ہش از رستم تن از بیژن دل از حیدر
بخشم و حلم و عفو و طبع بردار ی اگر خواہی
رگ از خاک و تگ از باد و نم از آب و لف از آذر

ہجو بھی کہتا تھا مگر بیحد رکیک جنھیں نقل کرنا خلافِ تہذیب ہے۔

انوری — انوری۔ حکیم اوحد الدین علی بن اسحٰق ابیوردی[1] خاوری کا عروج سلطان سنجر کے زمانے میں ہوا اور اسی دربار کا شاعر اور مداح ہے۔ اوائلِ زندگی میں منصوریہ طوس وغیرہ میں درسیات ختم کئے اور فلسفہ و نجوم وغیرہ میں دستگاہ کامل پیدا کی۔ کہتے ہیں کہ باوجودِ کمال نہایت عسرت میں بسر کرتا تھا۔ ایک روز ایک شخص کو بڑی شان و شوکت سے گھوڑے پر سوار جاتے ہوئے دیکھا۔ پوچھا کہ یہ کون ہے۔ معلوم ہوا کہ شاعر۔ کہنے لگا کہ افسوس! میں باوجود حکیم ہونے کے تنگدست ہوں اور یہ شخص باوجود اس کم حیثیت پیشہ[2] کے اس ثروت پر فائز ہے۔ خود بھی فنِ شعر کیطرف متوجہ ہوا اور رات بھر میں ایک قصیدہ کہہ کے سلطان سنجر کے دربار میں پڑھا اور تقرّب سلطانی حاصل کیا۔ یہ قصیدہ نہایت زوردار ہے اور مشہور۔ ابتدا یوں ہے:۔

گر دل و دست بحر و کان باشد ۔۔۔ دل و دستِ خدایگان باشد

پروفیسر براؤن اور مولانا شبلی دونوں نے تعجب کیا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے کیوں ایسے قصیدہ غرّا کو ابتدائی شاعری بلکہ ایک رات کی مشق کا نتیجہ سمجھا حالانکہ انوری خود اسی قصیدے میں کہتا ہے:۔

خسروا! بندۂ تو دہ سال است ۔۔۔ کہ ہمی آرزوے آں باشد

کز ندیمانِ مجلس ار نشود ۔۔۔ از مقیمانِ آستاں باشد

---

[1] خراسان کے ایک علاقہ کا نام دشت خاوران ہے۔ ابیورد اسی کا ایک قریہ ہے جہاں انوری پیدا ہوا تھا اور عوفی کا خیال ہے کہ مہنہ میں پیدا ہوا تھا جو ابیورد سے قریب ہے ممکن ہے کہ اس قریہ کے مضافات میں سے ہو چنانچہ لکھتا ہے: "انوری گر بود از مہنہ منعم از شیراز" ۔ ابتدا میں خاوری تخلص تھا کیونکہ دشت خاوران میں اس کا وطن تھا۔

[2] اس زمانے میں شاعری نے پیشہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ امرا کی جھوٹی تعریفیں کر کے انعام حاصل کئے جاتے تھے اور انھیں انعاموں پر معاش ہو گئی تھی۔

دس برس کا امیدوار اور بغیر ایک مصرع نظم کئے بیٹھا رہے۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ ہاں! اتنا ضرور ہے کہ شاعر کی حیثیت سے اہل دنیا کی نظر میں آنا اسی قصیدے سے شروع ہوتا ہے جس کا ہر مصرع پختگی اور برجستگی کی بہترین مثال ہے۔ حبیب السیر میں یہ بھی لکھا ہے کہ امیر معزی دربار سنجری کا ملک الشعرا تھا اور حکم سلطانی یہ تھا کہ کوئی قصیدہ بغیر اس کی سفارش کے پیش نہ ہو تاکہ نااہل لوگ اس تقریب سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ مگر معزی خود کوتاہ نظر تھا۔ حافظہ غضب کا تھا۔ ایک دفعہ سنا اور پورا قصیدہ یاد ہو گیا۔ اس کا بیٹا دو مرتبہ سن کے یاد کر لیتا تھا اور غلام تین مرتبہ سن کے پورا قصیدہ پڑھ دیتا تھا۔ ادھر کوئی شاعر دربار میں گیا اور قصیدہ پڑھا معزی اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ یہ میرا قصیدہ ہے اور پورا سنا دیا۔ بیٹے نے تائید کی کہ یہ تو والد کا ہے مجھے بھی یاد ہے اور سنا دیا۔ غلام نے تائید مزید کی اور سنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ شاعر بیچارہ نکال دیا جاتا تھا۔ انوری نے جب تقرب پایا تو معزی سے ملا اور بے معنی اور بے بحر اشعار سنائے۔ معزی سمجھا کہ کوئی مسخرہ ہے۔ اس کے پیش کرنے میں مضائقہ نہیں اور سنجر کے پاس لے گیا۔ انوری نے مہملات ترک کر کے یہ قصیدہ شروع کیا جس کے اشعار ابھی نقل ہوئے ہیں۔ دو شعر پڑھنے کے بعد معزی سے مخاطب ہو کے کہا کہ اگر یہ قصیدہ آپ کا ہو تو آگے کے اشعار سنا دیجئے۔ اب کیا کرے مجبوراً اعتراف کیا کہ یہ قصیدہ میرا نہیں۔ انوری نے اطمینان سے پورا قصیدہ پڑھا اور کامیاب ہوا۔ سلطان سنجر کے عواطف شاہانہ کا ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ دو مرتبہ خود انوری کے مکان پر عزت افزائی کیلئے گیا مگر جب زوال آتا ہے تو اس کے اسباب بھی عجیب پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ (غالباً ۵۸۱ھ میں) سبعہ سیارہ کا برج میزان میں قران ہوا۔ انوری نے از روئے نجوم پیشین گوئی کی کہ آج رات کو شدید آندھی آئیگی اور مکانات وغیرہ گر جائیں گے۔ تمام شہر میں

تلاطم ہو گیا اور حفاظت کے لئے کوئی تہ خانہ میں چھپا۔ کوئی شہر سے باہر بھاگا۔ اتفاق کی بات کہ اُس رات کو اتنی بھی ہوا نہ چلی کہ میناروں کے چراغ بجھ جاتے بلکہ سال بھر ہوا اتنی کم رہی کہ کھلیان کے کام میں زحمت ہوئی۔ بادشاہ بہت ناراض ہوا اور انوری وہاں سے بھاگ کر بلخ گیا[ل]۔ یہاں سوزنی یا ابوالفتح رونی نے ایک ہجو اہل بلخ کی بہت سخت کہہ کے اسکے نام سے مشہور کر دی۔ وہ لوگ بگڑ گئے اور بد نصیب انوری کو خوب پیٹا اور اوڑھنی اُڑھا کے شہر میں تشہیر کیا۔ قاضی حمیدالدین[ل] وغیرہ نے حمایت کی تو جان بچی چنانچہ قاضی صاحب کی مدح میں کہتا ہے:۔

بمدح و ثنا گر کنم رائے نظمے نہ دشوار گویم نہ آسان فرستم

ولیکن بمدح جناب حمیدی اگر وحی باشد ہراسان فرستم

آخر گردش زمانہ سے تنگ آ کے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ۵۸۵ھ یا ۵۸۷ھ میں انتقال کیا۔

انوری کا شمار شریعت شاعری کے تین پیغمبروں میں سے ہے اور سعدی و فردوسی کا ہم مرتبہ سمجھا گیا ہے اگرچہ یہ درجہ دیکھے حد سے بڑھا دیا گیا کیونکہ (حسب تحقیق مولانا شبلی) اس کی ذات سے کوئی اضافہ قصیدہ گوئی میں نظر نہیں آتا یہ دوسری بات ہے کہ ادیب صابر۔ ارزقی۔ رشید وطواط وغیرہ سے عمدہ کہتا ہے البتہ اسکی شاعری میں معاصرین سے زائد علمی کمالات کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً وہ مشہور قصیدہ جو واقعۂ نامرضیہ بلخ کے متعلق نظم کیا ہے مطلع ہی سے ظاہر کرتا ہے کہ نظم کرنے والا نجوم و فلسفہ و منقولات سب میں کمال رکھتا ہے۔

ل شعرالعجم میں بلخ سے پہلے خوارزم جانے کا حال لکھا ہے اور سلطان احمد فیروز شاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ نقل کیا ہے جس میں سفر کے صعوبات کا نہایت خوبی سے ذکر ہے۔ ل۲ مصنف مقامات حمیدی۔

مطلع یہ ہے :۔

اے مسلماناں فغاں از دورِ چرخِ چنبری	در نفاقِ تیر و کینِ ماہ و قصدِ مشتری

اہل نجوم اجرام سماوی کی حرکت کو واقعات عالم کے لئے موثر سمجھتے ہیں اور انہیں افلاک میں جڑا ہوا خیال کرتے ہیں لہذا ہر سیارہ جب حرکت کرتا نظر آتا ہے تو در حقیقت وہ فلک حرکت کرتا ہے جس میں وہ سیارہ جڑا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے گردشِ فلکی کی شکایتیں کی جاتی ہیں۔ نہ وہ حرکت کرتا نہ سیارہ ایسے مقام پہ آتا جہاں آجانے سے انقلابات و حوادث پیدا ہوتے ہیں۔ پھر خواص سیاروں کا بیان کرتا ہے کہ عطارد منافق ہے یعنے سعد سیارے کے ساتھ جب ہوتا ہے تو خود بھی سعد ہے اور نحس کے ہمراہ نحس۔ مشتری سعد سیارہ ہے لیکن بعض مقامات ایسے بھی آجاتے ہیں جہاں سے اسکا رخ بعض ستاروں کے خلاف پڑتا ہے اور جن کے طالع میں وہ ستارے ہوتے ہیں اُن کے لئے نحس ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حرکت قمر میں بھی راہیں ستاروں کے مقر ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ عطارد دبیر فلک ہے اور اہل انشا کا طالع بحیثیت شاعر یا نثر نگار ہونے کے اس سے متعلق ہے۔ چاند کا تعلق راحت و عیش سے ہے اور مشتری کا عدل و انصاف سے۔ انوری کو یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب تک طالع کا ستارہ اچھے مقام پر تھا تو عطارد بھی فائدہ پہونچاتا تھا اور مشتری و قمر سے بھی منافع ہوتے تھے اور واقعہ بلخ کے زمانے میں طالع کا ستارہ ایسے مخالف مقام پر آگیا کہ مشتری کی نظر دشمنی کی ہو گئی۔ چاند کی حرکت کا راستہ بھی مخالف مراد واقع ہوا اور عطارد بھی اپنی خاصیت نفاق کی وجہ سے نحس ہو گیا۔ یعنے جب زمانہ موافق تھا تو میری شاعری (جس کا تعلق عطارد سے ہے) میرے لئے مفید تھی۔ عدل و انصاف کی کچہریاں بھی (جو مشتری سے علاقہ رکھتی ہیں) میرے موافق تھیں اور عزت و راحت (جنکا تعلق چاند سے ہے)

میرے لئے خوشگوار تھے۔ اب میرا ستارہ گردش میں آگیا اور بلخ کے واقعے میں وہی شاعری میری ذلت اور مصیبت کا باعث ہوئی (کیونکہ نہ میں شاعر اور ہجوگو ہوتا نہ دوسروں کے اشعار مجھ سے منسوب کئے جا سکتے) اور عدل و انصاف کی کچہریوں نے میرے خلاف حکم سنا کے مجھے تشہیر کرایا اور عزت و راحت کے اسباب بھی میرے خلاف ہوئے کسی کو میری عزت پر حسد ہوا کسی کو میرے آرام پر۔ پھر مسلمانوں کو مخاطب کرنا بھی مصلحت سے خالی نہیں۔ کبھی اخوت اسلامی سے اپیل ہے۔ کبھی اثر سے موثر کو ثابت کرکے اُس قوم کو مخاطب کرتا ہے جس کا نجوم پر اعتقاد نہیں۔

اسی طرح ایک قصیدہ میں اُن امور سیاسی اور نظم معاشرت کی طرف اشارہ کیا ہے جو افلاطون وغیرہ کے کتب معتبرہ میں درج ہیں جنہیں تقسیم عمل کا فلسفہ بیان کیا ہے کہ مدینۂ فاضلہ میں ہر پیشہ ور اور صاحب ہنر کی ایک ضرورت ہے اور ایک جگہ ہے کیونکہ بقائے نوع انسانی کے لئے وہ ایک کام کر رہا ہے۔ چمار ہو یا لوہار۔ نجار ہو کہ معمار۔ غرض بادشاہ و وزیر سے لیکے نان پز بلکہ کناس یعنے مہتر تک کی ضرورت انسان کو ہوتی ہے اور سب کے لئے مدینۂ فاضلہ میں امتیازی جگہ ہے مگر شاعر کی کوئی ضرورت نہیں[1] لہذا وہ کسی جگہ اور کسی امتیاز کا مستحق نہیں۔ کہتا ہے:۔

اے برادر بشنوی رمزے زشعر و شاعری تا ز ما مشتے گدا کس را بمردم نشمری

زانکہ از کناس ناکس در ممالک چارہ نیست حاش للہ تا ندانی این سخن را سرسری

(حاشیہ: امرائے قصیدہ گو — مہتر)

---

[1] یہ حالت اُن شاعروں کی ہو سکتی ہے جو محض جھوٹی خوشامدیں اُمرا کی کرتے ہیں ورنہ سچے شاعروں نے جو ہیجان قوموں میں پیدا کر دیئے ہیں اور جس طرح ایک ایک شعر نے مردہ قوتوں کو زندہ کیا ہے اُن کے حالات سے یونان و عرب و عجم وغیرہ کی تاریخیں بھری ہوئی ہیں۔ ایسے شاعر کا وجود اخلاق فاضلہ کے قیام کے لئے نہایت ضروری ہے اور مدینۂ فاضلہ میں اُس کی جگہ امتیاز کے ساتھ ہونی چاہئے۔

کار خالد کی بہ جعفر می‌شود ہرگز تمام — آں یکے جولاہگی داند دگر برزیگری
(کاشتکاری)

آدمی را چوں بود شرطِ کار شرکت است — ناں ز کناسی خوری بہ زاں بود کز شاعری
(محنت تقسیم عمل) (علافخوری)

آں شنیدستی کہ صد کس بباید پیشہ ور — تا تو نادانستہ و بے آگہی نانے خوری

در ازائے آں اگر از تو نباشد یاریے — آں نہ ناں خوردن بود دانی چہ باشد مدبری
(مقابل)

مرد را باید کہ حکمت تیز دامن گیردش — تا شفائے بوعلی خواند نہ زاژ بحتری
(نام کتاب) (نام شاعر)

اس میں شک نہیں کہ اُس زمانے میں شاعری کو پیشہ بنا لیا گیا تھا۔ کسی امیر کے پاس گئے۔ اس کی مدح کی پھر تقاضا کیا کہ انعام دلوایئے۔ اگر ملا تو شکریہ نہ ملا تو ہجو۔ انوری خود کسی امیر سے کہتا ہے :-

سہ بیت ہم بود شاعرانِ طامع را — یکے[1] مدیح[2] و دگر قطعۂ تقاضائی[3]

اگر بداد سوم شکر ورنہ داد ہجا — ازیں سہ چیز دو گفتم دگر چہ فرمائی

یہ سب کچھ سہی مگر اس کا قصیدہ تاریخ نظم میں بہت بلند پایہ رکھتا ہے۔ زبان کو اضافتوں وغیرہ کے ذریعہ سے کسی قدر مختصر کرکے اور ثقیل الفاظ کو دور کرکے شیریں بنا دیا ہے اور یہ شیرینی ظہیر کے علاوہ اور معاصرین میں کمتر نظر آتی ہے۔ پھر صاحب علم ہونے کی وجہ سے قوتِ تخیل کو نہایت زوردار کردیا ہے جس سے بعض مضامین میں ایک خاص حلاوت کے ساتھ جدّت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ مثلاً نوروز کے بعد سے دن بڑھنے لگتا ہے اور رات گھٹنے لگتی ہے یہاں تک کہ ایران و ہندوستان میں دن چودہ گھنٹے سے بھی زیادہ ہوجاتا ہے اور رات دس گھنٹے سے بھی کسی قدر کم ہوجاتی ہے۔ اس حالت کا نقشہ کھینچتا ہے :-

بہ جرم خورشید چو از حوت در آید بہ حمل — اشہب روز کند ادہم شب را ارجل

اشہب سفید گھوڑا ہے ادہم سیاہ اور ارجل وہ گھوڑا ہے جسکے پاؤں کا نچلا حصہ

سفید ہوتا ہے۔ ادہم اور اشہب سے معلوم ہوا کہ رات اور دن برابر ہیں۔ ارجل سے معلوم ہوا کہ رات کا کسی قدر حصہ سفید ہوگیا اور "گشتن" (روشن کرتا ہے) سے معلوم ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ حصہ سفید ہوا ہے ایک وہم سے نہیں۔ پھر اشہب روز کو فاعل قرار دیکے اس سفیدی کردن کا مال قرار دیدیا ہے عرفی ایسا نازک خیال اس پختگی سے قاصر ہے:۔

چہرہ پرداز جہاں رخت کشد چوں بحمل (آفتاب داخل ہوتا ہے)　　شب شود نیم رخ و روز شود مستقبل

دن کو پورے چہرے کی تصویر کہا ہے اور رات کو آدھے چہرے کی جو بجز مبالغہ کے اور کسی صورت میں ہندوستان اور ایران کی حالت نہیں ہوسکتی۔ ورنہ اودواعتبار سے مطلع لطیف تر ہے۔ علاوہ بریں کلام عرب سے اقتباسات لفظی و معنوی کرکے کلام کو مزین کرتا ہے کہیں تلمیحات نفیسہ ملتی ہیں کہیں تلمیحات نادرہ۔ مثلاً کہتا ہے:۔

خصم تو و قاعدۂ ملک اند　　آں شدہ از بدو جہاں مستقیم (ابتدائے آفرینش)

چوں دو بنا بود برافراشتہ　　زاں دو یکے محدث و دیگر قدیم

زلزلہ قہر تو شان کردہ است　　زلزلۃ الساعۃ شیء عظیم

واقعہ نگاری بھی خوب کرتا ہے خصوصاً ایک قصیدہ تو نہایت دردناک کہا ہے جس میں سلطان سنجر[1] کی گرفتاری کے بعد ملک کی بدحالی اور پریشانی کی حالت دکھائی ہے:۔

---

[1] یہ واقعہ نہایت عبرتناک ہے۔ تاتاریوں کا ایک قبیلہ غز نواحی ختلان میں مقیم تھا جنکا تعلق حکومت بلخ سے تھا اور چوبیس ہزار بھیڑیں سلطان سنجر کے باورچی خانہ کے لئے سالانہ بطور خراج دیتا تھا۔ داروغہ باورچی خانہ سے کچھ ان بن ہوگئی اور قماج والی بلخ نے انکی تادیب کے لئے حملہ کیا مگر خود شکست کھا گیا اور بیٹا بھی کام آگیا اس فتح کے بعد غزوں کو خوف سلطانی پیدا ہوا اور معذرت خواہی کے ساتھ ایک لاکھ درہم اور ہزار غلامان ترکی نذر دینے کو تیار ہوگئے مگر امرا دربار سلطانی نے انکے استیصال ہی کی رائے دی۔ غز لوگ عالم ہراس میں اس جوش و خروش سے لڑے کہ سنجر کی فوج ہزیمت پاگئی اور خود گرفتار ہوا اور مرو و نیشاپور وغیرہ میں خون کی ندیاں بہ گئیں۔ جامع مسجد اور مسجد مطرز ایسی عمارتیں جلائی گئیں اور محمد عکاف اور محمد بن یحییٰ سے زاہد و عابد قتل ہوئے۔ عورتیں ساہوئیں بچے ذبح کئے گئے۔ غرض سنہ ۵۴۸ھ سے ۵۵۲ھ تک تمام خراسان اسی تباہی میں رہا۔ آخر سنجر کسی نہ کسی طرح انکی قید سے بھاگ کے باہر آیا مگر موت نے مہلت نہ دی کہ حالت درست کرتا۔

برسمرقند اگر بگذری اے باد سحر — نامۂ اہل خراساں بہ بر خاقاں بر
نامۂ مطلع او رنج تن و آفت جاں — نامۂ مقطع او درد دل و سوز جگر
نامۂ بر رقمش آہ شہیداں پیدا — نامۂ در شکنش خون شہیداں مضمر

حاکم سمرقند محمد بن سلیمان کو مخاطب کرکے کہتا ہے:۔

خبرت ہست کزیں زیر و زبر شوم غزان — نیست یک تن زخراساں کہ نشد زیر و زبر
بر بزرگان زمانہ شدہ خردان سالار — بر کریمان جہان گشتہ لئیماں مہتر
شاد۔ اِلّا بہ در مرگ۔ نہ بینی مردم — بکر۔ جز در شکم مام۔ نیابی دختر
رحم کن رحم بر آن قوم کہ جویند جوین — از پس آنکہ نخوردندے از ناز شکر
(جو کی روٹی)
رحم کن رحم بر آنہا کہ نیابند نمد — از پس آنکہ از اطلس شان بودے بستر

انوری کو جب غصہ آجاتا تھا تو قوت شعرگوئی بھی تیز ہوجاتی تھی اور کسی چیز کی بدی اگر کرتا تھا تو واقعی اس فن کا پیغمبر ہی معلوم ہوتا تھا۔ ہجوگوئی میں اس سے بہتر شاید کوئی نہیں ہوا۔ فحش کے دھبّے دامنِ نظم کو آلودہ کئے رہتے ہیں اسوجہ سے انتخاب دشوار ہے۔

خاقانی **خاقانی**۔ ملک الشعراء حسان العجم افضل الدین ابراہیم بن علی النجار مقام ولادت شروان ہے اور سالِ ولادت ۵۰۰ھ۔ باپ کا پیشہ نجاری تھا اور ماں نسطوری عیسائی تھی جس نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ عالم طفولیت چچا کی تربیت میں گذرا جس کا نام مرزا **کافی بن عثمان** تھا اور طبابت کے ذریعے سے کسبِ معاش کرتا تھا۔ خاقانی نے معقولات و منقولات بہ مشکل ختم کئے تھے کہ چچا کا انتقال ہوگیا اور پچیس سال کی عمر میں **منوچہر شروان** شاہ اخستان کے شعرا میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ یہاں ابوالعلاے گنجوی کا دور دورہ تھا خاقانی نے اسکی شاگردی اختیار کی اور پہلے کا تخلص حقائقی بدل کے خاقانی

اختیار کیا۔ ابوالعلا نے بہت مراعات کی اور اپنی بیٹی کے ساتھ عقد کر دیا۔ دوسرے شاگرد فلکی شروانی کو یہ مراعات ناگوار ہوئی۔ ابوالعلا نے اُسے بیس ہزار روپیہ یعنے پچاس خوبصورت کنیزوں کی قیمت دیکے راضی کیا۔ خاقانی کی رسائی دربارِ خاقان میں بھی ہوگئی اور حکم سلطانی ہوا کہ ہر قصیدہ پہ ہزار اشرفیاں انعام دی جائیں جب عروج و ثروت نے ترقی کی تو اُستاد کا مخالف ہوگیا۔ ابوالعلا کو یہ رفتار ناگوار ہوئی اور کہا۔

توئی افضل الدین اگر راست پرسی ۔۔۔ بجانِ عزیزت، کہ از تو نہ شادم
بخاقانیت من لقب بر نہادم ۔۔۔ ترا دختر و مال و شہرت بدادم
چرا حرمت من نداری تو کز من ۔۔۔ ترا ہم پدر خوانده ہم اوستادم

خاقانی نے اسکے جواب میں ایک رکیک ہجو کہی جو قابل نقل نہیں ہے۔ پروفیسر خانکاف روسی نے اس ہجو کی معذرت میں کہا ہے کہ "بارھویں صدی (عیسوی)، کے ایرانی کا غصہ ہے اور اُسی کی زبان اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یورپ کی زبان میں ایسے ہی گندے الفاظ داخل تھے"۔ شروان شاہ کی نازک مزاجی کیوجہ سے خاقانی کو اپنے عروج پر اطمینان نہ تھا آخر اجازت لے کے حج بیت اللہ کو گیا۔ اس زمانے میں سلطان سنجر کی فیاضی کو سن کے جی چاہا[1] کہ وہاں رسائی پیدا کرے مگر کامیاب نہ ہوا۔ خوارزم شاہیوں سے بھی اسکے تعلقات بعض قصاید سے ظاہر ہوتے ہیں اور وہاں کے ملک الشعرا رشید وطواط کی تعریف میں اشعار بھی کہے ہیں۔ غرض فراغت حج کے بعد اصفہان آیا مگر یہاں اسکی قسمت کچھ

---

[1] یہ ارادہ کئی قصیدوں میں مذکور ہے مثلاً :-

بخراساں شوم انشاء اللہ ۔۔۔ ازرہ آساں شوم انشاء اللہ یا
رہ روم مقصد امکاں بخراسان یابم ۔۔۔ تشنہ ام مشربِ احساں بخراسان یابم

اسی میں اپنی ترقی کی اُمید ظاہر کرتا ہے :-

چوں زمن اہل خراساں ہمہ عنقا بینند ۔۔۔ من سلیمانِ جہانبان بخراسان یابم

انوری کی سی ہو گئی۔ مجیر بیلقانی کی ہجو اصفہان اسکے نام پر شہرت پا گئی اور جمال الدین عبدالرزّاق اصفہانی نے اُس کا جواب کہا۔ آخر خاقانی کو براءت ظاہر کرنی پڑی اور ایک قصیدہ تعریف اصفہان میں کہا :۔

نکہتِ حور است یا ہوائے صفاہاں — جبہتِ جوزاست یا لقائے صفاہاں

دیدۂ خورشید چشم درد ہمیداشت — از حسدِ خاکِ سرمہ زائے صفاہاں[۱]

لاجرم اینک برائے دیدۂ خورشید — دستِ مسیح است سرمہ سائے صفاہاں

صدر خجند اور جمال الدین کی تعریف میں کہتا ہے :۔

مدحِ دو فاروقِ دیں چگونہ کنم من — صدر و جمال اند مقتدائے صفاہاں

مصائب کا حال بھی لطف سے خالی نہیں :۔

داد صفاہاں زابتدام کدورت — گرچہ صفا باشد ابتدائے صفاہاں

سیبِ صفاہاں الف فزود راوّل[۲] — تا خورم آسیبِ جانگزائے صفاہاں

گرچہ صفاہاں جزائے من بہ بدی کرد — ہم بہ نکوئی کنم جزائے صفاہاں الخ

آخر شروان واپس آیا مگر بدنصیبی بھی ساتھ آئی۔ خاقان منوچہر سے کسی نے کہدیا کہ اب یہ دوسرا مربی ڈھونڈھ رہا ہے۔ بادشاہ نے غصہ میں آکے قید[۳] کر دیا۔ مدتوں

---

[۱] اصفہان کا سرمہ مشہور ہے جیسے ہمارے ممالک میں بریلی کا۔ [۲] اصفہان کا سیب بھی مشہور ہے۔

[۳] شعر العجم جلد پنجم میں اصلی وجہ بعد تحقیق یہ لکھی ہے ملک لوزر اخواجہ جمیل الدین موصلی نے خاقانی کو ایک انگوٹھی دی تھی جس پر اسم اعظم کندہ تھا اور عہد لیا تھا کہ یہ انگوٹھی کسی کو نہ دینا چنانچہ خود خاقانی تحفۃ العراقین میں کہتا ہے :۔

ایں مہرہ شناس تشرۂ ہوش — وقف ابدی است بر تو مفروش

برگوشۂ او بہ رغمِ اغیار — لا یُوھَبُ لا یُبَاعُ بنگار

شروانشاہ نے یہ انگوٹھی طلب کی مگر اُس نے دینے سے انکار کیا اسی گستاخی اور نافرمانی کی پاداش میں قید ہوا۔ اور بعض تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قید کا واقعہ حج بیت اللہ کے اثنائے سفر میں واقع ہوا کیونکہ خاقانی بادشاہ سے چھپ کے بھاگا تھا مگر بیلقان میں گرفتار کر لیا گیا اور واپس لایا گیا

سے بعد رہائی ہوئی تو دنیا کو ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ قصائد سے معلوم ہوتا ہے کہ منوچہر کے بعد بھی زندہ رہا اور زوجہ اور پسر دہ سالہ رشید کا بھی ساتھ ہی انتقال ہوا۔ غرض اسی زاویہ نشینی کی زندگی ختم کر کے ۵۹۵ھ (بروایت حبیب السیر) میں انتقال کیا اور مقبرۃ الشعرائے سرخاب میں قبر بنی۔ ملا جامی نے خاقانی کو اولیائے کرام میں شمار کیا ہے جسکی وجہ یہی آخری زمانہ زندگی کا ہو سکتا ہے۔

شاعری میں صاحب آتشکدہ انھیں طرز خاص کا موجد سمجھتے ہیں اور بعض شعرا نے یوں مدح کی ہے:۔

زدیوان ازل منشور کافی در میان آمد   اسیری جملہ را دادند و سلطانی بہ خاقانی
برائے حجت معنی براہیمے پدید آمد   ز پشت [تقلید] آذری صنعت علی [ایجاد] نجار شروانی

کلیات خاقانی نہایت ضخیم [نام خاقانی] ہے۔ بیشتر قصائد کے ہیں مگر غزلیں اور قطعات وغیرہ بھی موجود ہیں اور ایک مثنوی تحفۃ العراقین ہے جسے زمانہ قید میں نظم کیا ہے۔ قصیدہ کی زبان وہی معاصرین کی ہے۔ شیرینی میں انوری و ظہیر سے کم ہے اور جزالت الفاظ میں بہت بلند۔ مقامات صوفیہ و مصطلحات حکمیہ و تلمیحات تاریخیہ کا بیش بہا خزانہ چھوڑا ہے اگرچہ انمیں سے بعض غیر مانوس ہوتی ہیں اور لطف کلام پر اثر ڈالتی ہیں تشبیہات بھی نادر ہیں مگر پرانے ڈھنگ کی۔ ایک قصیدہ قیصر روم کے پاس بھیجنا چاہا تھا کہ قید سے رہائی پائے اسکی تشبیب میں تمام مصطلحات عیسائی مذہب کے ہیں۔ نمونہ کے طور پر بعض اشعار نقل کئے جاتے ہیں:۔

فلک کجرو تر است از خط ترسا   مرا دارد مسلسل راہب آسا
نہ روح اللہ برین دیر است چون شد   چنین دجال فعل این دیر مینا
تنم چون رشتۂ [مقابل این] مریم دوتا است [ہست]   دلم چون سوزن [آسمان] عیسی است یکتا
من اینجا پای بند رشتہ ماندم   چو عیسی پای بند سوزن آنجا

چو یوسف نیست کز قحطم رہاند | چہ بن یامین مراد چہ یہودا
دہ انجازیاں اینک کشادہ | حریم رومیاں آنک مہیا
زروم ناقوس بوسم زیں تحکم | شوم زنار بندم زیں تعدا
دبیرستاں نہم در ہیکل روم | کنم آئین مطراں را مطرا

معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی ہونے کو تیار ہے۔ مگر نہیں قیصر کی خدمت کا شوق ہے۔ آگے کہتا ہے:۔

دگر قیصر سگالد راز زردشت | کنم زندہ رسوم زند واستا
بگویم کاں چہ زندست وچہ آتش | کز دپاژند و ز ند آمد مسمّا

پھر توبہ کرتا ہے

بس اے خاقانی از سودائے فاسد | کہ شیطاں میکند تلقین سودا

اسی قصیدے سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ خاقانی کا کمال زیادہ تر تلمیحات پر منحصر ہے۔ سارا کلیات دیکھ جاؤ تشبیہ۔ استعارہ تخئیل۔ بیشتر اسی رنگ کی تلمیحات میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ خاقانی کا معرکہ آرا قصیدہ حقائق تصوف میں بھی اسی رنگ کا ہے۔ جب تک مصطلحات علمیہ و معارف تصوف وغیرہ کا علم نہ ہو سمجھنا مشکل ہے مثلاً کہتا ہے:۔

کسے کیں خضر معنی راست دامنگیر چوں موسیٰ
کفِ موسیٰ و آبِ خضر بینی در گریبانش
ہمہ تلقینش آیاتے کہ خاموشیست تاویلش
ہمہ تعلیمش اشکالے کہ نادانیست برہانش

بعض مقامات خوب کہے ہیں :-

چناں در بوتۂ تلقیں مرا بگداخت کاندر من
نہ شیطاں ماند وسواسش نہ آدم ماند عصیانش

+ + + + +

+ + + + +

زہے تحصیل دانائی کہ سوے خود شدم ناداں
کہ استاد دانا بود چوں من کرد نادانش

چو طوطی کائنہ بیند شناس خود نیفتد سپے
زخود در خود شود حیراں کند حیرت سخن دانش

مشکل یہ ہے کہ خاقانی کے اشعار کی تشریح کی ضرورت ہے اور یہ کتاب مختصر اُن تفاصیل کو برداشت نہیں کر سکتی ورنہ اُس کا مبلغ علم ناظرین کو معلوم ہوتا۔ ہاں اتنا ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ اس طرز کا خود ہی موجد تھا اور اپنے ہی اوپر ختم کر گیا۔ کسی سے اس کی تقلید بھی نہیں کیونکہ جن باتوں کا اس نے التزام کیا ہے یا کرتا ہے ان کو قائم رکھکے ایک ہی زور میں کئی کئی سو شعر کے قصیدے کہتا ہے اور نباہ لے جاتا ہے۔ خصوصاً مشکل ردیف اور قافیئے پر اتنی حکومت ہے کہ اسکے آگے بالکل پانی ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ سہی مگر شیرینی نہ ہونے کی وجہ سے مُلّائیت کا غلبہ اور شاعریت کا اضمحلال ہے۔ البتہ جہاں کہیں ان جھگڑوں سے پاک ہو کے کہتا ہے۔ بات ہی اور ہو جاتی ہے۔ شراب کی تعریف میں سنو :-

مے آفتابِ زرفشاں۔ جامِ بلورش آسماں
مشرق کفِ ساقیش داں مغرب لبِ یار آمدہ

غزلوں میں بھی وہی علمی رنگ غالب ہے کیونکہ اس زمانے تک غزلوں کی

قصیدے کی تشبیب سے زیادہ حیثیت نہ تھی ایسے صاف شعر شاذونادر ہیں:۔

خاقانی را دگر شب آمد　　ہمسایہ شنید نالہ ام گفت

ہجو اور فخریات میں حد سے زیادہ تجاوز کر جاتا ہے اور بعض اشعار تو ایسے کہہ دیئے ہیں جن کے نقل کرنے سے روحِ ایمانی کو اذیت ہوتی ہے۔

مثنوی کی حالت بھی قصائد سے ملتی جلتی ہے اور اُسی رنگ کا پورا اثر اس پر بھی موجود ہے۔ علیحدہ تنقید کی ضرورت نہیں۔

ظہیر فاریابی۔ ملک الکلام صدر الحکما ظہیر الدین محمد بن طاہر بن محمدؒ۔ رشیدی سمرقندی کا شاگرد ہے اور ترکستان کے ایک قریہ فاریاب کا رہنے والا۔ وطن چھوڑ کے بعد تکمیل علم نیشاپور آیا اور طغانشاہ بن مؤید کی مدح سرائی کی۔ پھر مازندران گیا اور حسام الدولہ اردشیر بن حسن اسپہبد مازندران کا مداح ہوا۔ اصفہان میں قسمت آزمائی کے لئے گیا تو صدر خجند سے نہ بنی۔ آخر آذربائیجان میں آ کے جہاں پہلوان محمد بن یلدگز کے دربار کا شاعر ہوا اور اُس کی وفات کے بعد قزل ارسلاں کی مداحی کرتا رہا پھر نصرۃ الدین ابوبکر بن محمد بن یلدگز کا مدح سرا ہوا۔ ایک قصیدہ سلجوقیوں کے آخری بادشاہ طغرل کی تعریف میں بھی نظم کیا ہے جس سے وہاں کا تعلق بھی معلوم ہوتا ہے۔ آخر میں تارک الدنیا ہو گیا یہانتک کہ ۵۹۸ھ میں وفات پائی اور تبریز کے مقبرۃ الشعراء سرخاب میں دفن ہوا۔ خاقانی کے برابر اسکی بھی قبر دیکھی گئی ہے۔

ظہیر کی شاعری پر نقادان سخن کی رائیں ہمیشہ معرض بحث میں رہیں۔ کوئی لکھتا ہے:۔

در مکہ بدزد اگر بیابی　　دیوان ظہیر فاریابی[۱]

---

[۱] مجمع الفصحا میں لکھا ہے کہ یہ شعر ظہیر کی تعریف میں نہیں کہا گیا بلکہ ملا جامی کی ہجو میں ایک شخص نے یہ اشعار کہے ہیں۔

اے باد صبا بگو بہ جامی + آں دزدِ سخنوران نامی + بردی اشعار کہنہ و نو + از سعدی و انوری و خسرو
اکنوں کہ سر حجاز داری + دا ہنگ حجاز ساز داری + دیوان ظہیر فاریابی + در مکہ بدزد اگر بیابی

مگر صاحب مجمع الفصحا کا یہ خیال صحیح نہیں ممکن ہے کہ شاعر نے اس مشہور شعر کی تضمین کر دی ہو یا خود ہی کہا ہو۔ بہرحال ظہیر کی بزرگی کا اقرار ضرور ہے۔

مجدلہ ہمکر انوری کو ظہیر پر ترجیح دیتا ہے مگر ظہیر کی عظمت کا بھی مقر ہے۔

شعر یکے بر آمدہ چوں دُرِّ شاہوار ‍ ‍ ‍ نظم دگر بر آمدہ چوں مہر خاوری

شعر ظہیر اگرچہ بر آمد ز جنس شعر ‍ ‍ ‍ برتر ز انوری نہ ز لافِ شاعری

امامی ہروی دونوں کو یوں سراہتا ہے (ضمیر قریب انوری کے لئے ہے بعید ظہیر فاریابی کے لئے):-

ایں معجزست واں سحر ـ آں شمع و ایں چراغ

ایں ماہ و آں ستارہ ‍ ‍ ‍ ایں حور و آں پری

دولت شاہ کہتا ہے "افاضل و اکابر متفق اند کہ سخن ظہیر نازک تر د باطراوت تر از سخن انوری ست"۔ حقیقت یہ ہے کہ نقادانِ سخن نے اس معاملے میں بہت افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ نہ انوری پیغمبرِ سخن ہے نہ ظہیر بالکل بے حقیقت۔ اگر انوری نے متانت و جزالت کے ساتھ ساتھ بلند مضامین پیش کئے تو ظہیر نے بھی شوخیِ بیان اور شیرینیِ ادا کو کمال پر پہونچا کے مضمون آفرینی کی۔ ان دونوں شاعروں کے پہلے قصیدہ گوئی میں الفاظ کی صنعت گری پر زیادہ زور دیا جاتا تھا یہاں تک کہ امیر معزی اور عبدالواسع جبلی وغیرہ بھی انھیں جھگڑوں میں پھنسے رہتے تھے۔ کبھی ہم وزن الفاظ کا التزام تھا۔ کبھی مرادفِ الفاظ کی بھرمار تھی۔ ان دونوں نے معنویتِ نظم کو ان بدمزہ التزامات سے پاک کیا اور آورد سے بچا کے زبانِ شعر میں روانی اور آمد پیدا کی بلکہ ظہیر اس معاملہ خاص میں انوری سے بھی بہتر ہے۔ اگر مضمون کی بلندی یہ چاہتی ہے کہ زبان میں بھی دقت پیدا ہو جائے تو وہ غالب آجاتا ہے۔ مضمون کے بعض اجزا

لہ مجد ہمکر کی تنقیدی نظر نے امامی کو سعدی سے بڑھا دیا ہے چنانچہ شیخ صاحب نے ناراض ہو کے کہا۔

ہمکر کہ بعمر خود نکردست نماز ‍ ‍ ‍ شک نیست کہ ہرگز بامامی نرسد

ترک کر کے اتنا ہی نظم کرتا ہے جتنا سلاست زبان کو باقی رکھ سکے۔ یہ امر ذرا نازک ہے۔ مزید توضیح کے لئے ہم ایک مثال دیتے ہیں۔ ارباب حال کا اعتقاد ہے کہ فنا ہونے سے بقا ملتی ہے۔ اسی مسئلہ کو ایک شاعر (وحدت تخلص) دو طرح حل کرتا ہے۔ ایک ریاضی کے قاعدے سے جس میں یہ مانا گیا ہے کہ منفی کو اگر منفی سے ضرب دیں تو مثبت ہو جاتا ہے اور علم معانی نے بھی زبان میں یہی کلیہ جاری کیا ہے کہ نفی پر اگر نفی لگائی جائے تو اثبات ہے۔ لہذا چونکہ یہ دنیا فانی ہے اور ہم بھی فانی ہیں اگر فانی پر فنا طاری ہوگی تو نتیجہ بقا ہو جائے گا۔ دوسری شاعرانہ تمثیل پر نظر ہے یعنے موجودات خارجیہ سے بذریعہ حسن تعلیل اپنا مدعا ثابت کرنا مثلاً شمع کی حالت ہے کہ جب تک اس بزم فانی میں روشن یعنے زندہ ہے فنا ہو رہی ہے اور جب وہ مردہ ہو جاتی ہے یعنے بجھا دی جاتی ہے تو باقی رہتی ہے۔ شاعر حقیقت و مجاز دونوں کا لحاظ کر کے کہتا ہے:۔

نفی نفی اثبات است از مردن نمی ترسم
بقائے من چو شمع کشتہ باشد در فنائے من

انیس کا مذاق سلیم اس کلیہ کو جانتا ہے مگر اتنا وزنی سمجھتا ہے کہ اردو زبان کی نزاکت اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی لہذا شاعرانہ تمثیل مصرعہ دوم میں باقی رکھتا ہے اور حقیقت کا صرف نتیجہ خوشگوار الفاظ میں ادا کرتا ہے تاکہ اہل علم کی نظر ان مسائل پر پہونچ جائے اور معمولی استعداد کے لوگ بھی گھبرا نہ جائیں۔ کہتا ہے:۔

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے
شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

ظہیر کا مذاق انیس سے ملتا جلتا ہے۔ چاہتا ہے کہ ممدوح کو یوسف علیہ السلام پر ترجیح دے اور ان کی پوری لائف پر نظر ڈالتا ہے۔ ابتدا میں شمس و قمر اور گیارہ ستاروں کا خواب میں سجدہ کرتے ہوئے دیکھنا۔ پھر مصائب شدیدہ مدت تک برداشت کر کے سلطنت پانا اور مصر کا ان کے لئے مسخر ہونا۔ غرض یہ نکالتا ہے

کہ ممدوح کی حکومت زمانہ پر ہے (یعنے واقعات عالم کو اپنی مرضی کے موافق چلاتا ہے) اور زمانہ گردش فلک کا نام ہے جس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں۔ لہذا یہ سب مطیع ممدوح ہیں دیکھو کتنے شیریں الفاظ میں کہتا ہے:۔

ستارہ سجدہ کند طلعت منیر ترا　　زمانہ بوسہ دہد پایۂ سریر ترا

وہاں خواب تھا۔ یہاں ادّعاے حقیقت ہے۔ پھر طلعت منیر کہکے حسن کی طرف اشارہ کر دیا جسکے ساتھ "یوسف" کا خیال آجانا لازم ہے۔ جیسے سخاوت کے ساتھ حاتم کا خیال آجاتا ہے۔ اور "منیر" کے معنے ہیں روشن کرنے والا۔ ابہام یہ ہے کہ شاید ستارہ اس وجہ سے سجدہ کر رہا ہے کہ ممدوح کا حسن روشنی بخشنے والا ہے۔ غرض عجیب لطف ہے جو بیان سے باہر ہے۔ مشکل ردیفیں ہوں یا آسان۔ زبان کا بادشاہ سب کو پانی کر دیتا ہے۔ ذرا چند شعر دیکھو:۔

تراست لعل شکر بار در میان گوہر (لب شیریں) (دندان)　　میانِ لعل چرا کردۂ نہان گوہر
بخندہ چون لب یاقوت رنگ بکشائی　　ز شرم زرد شود ہمچو زعفران گوہر
اگرچہ سیم و زرم نیست ہست گوہر نفس　　کہ نزد عقل بہ از صد ہزار کان گوہر
سزد کہ ننگ نیاید ترا ز صحبت من　　چرا کہ ننگ ندارد ز ریسمان گوہر

یہ ردیف اور یہ روانی پھر فی البدیہہ طویل قصیدہ کہدینا کمال شاعری نھیں تو کیا ہے؟۔

دوسری بات ظہیر کے کلام میں یہ ہے کہ اسکے قصائد سرے سے اخیر تک یکساں ہوتے ہیں۔ انوری کے یہاں ظہیر کی سی ہمواری نہیں ہے۔ اگر بلند شعر ہے تو ظہیر کی رسائی وہاں تک دشوار اگر پست تو بالکل ہی پست تیسری خصوصیت اسکے کلام کی یہ ہے کہ تخییل میں متاخرین کے لئے مشاہ راہ کھول گیا ہے۔ ممکن ہے کہ انوری کے یہاں بھی یہ بات ہو مگر زبان اور عنوان ادا

میں ظہیر کی متاخرین سے مشابہت ثابت کرنی ہے کہ اسکی تقلید کی گئی ہے :-

اندیشۂ کہ گم شود از لطف در ضمیر　　　گردوں بہ راز با کمرت درمیاں نہاد

یعنے معشوق کی کمر ایک ایسا لطیف خیال ہے کہ ضمیر میں چھپ جاتا ہے۔ آسمان نے یہ خیال بطورِ راز کمر کے سپرد کردیا کہ کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ پھر "درمیان نہاد" کا لطف کس طرح بیان ہو۔ چوتھی بات یہ ہے کہ تشبیہات اور استعارات میں بھی لطافت ادا سے تازگی پیدا کرتا ہے۔ انوری کے شعر ماہِ نو کی تشبیہات میں یہ ہیں :-

دیدم اندر سواد طرۂ شب　　　گوشوارِ فلک زگوشۂ بام

ماہ نو

گفتم آن نعلِ خنگ دستورست　　　قرۃ العین و فخر آلِ نظام

گھوڑا　وزیر

اگرچہ یہی تشبیہ اور گریز منطقی رازی کے یہاں پہلے نظم ہو چکی تھی (دیکھو شعر العجم جلد اول) ایک اور مقام پر کہتا ہے :-

مہِ گردوں مگر بیمار گشتہ　　　کہ نالید و تنش بگرفت نقصاں

بساں گوی سیمیں بود اکنوں　　　برآمد بر فلک چوں نوک چوگاں

تو گفتی خنگ صاحب تاختن کرد　　　فگند ایں نعل زریں در بیاباں

امیر معزی کی رباعی انھیں تشبیہات ماہ نو کے متعلق ابھی درج ہو چکی ہے۔

اب ذرا ظہیر کا قصیدہ پڑھو :-

چوں بر فلک طلیعۂ شب آشکار　　　آفاق ساخت کسوتِ عباسیان شعار

لباس سیاہ

طلایہ

پیدا شد از کرانۂ میدانِ آسماں　　　شکلِ ہلال چوں سرِ چوگان شہریار

دیدم ز زرِّ پختہ بدین لوحِ لاجورد　　　نونے کہ آں بہ خطِ خفی کردہ شد نگار

روے فلک چو لجّۂ دریا و ماہِ نو　　　مانند کشتئے کہ ز دریا کند گذار

یا بر مثالِ ماہیِ یونس میانِ آب　　　آہنگِ در بہ کشیدنِ او کردہ از کنار

یا ہمچو یونس آمدہ بیروں ز بطن حوت ‏— افتادہ بر کنارۂ دریا نحیف و زار
در معرض خلاف جہانے ز مرد و زن ‏— قومیش در نظارہ و خلقے در انتظار
من با خرد بحجرۂ خلوت شتافتم ‏— گفتم کہ اے نتیجۂ الطاف کردگار
باز ایں چہ نقش بوالعجب و شکل نادر است ‏— کز کارگاہ غیب ہمی گردد آشکار؟
آن شاہد از کجاست کہ ایں چرخ شوخ چشم ‏— از گوش او بروں کشد ایں نغز گوشوار؟
گردون ز بازوے کہ در دست ایں طراز؟ ‏— گیتی ز ساعد کہ ربود ست ایں سوار؟
گر جرم کوکب است چرا شد چنیں دوتاہ؟ ‏— در پیکر مہ است چرا شد چنیں نزار؟
گفت آنچہ بر شمردی ازیں جملہ ہیچ نیست ‏— دانی کہ چیست یا تو بگویم بہ اختصار
نعل سمند شاہ جہان است کآسمان ‏— ہر ماہ بر سرش نہد از بہر افتخار

دیکھو! جو پرانی تشبیہیں ہیں اُن کو نیا لباس محض حُسن ادا سے پہنا دیا ہے اور جو نئی ہیں وہ تو اپنے لئے مخصوص کر لے گیا ہے۔ ہر شعر کی لطافت بیان کرنے کے لئے تفصیل چاہیئے مگر کتاب مختصر ہے۔ اتنی گنجائش کہاں سے آئے؟

غزل گوئی کے متعلق اتنا کہنا ضروری ہے کہ ایسا نازک خیال اور شیریں زبان اس صنف شعر کے لئے نہایت موزوں ہے مگر غزلیات ملتے نہیں اور جو غزلیں قصائد کے بعد کلیات مطبوعۂ منشی نولکشور لکھنؤ میں طبع ہوئی ہیں وہ اُسکی ہیں نہیں۔ کوئی دوسرا شاعر ظہیر تخلص ہے جس نے بعض مقامات پر صائب کی شاگردی کا اقرار کیا ہے۔ لہذا اس صنف پر تنقید نہیں کی جاتی ہے۔

اب قصیدہ گویوں کا حال ختم کیا جاتا ہے (اگرچہ حسن غزنوی، ادیب صابر، سوزنی، مجیر بیلقانی، فلکی وغیرہ وغیرہ بکثرت شعرا ہیں جنکے حالات پر نظر رکھنا فن تاریخ و تنقید کے طالب کے لئے ضروری ہے) اور نظامی گنجوی کا حال لکھا جاتا ہے جس کا سکندر نامہ مُحیّر العقول ثابت ہوا ہے اور پروفیسراؤں کی

نظر میں تو شاہنامہ سے بہتر ہے۔

نظامی گنجوی نظامی گنجوی۔ ابو محمد نظام الدین الیاس بن یوسف زکی المویدالقمی[1]
ماں باپ کا سایہ بچپن ہی میں اُٹھ گیا۔ ماموں نے پرورش کی مگر وہ بھی نہ بچے۔
درسیات سے فارغ ہو کے شاعری کی طرف توجہ کی اور ایسا کمال پیدا کیا کہ
سلاطین کو اُنسے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور اکثر بادشاہوں نے اُنکے تصانیف
اپنے نام پر معنون کرائے۔ پہلی تصنیف مثنوی مخزن اسرار ہے جو ۲۶ برس کی عمر
میں نظم کر کے (۵۵۹ھ) بہرام شاہ کو نذر کی اور پانچ ہزار اشرفیاں۔ ایک قطار
اونٹوں کی اور بیش قیمت کپڑے انعام میں پائے۔ مثنوی شیریں و خسرو
قزل ارسلان کے لئے نظم کی اور ۵۸۴ھ میں لیلی و مجنوں خاقان کبیر
منوچہر بن اختستان کو نذر دی۔ پھر ہفت پیکر کو نظم کیا اور آخر میں سکندر نامہ
ابوبکر نصرۃ الدین محمد کے نام پر ۶۰۳ھ میں لکھا۔ اسکے بعد زندگی نے وفا نہ کی
اور غالباً ۶۰۶ھ میں رہگرائے ملک بقا ہوئے۔

ان پانچ مثنویوں کے علاوہ جو خمسۂ نظامی کہلاتی ہیں قصائد اور قطعات
و غزلیات بھی نظم کئے تھے جنکے اقتباسات تذکروں میں ملتے ہیں۔ غزل کی ابتدائی
داغ بیل ڈالنے والوں میں نظامی کا نام لینا چاہئے اگرچہ غزلیں سکندر نامہ کے
مصنف کی حیثیت سے بیحد پست ہیں۔ البتہ سادگی اور سلاست ضرور ہے:۔

پیش تو کردہ ام عیاں حال تباہ خویش را ... تا تو نصیحتے کنی چشم سیاہ خویش را
سر زنشم مکن کہ تو شیفتہ تر ز من شوی ... گر نگری در آئنہ روئے چو ماہ خویش را

---

[1] مولانا شبلی نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ اصل وطن (مضافاتِ قم سے) تفرش ہے۔ باپ وطن چھوڑ کے گنجہ آئے اور نظامی یہیں پیدا ہوئے اسوجہ سے گنجوی کہلائے۔ خود سکندر نامہ میں کہتے ہیں:۔ ع چو در گرچہ در بحر گنجہ گمم + و لے از قہستانِ شہر قمم۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اصلاً کرد تھے۔

کہیں کہیں شوخی بھی کر جاتے ہیں :-

بوسہ میخواہم ازاں لب تو چہ میفرمائی گر صواب است بگو۔ ورنہ خطائے بکنم

فقر و سلوک کا رنگ مزاج میں غالب آگیا تھا بلکہ ابوالفرج زنجانی کے مرید بھی ہو گئے تھے اسلئے کہیں کہیں غزلوں میں یہ رنگ بھی نظر آتا ہے اور لطافت کے ساتھ :-

شبے تیرہ است و رہ مشکل جنیبت را عناں درکش

زمانے رخت ہستی را بخلوتگاہ جاں درکش

روحانیت

طریقش بے قدم می رَو جمالش بے بصر می بین

راہ عشق الٰہی اچت رہ ۱۲ دیکھا کر

کلامش بے زباں میخواں شرابش بے دہاں درکش

پڑھا کر

یہ بھی کیا خوب کہا ہے :-

عشق زحمت بر نتابد کاشنائے خلوتست

چوں تو با عشق آشنائی از ہمہ بیگانہ شو

قصائد میں سنائی کا رنگ غالب ہے بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ نظامی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس صنف سے امراکی مدح سرائی کے بدنما داغ کو مٹا دیا اور عالم شعر میں ایک مثال قائم کر دی کہ اس سے بہت مفید کام لئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ انکے قصائد موعظ و نصائح نہایت عمدہ نظم ہوئے ہیں اور بعض قطعات تو اس رنگ میں لاجواب ہیں۔ ذیل میں ایک قطعہ درج کیا جاتا ہے جسکے متعلق مولانا شبلی کا دعویٰ ہے کہ اس کا جواب آج تک نہ ہو سکا"

دوش رفتم بخرابات و مرا راہ نبود ۔۔۔ میزدم نالہ و فریاد و کس از من نشنود

یا نہ بُد ہیچکس از بادہ فروشاں بیدار ۔۔۔ یا کہ من ہیچکس ام ہیچ کسم در نکشود

بے حقیقت ۔۔۔ اسلئے امیر کیلئے کسی نے دروازہ کھولا

پاسے از شب بگذشت بیشتر [۱] یا کمتر ۔۔۔ رندے از غرفہ بروں کرد سر و رخ بنمود

[۱] ایسے حرف موقوف کو تقطیع میں ساقط کرنا اس زمانے میں رائج تھا۔

گفت خیرست اودریں وقت کرامیخواہی؟ بے محل آمدنت بردریا بہر چہ بود؟
گفتمش "دربکشا" گفت "برو! ہرزہ مگو! کاندریں وقت کسے بہر کسے درنکشود
ایں نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند کہ تو دیر آئی و اندر صف پیش آئی زود
ایں خراباتِ مغان است و درو رنداں اند شاہد و شمع و شراب و شکر و نای و سرود
ہرچہ در جملۂ آفاق ۔ درینجا حاضر مومن و برہمن و گبر و نصارا و یہود
گر تو خواہی کہ دم از صحبتِ ایشاں بزنی خاک پائے ہمہ شو تا کہ بیابی مقصود

تصوّف کے رنگ میں اگر شراب و ساقی و رند وغیرہ کے معنے لئے جائیں تو فی الحقیقت یہ قطعہ ایسا لطیف ہے جس کا لطف غیر فانی ہے۔ بار بار پڑھو مگر جی سیر نہیں ہوتا۔ یہ ہے شعر کا اثر اگر حقیقت سے لگاؤ ہو۔

مثنویاں نظامی کی آیات کمالات ہیں اور اس حقیقت رس ذات کی عظمت کو ظاہر کرتی ہیں مخزن اسرار عہد جوانی کی تصنیف ہے اور ابتدائی تصنیف جس میں حقائق تصوّف پر زمزمہ سرائی کی ہے۔ بحر بھی غالباً سب سے پہلے مثنوی کے لئے نظامی کی لائی ہوئی ہے۔ اگرچہ اس مثنوی کے جواب میں مولانا شبلی نے تقریباً ستاون ۵۷ مثنویوں کے نام لکھے ہیں مگر اسکے خصائص اسکے ساتھ ہیں۔ یہ مثنوی بہرام شاہ کو نذر کی گئی ہے اور آزاد خیالی ایسی ہے کہ اُسکے سامنے سنجر سلجوقی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جس میں ایک بڑھیا نے اُسے برا بھلا کہا ہے تاکہ بادشاہوں کو عبرت ہو:۔

پیرزنے را ستمے در گرفت دست زد و دامن سنجر گرفت
کاے ملک آزرم (ظلم ہوا) تو کم دیدہ ام از تو ہمہ سالہ ستم دیدہ ام
شحنۂ (انصاف مراد ہے) مست آمدہ در کوے من زد لگدے[۱] چند فرا روے من

[۱] ٹھوکریں۔

بے گنہ از خانہ بردنم کشید   موئے کشاں بر سر خونم کشید

قتل کرنے کو لے چلا

گفت فلاں نیمشب اے کوز پشت   بر سر کوئے تو فلاں را کہ کشت

کبڑی

گر ندہی داد من اے شہریار   با تو رود روز شمار این شمار

چونکہ تو بیداد گری پروری   ترک نۂ۔ ہندوئے غارتگری

شیریں و خسرو کو نظم کرکے عشقیہ شاعری کا راستہ کھولدیا۔ اگرچہ غزلیں پھیکی کہی ہیں مگر مثنوی میں تمام وہ مقامات نظم کردئے ہیں جو غزل کے لوازم سے ہیں اور نازک تشبیہوں اور استعاروں سے ایک لطف خاص پیدا کرکے اس صنعت کی زبان کی داغ بیل ڈال دی ہے۔ شیریں کے حسن کی تعریف میں یہ شعر دیکھو اور غزل گویوں کی زبان سے اسی مضمون کو سنو۔ خود کہدوگے کہ نظامی اس طرز ادا کا موجد ہے۔ شیریں نہالے جاتی ہے اور شاعر کہتا ہے:۔

چو قصد چشمہ کرد۔ آن چشمۂ نور   فلک را آب در چشم آمد از دور

شیریں چشمے کی طرف نہانے چلی۔ آسمان کو رنج ہوا کہ محض آبی رنگ ہونا بیکار ہے کاش میں فی الحقیقت دریا ہوتا تو یہ لطف مجھے نصیب ہوتا۔ اس رنج کیوجہ سے آسمان کی آنکھ میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ (آفتاب کے تھرّانے کی حسن تعلیل ہے۔ کیا یہ معنے بھی ممکن ہیں کہ آنکھ جب تیز روشنی کو دیکھتی ہے تو پانی بھر آتا ہے۔ آفتاب نے شیریں کو دیکھا تو یہ حال ہوگیا؟):۔

پرند آسمان گون در میان زد   یشد در آب و آتش در جہان زد

آبی رنگ کی چادر لپیٹ کے پانی میں نہانے اُتری اور دنیا میں آگ لگادی۔ (اسوقت حُسن میں جو دلفریبی پیدا ہوگئی تھی وہ دنیا کے دل میں عشق کی آگ بھڑکا رہی تھی)۔

ایک مقام پر شیریں کا بظاہر بگڑنا نظم کیا ہے مگر دل میں

محبت کا جوش ہے :-

بہ چشمے نازِ بے اندازہ میکرد | بہ دیگر چشم عذرے تازہ میکرد
چو سر پیچید گیسو مجلس آراست | چو رخ گردید گردن عذرہا خواست

غرض ساری مثنوی نہایت مزے کی ہے اور پڑھنے کے قابل۔ ایک دوست نظامی کو یہ داستان نظم کرنے سے منع کرتے تھے مگر جب اشعار سنے تو کہدیا :-

چنیں سحرے تو دانی ساز کردن | بُتے با کعبہ انبار کردن

لیلی و مجنوں میں دوسرا کمال دکھایا ہے۔ شیریں و خسرو میں ایرانی مناظر قدرت عشق و حسن کی داستان میں جان ڈالتے تھے۔ عرب کے مناظر میں وہ لطف کہاں مگر بادشاہ کی فرمائش۔ کیا کیا جائے۔ دقتوں کا احساس ہوا :-

نے باغ و نہ بزم شہریارے | نے رود و نہ مے نہ کامگارے
بر خشکیِ ریگ و سختیِ کوہ | تا چند سخن رود در اندوہ

بہرحال چار ماہ میں نظم ہو گئی :-

من گفتم و دل جواب می داد | خاریدم و چشمہ آب می داد
ایں چار ہزار بیت و اکثر | گفتم بہ چہار ماہ کمتر
گر شغلِ دگر حرام بودے | در چار دہ شب تمام بودے

اگر آغاز شاعری میں یہ داستان نظم کرنی پڑتی تو نہ یہ پختگی آتی نہ یہ کامیابی مشق سخن نے اتنا حوصلہ بڑھا دیا تھا کہ ایسا سنگلاخ وادی طے کرنا دو ہفتہ کا کام تھا۔

ہفت پیکر بہرام گور کی داستان ہے کہ قصر خورنق میں داخل ہوا اور سات تصویریں دیکھیں یہ ہندوستان۔ چین۔ خوارزم۔ صقلاب۔ ایران۔ روم اور مغرب کی شاہزادیاں تھیں۔ دل میں امنگ ہوئی کہ ان سے شادی

کرنا چاہیئے۔ جب بادشاہ ہؤا تو ساتوں شہزادیوں سے ملا اور ہر ایک نے قصے سنائے (مثنوی میں الف لیلہ کا مزا پیدا ہو گیا)۔ آخر میں بہرام کے انتقال کا حال ہے اور مثنوی ختم ہے۔ اس مثنوی میں نظامی نے بہرام گور میں عربی اور عجمی اخلاق کا مجموعہ دکھایا ہے کیونکہ اسکی ابتدائی تربیت عرب میں ہوئی تھی (غالباً یہی وجہ تھی کہ قبل اسلام کی شاعری میں اس کا مصرعہ "نام بہرام مرا و پدرم بوجبلہ"[۱] عربی لفظ پر ختم ہے۔

آخری تصنیف سکندر نامہ ہے جسکی وجہ سے نظامی کو دنیائے شاعری میں مثال بے مثالی حاصل ہوئی۔ اس مثنوی کے دو حصے ہیں بَرّی اور بحری۔ پہلا حصہ رزمیہ ہے اور دوسرا مذہبی اور اخلاقی۔ خود سکندر کے متعلق کہتے ہیں :۔

گروہیش خوانند صاحب سریر | ولایت ستاں بلکہ آفاق گیر
گروہے ز دیوان دستور او | بحکمت نوشتند منشور او
گروہے ز پاکی و دیں پروری | پذیرا شدند تدش بہ پیغمبری
من از ہر سہ دانہ کہ دانا فشاند | درختے برومند خواہم نشاند

رزمیہ حصہ کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ اگرچہ شاہنامہ کے مقابلے میں قطرے اور دریا کی نسبت ہے مگر پھر بھی کچھ ایسے شان سے نظم ہوگیا کہ سکندر نامہ ختم ہوتے ہی فارسی زبان میں رزمیہ شاعری کا کمال بھی ختم ہو گیا۔ سو برس کے بعد گوشہ نشین نظامی کے دل میں آمنگ ہوئی۔ زبان بدل چکی تھی۔ خیالات میں انقلاب پیدا ہو گئے تھے۔ طرز ادا کی روش بدلنے کے خود ہی ذمہ دار تھے لطیف استعارے اور تشبیہیں زبان کے حظ کو بڑھا رہی تھیں صاف شفاف چشمے کا پانی پینے والے برفابہ اور قندابہ کے جویا تھے ایسے وقت میں سکندر نامہ کا

---

[۱] یا اسکی معشوقہ کا مصرعہ "نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ" دیکھو صفحہ ۱۸

عالم وجود میں آنا اہلاً و سہلاً کی آواز و نکا مستحق ضرور تھا۔ یہ داستان اگرچہ ایک ہی شخص کی تھی اور وہ بھی ردمی النسل جسکی طرف عام دلچسپی مشکل سے ہو سکتی تھی۔ اسکے علاوہ نظم میں بھی تعقیدات لفظی و معنوی موجود[1] اور تاریخی غلطیاں سدّ راہ۔ نہ ایران کا انسائکلوپیڈیا نہ یونان کا۔ یہ سب کچھ سہی مگر شاعری کا زور ہر وقت پر غالب ہے اور فردوسی سے[2] مقابلہ کے لیئے تیار۔ اور بعض مقامات (اگرچہ شاذ و نادر ہیں) ایسے بھی ہیں جن کا رنگ فردوسی سے چوکھا ہے خصوصاً دارا کی آخری لڑائی اور قتل کا حال جس خوبی سے ادا ہوا ہے اُسکی نظیر شاہنامہ میں بمشکل ملیگی۔ اختصار کے لحاظ سے اُسوقت کا حال نقل کیا جاتا ہے جب دارا زخم کھا کے گرا اور سکندر سرہانے آیا تو دیکھا کہ دارا دم توڑ رہا ہے اسکے آنسو بھر آئے اور بکمال شفقت اُس کا سر اُٹھا کے اپنے زانو پر رکھا۔ دارا نے آنکھ کھولی تو دشمن کو سرہانے پایا عجیب خیالات دل میں پیدا ہوئے۔ کچھ مایوسی۔ کچھ ہراس۔ کچھ شاہی آن بان کا خیال۔ غرض اس کشمکش کی تصویر جیسے دلگداز الفاظ میں کھینچی ہے۔ وہ پڑھنے کے قابل ہے:۔

چو دارا بر ویش نگہ کرد و دید ۔ بسوزِ جگر آہ از دل کشید
چنیں داد دارا بخسرو جواب ۔ کہ بگذار تا سر نہم من بخواب
رہا کن کہ در من رہائی نماند ۔ چراغِ مرا روشنائی نماند
سپہرم بدانگونہ پہلو درید ۔ کہ شد در جگر پہلوم ناپدید
تو اے پہلوان کامدی سوے من ۔ نگہدار پہلو ز پہلوے من
کہ با اینکہ پہلو دریدم چو میغ ۔ ہمی آید از پہلوم بوے تیغ
سپہرسروراں را رہا کن ز دست ۔ تو مشکن کہ مارا جہاں خود شکست

---

[1] خود کہتے ہیں سہ ز تقدیم و تاخیر برمن مگیر + کہ باشد گزارندہ را ناگزیر

[2] کامل تنقید شعرالعجم حصّہ اول میں موجود ہے۔

چہ دستی کہ با ما درازی کنی | بتاجِ کیان دست بازی کنی
نگہدار دستت کہ دار است این | نہ پنہان چو روز آشکار است این
زمین را منم تاجِ تارک نشیں | ملرزان مرا تا نلرزد زمین
رہا کن کہ خوابِ خوشم می برد | زمین آب وچرخ آتشم می برد

اسکے بعد سکندر کی آہ وزاری ہے اور معذرت۔ پھر دارا کی وصیتیں ہیں جو سکندر نے سنیں اور منظور کیں۔ پھر دارا کی موت کو اسی سکون کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ جتنی آسانی سے اُس کا دم اِن واقعات کے بعد نکلا ہوگا:۔

سکندر پذیرفت از وہرچہ گفت | پذیرندہ برخاست گوئندہ خفت

مرنے کے بعد ہی ماتم شروع ہو جاتا ہے اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کون پہلے رویا۔ یہاں پر نظامی نے لطف بلاغت دکھایا ہے بجائے اوروں کے خود ہی مرثیہ شروع کردیا:۔

کبودی وکوری درآید بچرخ | کہ بغداد را کم شد کاخ وکرخ
درختِ کیاں را فروریخت بار | کفن دوخت بر درع اسفندیار

نظامی کے شاعری پر مجموعی رائے ان الفاظ میں ہوسکتی ہے کہ زبان غیرمانوس اور ثقیل خالص فارسی سے پاک ہے۔ یعنے فردوسی کی طرح خالص فارسی کے دلدادہ ضرور ہیں مگر امتداد زمانہ سے جن الفاظ کو ٹکسال باہر کردیا وہ انکے یہاں نہیں آسکتے بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ جس طرح ناسخ اُردو زبان کے ریفارمر ہوئے ہیں نظامی فارسی زبان کے تھے۔ علاوہ بریں طبیعت زوردار تھی اور واقعات میں زور بھر دینا انکے لئے معمولی بات تھی۔ اسی[1] غرض سے مختلف اسالیبِ بلاغت سے کام لیا ہے بلکہ جدید

---

[1] دیکھو صفحہ (۴۱) علم بر کشی اے آفتابِ بلند الخ کہ محض خطاب کرکے کلام میں زور پیدا کردیا۔

استعارے اور تشبیہیں پیدا کرنے کی خاص وجہ یہی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً صبح ہوتا ایک معمولی بات ہے اور اس روح پرور وقت کے سماں مختلف شعرا نے نظم نظم کئے ہیں مگر نظامی کی محاکات پر تخیل غالب ہے :-

چو یاقوت خورشید را دزد برد به یاقوت حسن جہاں پی نشرد

به دزدی گرفتند مہتاب را که او برد آن جوہر ناب را

وغیرہ وغیرہ۔

ساقی نامہ کا عنوان بھی نظامی ہی کا قائم کیا ہوا ہے۔ اکثر مقامات نظم کرکے اس فرضی شراب کو پی لیتے ہیں اور تھکن مٹ جاتی ہے۔ فلسفیانہ مباحث اگرچہ فردوسی اور ناصر خسرو وغیرہ نے نظم کئے ہیں مگر نظامی کو اس صنعت میں امتیاز خاص حاصل ہے۔ اخلاقی شاعری میں تو اسقدر نظم کیا ہے کہ ۳۵ عناوین اخلاق کے تحت میں بکثرت اشعار ایک شخص نے جمع کئے ہیں جسے مولانا شبلی نے خود دیکھا ہے۔ مقامات عشق مجازی و حقیقی کے اظہار انھیں مثنویوں میں نہایت خوبی سے ہوئے ہیں۔ اگر غزل میں یہی مقامات آجاتے تو شاید سعدی و حافظ کی اولیت و اولویت میں فرق آجاتا۔ رزمیہ شاعری کے خصوصیات سکندر نامہ میں اس شان سے برتے کہ گویا یہ نظم اپنے صنعت کی خاتم ہوگئی۔ اور شاہنامہ کے بعد اگر کوئی مثنوی ہے تو سکندر نامہ ہے۔

اب ہم شعرائے دور سلجوقیہ سے بکمال حسرت رخصت ہوتے ہیں اور بعض نثر نگاروں کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے زبان فارسی پر اپنے تصانیف بیش بہا کے ذریعے سے احسان کیا ہے۔ امام غزالی۔ ناصر خسرو۔ نظام الملک وغیرہ کا ذکر سابق میں ہو چکا ہے[1]۔ چند ہی نام اور باقی رہ گئے ہیں :-

---

[1] دیکھو صفحات (۱۱۵ و ۱۱۶ و ۱۳۱)

نثر کی کتابیں

شاہ مردان بن ابی الخیر نے اسی زمانے میں نزہت نامہ علائی نثر میں لکھا اور علاء الدین خاص بیگ والی طبرستان کو نذر کیا۔ ابوالمعالی محمد بن عبیداللہ کی تالیف بیان الادیان بھی یادگار ہے جس میں مختلف مذاہب کے حالات درج کئے ہیں اور گردیزی نے ایک کتاب زین الاخبار حالات خراسان میں لکھی ہے۔ کشف المحجوب جلابی مقامات تصوف میں اسی عہد کی تصنیف ہے اور نظامی[1] عروضی سمرقندی کا چہار مقالہ تو اس قدر مقبول ہے کہ یورپ میں اسکے ترجمے ہوگئے ہیں۔

علاوہ بریں ذخیرۂ خوارزم شاہی ایک بیش بہا مجموعہ خوارزم شاہیوں کی یادگار ہے جسے علم طب کا انسائکلوپیڈیا کہنا چاہئے۔ اور قاضی حمیدالدین کی مقامات حمیدی نے ایک نیا اسلوب نثر نگاری حریری و بدیعی کے رنگ میں پیش کیا جو عرصے تک نظر قبول سے دیکھا گیا مگر بعد کو پایۂ اعتبار سے ساقط ہوگیا۔ ذیل میں چند سطریں نقل کی جاتی ہیں۔ جن سے اندازہ ہوجائے گا کہ چہار مقالہ اور سفرنامہ ناصر خسرو وغیرہ کی سادی اور بے تکلف نثر کو چھوڑ کے قاضی صاحب کس طرف چلے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انشائے عجم کو بھی لے چلے

---

[1] تاریخ ادب میں اسے نظامی عروضی کہا جاتا ہے تاکہ نظامی گنجوی سے جدا نظر آئے۔ اسکا نام نجم الدین احمد بن عمر بن علی ہے اور تخلص نظامی۔ کہتے ہیں کہ ویس ورامین کی داستان بھی اسی نے نظم کی تھی مگر یہ روایت تحقیقی نہیں ہے۔ اسکی کتاب چہار مقالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۰۴ھ میں یہ سمرقند میں تھا جہاں رودکی کے حالات سے اطلاع پائی۔ ۵۰۶ھ میں نیشاپور گیا اور عمر خیام کے فیض صحبت سے مستفیض ہوا۔ طوس میں جاکے فردوسی کی قبر کی زیارت کی اور اسکے حالات دریافت کئے ۵۳۰ھ میں پھر نیشاپور گیا اور خیام کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ اسی کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملک الجبال غوری کے دربار میں اسکی رسائی تھی اور وہاں سے انعامات وغیرہ بھی حاصل ہوئے تھے۔

ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصنفین عہد تیموریہ ایرانیوں کی نظروں میں گر گئے اور آج تک ہندیوں کی فارسی پر ہنسی ہوتی ہے :-

"حکایت کردہ اند کہ مرا دوستیکہ حق در انصعت صحبت و عقد اشتہ نسبت محبت عہدیکہ کہ وقتیکہ سیماے عالم عقص و تازہ و طری بود و بساط با متوان استبرق و عبقری-
روای دمنہا تجلی عبہری و وطاے چمنہا شیبی و معصفری -

از برگ گل بسیط زمیں را بساط بود — وز نسیم باد صبح چو یاد نشاط بود
در کوزہ مے چو دلبرے اندر نقاب بود — و غنچہ گل چو کودکے اندر قماط بود

در وقتیکہ عالم چنیں رنگ و بوے داشت و قدم ہمت عزم جستجوے-
اتفاق را مجتاز و طاری گذر کردم نہ بوجہ سکون و اقامت و نہ بعزم اطالت و ادامت"

کہنا اتنا ہے کہ میرے ایک پرانے بچپن کے دوست نے بیان کیا کہ بہار کے زمانے میں سفر کرنے کے لئے میں روانہ ہوا۔ مگر متواتر مترادف الفاظ مشکل لغات۔ اضافتوں کے الٹ پھیر نے فصاحت کو کدھر پھینکا اور رنگ آمیزیوں کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ فارسیت یک قلم مفقود اور عربی لفظوں کی بھرمار کہ خدا کی پناہ۔ ورنہ اسی زمانے میں تاریخ بیہقی اور چہار مقالہ ایسی کتابیں لکھی گئیں جنکی سادگی اور حسن زبان کو دوبالا کر دیا ہے۔

———

باب ہشتم

تاتاریہ

محمد خوارزمشاہ — خوارزمشاہیوں کے تسلط کا حال سابق میں تحریر ہو چکا ہے علاء الدین محمد خوارزمشاہ کی ملک گیری کا شوق ایسا کامیاب ہوا کہ تھوڑے عرصے میں جبل قاف سے بحر فارس تک اور دریائے سندھ سے نہر فرات تک خوارزمشاہیوں کا ڈنکا بجنے لگا اور سب چھوٹی چھوٹی سلطنتیں مستہلک ہو گئیں۔ ناصر باللہ عباسی سے بھی عداوت ہو گئی تھی۔ دربار خلافت کیطرف سے غزنوی لوگ محمد خوارزم کی مخالفت پر آمادہ کئے جا رہے تھے اور محمد چاہتا تھا کہ سادات علوی میں سے ایک شخص کو خلیفہ بنا کے عباسیوں کا خاتمہ کردے۔

چنگیز خاں — اس زمانے میں تاتاریوں کو ملک گیری کا شوق ہوا اور اُن کے بادشاہ چنگیز خاں نے لبغرا کو دو مغلوں کے ساتھ محمد خوارزم کے دربار میں یہ پیام دیکے بھیجا کہ ایک والی نے چند تاجروں کو قتل کر ڈالا ہے لہذا اُسے تاتاریوں کے حوالے کیا جائے۔ خوارزمشاہ نے لبغرا کو قتل کر ڈالا اور مغلوں کو ذلیل کر کے نکلوا دیا۔ یہ ذلت مغلوں کی قرلتائی (مجلس شورائے ملی) کو ناگوار ہوئی اور انتقام لینے کا جوش اتنا بڑھا کہ بخارا۔ نیشاپور۔ سمرقند۔ ترمذ اور مرو وغیرہ میں خون کی ندیاں بہادیں اور مساجد و مقابر۔ مدارس و مساکن سب کو یوں کھود کے مسمار کر دیا کہ جن مقامات پر چہچہے اور قہقہے رہتے وہاں بجز زاغ و بوم کے کوئی بولنے والا نہ رہا اور جہاں سے تسبیح و تہلیل کی آوازیں بلند ہوتی تھیں وہاں

سوائے باد سموم کے خاک اُڑانے کے کچھ بھی نہ تھا۔ علاءالدین کی یہ حالت پہونچی کہ شہر بشہر دیار بدیار پھرتا تھا اور کہیں اطمینان نصیب نہ تھا۔ ماں۔ بیویاں۔ بچے۔ زر و جواہر سب تاتاریوں کی غنیمت میں آگئے یہانتک کہ خود بھی ۶۱۸ھ (دسمبر ۱۲۲۰ء) میں دل شکستہ ہو کے مر گیا اور اسکا بیٹا جلال الدین محمد مالک ہوا جو بڑی بہادری سے تاتاریوں کے

جلال الدین محمد خوارزم شاہ

مقابلے کرتا رہا مگر سوائے ہزیمتوں کے کچھ نہ ملا۔ یہانتک کہ پسپا ہوتا ہوا دریائے سندھ کے اُس پار نکل آیا۔ یہاں راجہ جودی پر فتح پائی اور قراچہ امیر سندھ اور التمش سلطان دہلی کو ہیبت زدہ کیا لیکن تاتاریوں کے واپس جانے کی خبر سن کے پھر ایران واپس گیا اور ہر مخالف سلطنت کو تہ تیغ کیا۔ آخر تھوڑے عرصے میں کرمان۔ فارس رے اور اصفہان کو تسخیر کر کے خلیفہ عباسی کی فوج کو شکست دیتا ہوا جسر بغداد تک پہونچ گیا۔ پھر گرجستان و تفلس پر قبضہ کیا اور از سر نو خوارزم شاہیوں کی عظمت قائم کر دی۔ سوئے اتفاق سے ایک فوج تاتاریوں کی لڑنے آگئی اور جلال الدین کو شکست ہوئی مگر اس ہزیمت کے سلسلے میں بھی گنجہ فتح کر لیا۔ افسوس! زندگی نے وفا نہ کی اور ناگہاں ۶۲۹ھ مطابق ۱۵ اگست ۱۲۳۱ء میں کسی شخص نے اُسے قتل کر ڈالا ورنہ ممکن تھا کہ تاریخ عجم کا رخ دوسری طرف پھر جاتا۔

اُگتائی

اُدھر چنگیز خاں بھی تین سال پہلے ہی چین میں ۱۸ اگست ۱۲۲۷ء کو ہلاک ہو چکا تھا اور دو سال سے زائد قرلتائی کو جانشین مقرر کرنے میں صرف ہو گئے بالآخر اُسکے بیٹے اُگتائی خاں کی تخت نشینی اور خوارزم شاہیوں کا زوال تقریباً ایک ہی سال میں ہوا۔ اسکی حکومت دس سال رہی۔ قراقرم ۱۲۳۵ء میں پائے تخت قرار پایا اور ایران کے علاوہ روس اور پولینڈ کو بھی فتح کیا جہاں وہی ہیبت اور خونریزی کا منظر دکھلایا گیا جو چنگیز خاں کے حملے سے ایشیا میں ظاہر ہو چکا تھا۔ بالآخر ماہ دسمبر ۱۲۴۱ء کثرت شراب کا متوالا اور یہی باعث ہلاکت ہوا۔

کیوک

اُگتائی کے بعد کچھ عرصے تک اُس کی بیوہ ترکانیہ حکمراں رہی یہاں تک کہ

کیوک جنگ روس سے واپس آیا اور ایک عظیم الشان قرلتائی میں تخت نشین ہوا۔ جس میں سفرائے خلیفہ عباسی و شیخ الجبل کے علاوہ پاپائے روم کے سفیر بھی موجود تھے۔ اسکے زمانے میں عیسائیوں نے بیحد کوشش کی کہ تاتاری فوج عیسائیوں کے ساتھ مل کے مسلمانوں کا خاتمہ کر دے بلکہ بغداد اور شیخ الجبل کے سفیروں کو ذلت کے ساتھ نکلوا بھی دیا مگر کوئی خاص کامیابی انکے ارادے کو نہ ہوئی اگرچہ یہ کوشش چنگیز خاں کے وقت سے جاری تھی اور مختلف ممالک مفتوحہ میں یورپ کے مشن کام کر رہے تھے۔

منگو — کیوک کا انتقال اپریل ۱۲۴۸ء سنہ ۶۴۶ھ اور منگو خاں بادشاہ ہوا جسکی باضابطہ تخت نشینی یکم جولائی ۱۲۵۱ء کو ہوئی۔ اُسنے اپنے بھائی قبلا خاں کو تسخیر چین کے لئے اور دوسرے بھائی ہلاکو خاں کو خلافت بغداد اور اسمٰعیلیوں کا خاتمہ کر دینے کے لئے روانہ کیا۔

ہلاکو — قبلا خاں کو چین کی تسخیر میں عظیم الشان کامیابی ہوئی اور ہلاکو نے پانچسو برس کی قائم خلافت عباسیہ کو اور ڈیڑھ سو برس کی تحریک اسمٰعیلیت کو ایسی بے دردی سے تہ تیغ کیا جس کی مثال تاریخ عالم میں شاید فترت چنگیزی ہی ہو سکتی ہے۔ الموت کا مذہبی دور ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اور دار السلام بغداد میں تو سنہ ۶۵۶ھ مطابق سنہ ۱۲۵۸ء میں وہ تباہی آئی کہ پھر نہ سنبھلا اور آخری خلیفہ مستعصم باللہ کی زندگی کا خاتمہ نہایت عبرت ناک طریقے سے ہوا۔ عجب اتفاق ہے کہ ایسے خونریز بادشاہ کے ہمراہ رکاب عطا ملک جوینی محقق طوسی۔ اتابک ابوبکر بن سعد زنگی (سعدی کا ممدوح) اور اتابک بدر الدین لولوی موصلی سے نامبر آوردہ لوگ تھے۔ غرض اس انقلابِ عظیم نے تاریخ کا دوسرا صفحہ شروع کر دیا۔ یہ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ہیبت ناک منظر اپنے ساتھ انشائے عجم کے لئے روح تازہ لئے ہوئے آتا ہے اور اس خونریز قوم کی حکومت میں فنونِ جنگ کے اصول شائع ہونگے۔ ہیئت و ہندسہ منطق و فلسفہ۔ کلام و تاریخ پر بے نظیر کتابیں نکلیں گی۔ فاتحوں کی وسیع سلطنت چینیوں کو بلاد روم و روس میں اور مغلوں کو اقصائے ہند و یمن تک پھیلا کے آپس میں تبادلۂ خیالات و

نقل علوم کے مواقع عطا کریگی۔ ان لامذہب لوگوں کے زمانے میں مذہبی نزاعات فرو ہوجائیں گے اور عالم اسلام نشر علوم کیطرف ملتفت ہوگا کیونکہ فرمانروائی دوسرے کے ہاتھوں ہوگی عشق حقیقی و مجازی میں نظمیں ایسا سوز و گداز لیئے ہوئے آئیں گی جسکی نظیر قبل میں اسوجہ سے نہیں ملتی کہ مسلمان اسوقت تک مظلوم ہونے کا احساس ہی نہیں کرسکتے تھے۔ حبیب دل دُکھتے ہیں تو خدا بھی یاد آتا ہے اور مصائب عشق سے بھی متاثر ہونے کا موقع ملتا ہے۔ غرض اس دور میں یہ سب کچھ ہوا۔ البتہ رزمیہ شاعری کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔ ٹوٹے ہوئے دل میں اتنا زور کہاں کہ ولولہ جنگ کو دکھا سکے۔ ایک فردوسی کا دل ٹوٹا تو یوسف زلیخا لکھ گئی۔ یہاں ساری قوم تباہ ہے۔ اب رزمیہ جوش و خروش دکھانے کا کون وقت رہا!

ہلاکو کے بعد ۱۹ جون ۱۲۶۵ء اسکا بیٹا اباقا ایلخانیوں[۱] کا تاجدار ہوا جس نے مسیحیوں کی طرفداری کرکے دول یورپ کی نظروں میں وقار پیدا کیا مصر کے مملوکوں سے اور اسمعیلیوں کے بقیۃ السیف سرگروہوں سے مقابلے رہے۔ جوینی خاندان کا عروج و زوال اسی کے عہد میں ہوا۔ آخر ۶۸۰ھ مطابق یکم اپریل ۱۲۸۲ء میں بیہوش ہوکے ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا۔ اباقا

پھر اُس کا بھائی احمد[۲] نکودار ۶ مئی ۱۲۸۲ء کو وارث تاج و تخت ہوا۔ یہ پہلا ایلخانی تھا جس نے اسلام قبول کیا اور علمائے عصر کی بہت عزت کی۔ آخر بعض تاتاریوں نے سازش کرکے اسکی زندگی کا خاتمہ کیا اور ارغون کو اگست ۱۲۸۴ء میں تخت پر بٹھلایا۔ شمس الدین جوینی کو کسی قدر عروج اس عہد میں بھی نصیب ہوا تھا آخر ۴ یا ۵ شعبان ۶۸۳ھ مطابق ۱۶ یا ۱۷ اکتوبر ۱۲۸۴ء میں ارغون کے حکم سے قتل کیا گیا۔ مرنے سے قبل یہ رباعی کہی:- احمد نکودار — ارغون

۱؎ قبلائی خاں چین کا بادشاہ ہوگیا تھا اور تمام تاتاری مقبوضات کا شہنشاہ تھا ہلاکو اور اسکے وارث عرصے تک اسکے ماتحت بادشاہ رہے جو ایلخانیان ایران کہلاتے تھے۔

۲؎ پروفیسر براؤن کی تحقیق ہے کہ صحیح نام تقودار ہے اور نکودار کاتبوں کی تحریف ہے۔

در نگر اے چراغِ جہان گشتہ — تا بہ بینی دو صد جہان گشتہ
کشتگانِ زندگاں جاویدانند — خاصہ دردستِ کافران گشتہ

ارغون لامذہب تھا مگر مسلمانوں کا سخت دشمن۔ اس نے ایک یہودی سعدالدولہ کو اپنا وزیر مقرر کیا جس نے اکابر اسلام کو تہ تیغ کیا اور شعائر اسلام کو بالکل مٹا دیا آخر سنہ ۶۸۹ھ (مطابق سنہ ۱۲۹۱ء) بادشاہ و وزیر دونوں ختم ہو گئے اور اس کا بھائی **گیخاتو** تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ نہایت نیک بخت تھا مگر فضول خرچ۔ اس کا وزیر صدر جہاں بھی نہایت مدبر تھا سیم و زر کی قلت سے مجبور ہو کے کاغذ کا سکّہ (نوٹ) جاری کیا جس کا سنہ ۶۹۳ھ مطابق سنہ ۱۲۹۴ء میں نام چاؤ تھا اور اس نے اعلان کیا کہ:

چاؤ اگر در جہان روان گردد — رونقِ ملک جاودان گردد

لیکن تاجروں نے اس اختراع کو پسند نہ کیا اور مجبوراً پھر طلائی اور نقرئی سکّے جاری ہوئے جس سے اور شدید نقصان ہوا اور صرف ایک لفظ (چاؤ) کا فارسی زبان میں اضافہ ہو گیا۔ اس بادشاہ کا خاتمہ اپنے چچا زاد بھائی **بائدو** کے ہاتھوں روز پنجشنبہ ۶۔ جمادی الآخری سنہ ۶۹۴ھ مطابق ۲۳۔ اپریل سنہ ۱۲۹۵ء کو ہوا جسے وہ نشہ میں بہت ذلیل کر چکا تھا۔ جمادی الاخری سنہ ۶۹۴ھ (اکتوبر) سے چھ ماہ تک اسکی حکومت رہی آخر ذیحجہ میں یہ بھی غازان بن ارغون کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

غازان کی تاریخ ولادت ۴ دسمبر سنہ ۱۲۷۱ء ہے اور اس کا نام اس سلسلۂ سلاطین میں سونے کے حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے۔ اسکے زمانے میں استقلال اسلام ممالک ایران میں ہو گیا اور آشوب تاتاریہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوا۔ خود بھی عربی و فارسی۔ چینی و تبتی و کشمیری بلکہ لاطین بھی جانتا تھا اور ترویج علوم کا ایسا شوق تھا کہ کملائے عصر کو اپنے تصانیفِ بیش بہا پیش کرنے کا موقع ملا۔ اسی نے خاقان چین کی ماتحتی ترک کر کے خود مختار حکومت قائم کی اور مشاہد مقدسہ

امام حسینؑ و امام رضاؑ کو نہایت آراستہ کیا۔ سلاطین مصر سے بھی کئی مقابلے ہوئے اور بعض میں فتح بھی نصیب ہوئی۔ سنہ ایلخانی کو بغرض درستی حسابات ۱۳۔ رجب ۷۰۱ھ (مطابق ۱۴۔ مارچ ۱۳۰۲ء) سے جاری کیا۔ مساجد و مقابر و مدارس وغیرہ کو اچھی خاصی رونق دی۔ غرض ایک مستقل سلطنت اسلامی کی بنیاد ڈال کے ۷۰۴ھ (مطابق ۱۷۔ مئی ۱۳۰۴ء) میں راہی ملک بقا ہوا۔

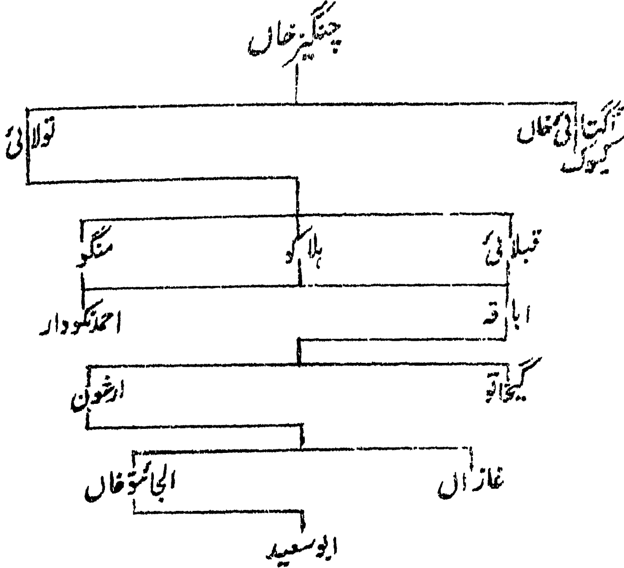
الجائتو غازان کے بعد اُس کا بھائی الجائتو خاں خدابندہ ۲۱ جولائی ۱۳۰۴ء کو تخت نشین ہوا۔ جسکا لقب قبل سلطنت خربندہ[۱] بھی تھا۔ محقق طوسی کی درست کی ہوئی رصدگاہ مراغہ اُسکے وقت میں عروج پر آئی اور رزنجان کے قریب سلطانیہ کی بِنا ڈالی گئی جہاں عظیم الشان عمارتیں تیار ہو گئیں۔ اگرچہ اب یہ سب گردش فلکی سے محض کھنڈر ہیں اور کچھ نہیں۔ اس زمانے میں سلطنت اسلام کو اور مضبوطی ہو گئی آخر ۷۱۵ھ (مطابق ۱۶۔ دسمبر ۱۳۱۶ء) میں ہیضہ مفاصل نے اسکا بھی پیمانۂ عمر لبریز کیا اور ابوسعید اُسکا بیٹا اپریل ۱۳۱۷ء میں تخت نشین ہوا۔

ابوسعید ابوسعید کی سلطنت میں امیر چوپان کی امیر الامرائی یادگار ہے جس کی روز افزوں ترقی نے بہادر خاں خطاب دلایا اور بادشاہ کی بہن ستی بیگ سے ۱۳۲۹ء میں اُسکی شادی ہو گئی۔ اسی کے بیٹے دمشق خواجہ کا نواسہ سلطان اویس بغداد کا حکمران ہوا جس کا عہد حکومت علم و ادب کی ترقی کے لئے یادگار ہے۔ ابوسعید کی سلطنت کا زمانہ مختلف لڑائیوں اور خانہ جنگیوں میں صرف ہوا اور ۷۳۶ھ (۱۳۳۶ء) میں اسکے انتقال کے بعد ایلخانیوں کی عظمت کا ایسا خاتمہ ہوا کہ ۳۵ برس تک کوئی مستقل بادشاہ نہ ہو سکا یہاں تک کہ تیمور لنگ نے حملہ کر کے سلطنت کا

---

[۱] یہ لقب بعض کے نزدیک بچپن میں نظر بد سے بچنے کے لئے دیا گیا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ غازان کے خوف سے واقعی بھاگ گیا تھا اور بار برداری کے گدھے کرایہ پر چلاتا تھا۔

رُخ پھر بدل دیا۔ یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ تیمور کا سنہ ولادت اور ابوسعید کا سنہ وفات ایک ہی ہے ان لوگوں کا شجرۂ خاندان یہ ہے :۔۔



اب ہم اس عہد(۱) کے تصانیف کا حال لکھتے ہیں۔ عربی میں تفسیر بیضاوی۔ فصوص الحکم ابن عربی طبقات الاطبا۔ کامل ابن اثیر۔ وفیات ابن خلکان۔ آثار البلاد وغیرہ بے نظیر کتابیں آج تک ثابت کر رہی ہیں کہ اسلامی علوم کا رُخ کس ترقی کیطرف جا رہا تھا اور فارسی میں تو ایسے بیش بہا تصانیف ہوئے کہ شاید و باید۔

عطا ملک جوینی

علاء الملک عطا ملک جوینی نے چنگیز خاں کے فتوحات کا حال قلمبند کیا اور تاریخ جہانکشا نام رکھ کے سنہ ۶۵۸ھ (مطابق سنہ ۱۲۶۰ء) میں علمی دنیا کو پیشکش کیا۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ چنگیز خاں اور اسکے اسلاف و اخلاف کی

---

(۱) اسی زمانے میں ہندوستان میں فارسی زبان میں طبقات ناصری اور تاریخ فیروز شاہی وغیرہ تصنیف ہو رہی تھیں جنکا ذکر ایک علحدہ باب میں آئے گا۔

(چغتائی کے حال تک) تاریخ ہے۔ دوسرے حصہ میں خوارزم شاہیوں کا حال بالعموم ہے اور قطب الدین و جلال الدین کا بالخصوص۔ تیسرے میں حسن صباح اور اسمٰعیلیوں کا ذکر ہے۔ بیشتر واقعات چشمدید لکھتے ہیں۔ زبان میں عربی الفاظ بے تکلّف داخل ہونے لگے ہیں مگر جزوِ زبان نہیں معلوم ہوتے۔ سادگی ادا متقدمین سے ملتی جلتی ہے۔ مقامات حمیدی کی سے آورد نہیں۔

گلستاں

اس سے دو سال قبل شیخ سعدی نے گلستاں تصنیف کی تھی جس کے متعلق نہایت آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ آجتک نثر فارسی میں اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی۔ فصاحت و سلاست خداداد کی قوت سے جو معجز نگاری ظاہر کی گئی ہے وہ سراسر محیر العقول ہے۔ عربی الفاظ و محاورات بکثرت داخل کئے ہیں مگر زورِ تحریر نے انھیں بالکل جزوِ زبان بنادیا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی خزانے کے جواہر ہیں اور فطرت نے انھیں اسی سرزمین میں پیدا کیا ہے۔ صنائع لفظی و معنوی سے بھی مملو ہے مگر آمد اتنی ہے کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کسی صنعت کی غرض سے یہ عبارت لکھی گئی۔

"عاقلے را پرسیدند کہ نیکبخت کیست۔ و بدبخت چیست گفت نیکبخت آنکہ خورد و کشت و بدبخت آنکہ مُرد و ہشت"

ذرا ہموزن و ہم قافیہ الفاظ کی نشست دیکھو پھر تضاد و تقابل وغیرہ کی لذت سے مقابلہ کرو اور علم اخلاق کے مسائل دقیق کی ایجازی شکل ایسی کہ بچے بھی یاد کرلیں گے اور سمجھ جائیں گے اور بالغ العلم لوگ تو شیرینی ادا کے دیوانے نظر آئیں گے حقیقت میں سہل ممتنع یہی ہے۔ علامہ تفتازانی نے مطول علم بلاغت میں نہایت ضخیم

لکھی ہے مگر انکا قول یہ تھا کہ سعدی اپنا ایک فقرہ[1] گلستان کا مجھے دیدے اور ساری تصنیف میری خود لے لے۔ پروفیسر براؤن نے اسکے اخلاقی تعلیم کے معیار کو پست ظاہر کیا ہے اور "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" یا اور ایسی ہی دو ایک ہدایتوں سے استشہاد کیا ہے حالانکہ میدان عمل میں آکے کمال اخلاق کے مدعی اس سے بدتر نظر آتے ہیں مگر سعدی نے سچی بات کہدی اور انسان کی اخلاقی قوت کے حدود کو بتا دیا ورنہ اگر اس ہدایت پر خود عمل کر لیتے تو شاید اعتراضات کے دروازے بند ہو جاتے۔

محقق طوسی

محقق طوسی نے اخلاق ناصری علم اخلاق میں اور معیار الاشعار فن عروض میں تصنیف کیں محقق رح کا نام نصیر الدین محمد بن حسن ہے اور طوس مقام پیدایش و نشو و نما و سال ولادت ۵۹۷ھ فلسفہ ریاضی میں بےنظیر تھے اور فقہ و حدیث و تفسیر وغیرہ میں بھی کامل الفن۔ بلکہ ان کے لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس جامعیت کے علما دنیائے اسلام میں کم نظر آتے ہیں۔ ابتدائی زمانہ قلاع اسمٰعیلیہ میں گذرا بلکہ شاید وہیں قید بھی رہے۔ ایلخانی فتوحات انکی رہائی کا باعث ہوئیں اور ہلاکو خاں اور اُسکے وارثوں کے یہاں وزارت کے عہدے تک پہونچے۔ آخر جون ۱۲۷۴ء میں رحلت کی اور کاظمین (بغداد) میں دفن ہوئے۔ بعض ناقدین کی رائے ہے کہ "از زمانِ اوالی الآن نہایتِ مرتبۂ فضل فضلائے عہد تفہیمِ دانِ کتب اوانحصار دارد" یہاں بھی وہی چھوٹے چھوٹے فقرے ہیں مگر تراکیب و محاورات عرب کی کثرت ہے لیکن قوت علمیہ نے طرز ادا میں

---

[1] فقرہ یہ ہے "از بستر نرمش بخاکستر گرمش نشانند"۔ ایک شہزادے کی حالت ہے اور صنعت مقابلہ ایک دلکش اور روح پرور منظر سے ایک عبرت ناک اور دردانگیز وادی تک اس قدر تعجیل سے خیال کو کھینچ کے لائی ہے کہ ادیب کی طبیعت بیچین ہو جاتی ہے۔

ایک خاص مضبوطی پیدا کر دی ہے اور زبان کو متین بنا دیا ہے۔ کبھی کبھی عربی محاوروں کا لفظی ترجمہ کر دیتے ہیں مثلاً بجائے "باید کہ فراموش نکنی" کے کہدینگے "بر تو باد" یا "چنانچہ گفتم" کی جگہ لکھیں گے "چنانچہ یاد کردہ ایم"[1]۔ عربی میں مجسطی۔ تحریر اقلیدس (۷ مقالہ)۔ شرح اشارات۔ اوصاف الاشراف وغیرہ انھیں کی یادگار ہیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں اور حکیمانہ مذاق غالب ہے:۔

موجود بحق واحدِ اوّل باشد   باقی ہمہ موہوم و مخیّل باشد
ہر چیز جزا و کہ آید اندر نظرت   نقشِ دو مین چشمِ احوَل باشد

تاریخ وصاف

۶۹۹ھ (۱۳۲۸ء) میں عبداللہ وصاف بن عبداللہ نے غازان خاں کے لئے تاریخ وصاف لکھی اور بقول مولانا آزاد "بڑا زور مارا۔ مگر فقط لفاظی اور لغت بازی ہے۔ عربی۔ فارسی۔ ترکی لفظوں کا حشر برپا ہے"۔ مصنف نے استعارات و تشبیہات کو نثر میں لا کے کچھ ایسا پیچیدہ کر دیا ہے کہ مطلب گم ہو گیا۔ مترادف فقرات نے الفاظ میں زیادتی اور معانی میں کمی پیدا کر دی۔ بدنصیبی سے اس رنگ تحریر نے انشا پردازی کا مذاق بدل دیا اور چھ سو برس تک گویا سادہ عبارت لکھنا ایرانی لوگ بھول گئے۔ یہ تو اب ہمارے زمانے میں انقلابات ہو رہے ہیں اور سفرنامۂ ناصر الدین شاہ وغیرہ کی عبارت پھر سادگی کی طرف آئی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"حسن را بہین گناہ مواخذات فرمود بے جان اورا بہ بخشید آیت طفلی در الاطاق ہنگام عربدۂ گیخا تو خاں بحکم فرمان بے ادبی نمودہ بود

---

[1] عربی میں ذکر کے معنی ہیں 'یاد کرنا' دیکھو اردو میں اسی موقع پر کہتے ہیں کہ "میں نے ذکر کیا ہے"۔ اب یہ لفظ جزو زبان ہو گیا اگر ترجمہ کر دیا جائے تو وحشت ہو گی۔

دربار[۵۱] غوحافر گشت۔ جواب درست درشت بے دہشت وکان[۵۲] منہ العقول بالجل دہشت عرضہ داشت کہ آنرو زگیخاتو خاں بر تخت خانیت متمکن بود اگر بر قتل اقدام نمودے امتثال واجب بودے۔ اجمام[۵۳] ناممکن۔ امروز نیز بندہ بادشاہم اگر سیکور[۵۴] رغا ملتشی فرماید وبر بندۂ خود نیم جانے منت نہد باہر کہ اشارہ رود انقیاد ہماں واجب دانم"

رشید الدین فضل اللہ

رشید الدین فضل اللہ کی جامع التواریخ بھی ایک یادگار کتاب ہے۔ مصنف کی تاریخ ولادت ۶۴۶ھ ہے اور وطن ہمدان۔ ابتدائی زمانہ اہل علم کی صحبت میں گذرا۔ غازان کے عہد حکومت میں وزارت پائی اور وصاف کی تقریب دربار شاہی میں کی۔ الجائیتو کے وقت میں بھی وزیر رہا۔ آخر درانداز وں نے بادشاہ کو ناراض کردیا اور ستر برس کی عمر پاکے ۷۱۶ھ (۱۳۱۸ء) میں قتل کیا گیا۔ عمارات میں ربع رشیدیہ اور اپنا مقبرہ چھوڑا تھا مگر گردش زمانہ نے انھیں بھی باقی نہ رکھا۔ جامع التواریخ اسکی بہترین یادگار ہے۔ پہلی جلد میں مغلوں اور تاتاریوں کے حالات۔ انکے خاندانی شجرے۔ قصص و روایات وتقسیم قبائل وغیرہ کا ذکر ہے پھر چنگیز خاں اور اسکے اسلاف واخلاف کی (غازان خان تک) تاریخ ہے۔ دوسری جلد میں حضرت ابوالبشر سے لیکے حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کے حالات ہیں اور سلاطین ایران کا بھی عہد اسلام تک ذکر کیا گیا ہے۔ اسکے بعد حالات خلفائے بنی امیہ وبنی عباس قلمبند کئے ہیں۔ پھر سلاجقہ وسلغریہ واسمٰعیلیہ وغیرہ کے حالات ہیں۔ آخر میں چینیوں۔ یہودیوں۔ نصرانیوں اور ہندوؤں کے اذکار ہیں بلکہ سکیا منی (گوتم بدھ) کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ زبان سلیس اور شستہ ہے

---

[۵۱] مواخذہ۔ [۵۲] گویا کہ اس سے عقلیں بیحد دہشت کھا گئیں۔ [۵۳] آرام کرنا۔ [۵۴] مہربانی

اور تاریخی تحقیق قابل قدر۔ اسکے علاوہ کتاب الاحیاء والآثار۔ کتاب توضیحات۔ مفتاح التفاسیر۔ رسالہ سلطانیہ۔ لطائف الحقائق وغیرہ عربی میں لکھیں اور بمقتضائے احتیاط فارسی تصانیف کے عربی ترجمے اور عربی تصانیف کے فارسی ترجمے کرادئے اور ہر کتاب کے متعدد نسخے مختلف لوگوں اور کتب خانوں کو نذر کر دئے تاکہ باقی رہیں۔ مگر زمانہ کی نظر انتخاب ان احتیاطوں کی پابند نہیں۔ یمحو اللہ مایشاء ویثبت وعندہ ام الکتاب۔ رشید کے خطوط بھی سیاسی وملکی حالات کے جمع کرنے میں کافی مدد دیتے ہیں اور اسکے قلمی نسخے بڑے بڑے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

حمد اللہ مستوفی کی تاریخ گزیدہ (مؤلفہ ۱۳۳۰ء) بھی نہایت سلیس فارسی میں ہے اور اسکے مضامین تقریباً جامع التواریخ ہی کے ایسے ہیں۔ البتہ اپنے وطن قزوین کا حال مصنف نے بڑھا دیا ہے اور ائمہ ومجتہدین۔ قاریان قرآن ومشائخ۔ وُلات وسادات۔ حکما واطبا شعرا ومصنفین وغیرہ کا حال بھی لکھا ہے۔ اسی کتاب کے دیباچے میں اپنی مثنوی ظفر نامہ کا ذکر کیا ہے جسے پندرہ برس کی محنت کے بعد ۱۳۳۵ء میں تمام کیا تھا اور محققین یوروپ کی رائے ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ نظم نہایت صحیح اور مفید ہے۔ نمونہ کے طور پر چند شعر لکھے جاتے ہیں اور فیصلہ ناظرین پر چھوڑا جاتا ہے کیونکہ بعض لوگ اسے شاہنامہ کا جواب سمجھتے ہیں۔ تاریخ گزیدہ ظفر نامہ

نماند اندراں شہر جائے گزر | زبس کشتہ افگندہ بیحد ومر
ز بیم سپاہ مغل ہر کسے | گریزاں برفتند ہر جا بسے
برفتند چندے بجامع درون | پراندوہ جاں و بدل پر زخون
چو بود ند زاں دشمن اندیشناک | فراز مقرنس نہاں گشت پاک

بمسجد مغل اندر آتش فگند — زبانہ بر آمد بہ چرخ بلند
بآتش سقوف و مقرنس بسوخت — وزاں کفر و جور و ستم بر فروخت

کہتے ہیں کہ ۷۵۰۰۰ شعر کی مثنوی ہے۔ ۲۵ ہزار شعر عرب کے حال میں۔ بیس ہزار عجم کی تاریخ اور تیس ہزار تاتاریوں کے فتوحات وغیرہ کے ذکر میں ہیں شاعری کے اعتبار سے بجز سادہ بیانی کے اور کس بات کی داد دی جاسکتی ہے۔

نزہت القلوب — اسکے بعد نزہت القلوب پانچ سال بعد تصنیف کی۔ جسے فارسی زبان کا قدیم ترین جغرافیہ کہہ سکتے ہیں۔

تاریخ بناکتی — تاریخ بناکتی کو فخر الدین بناکتی نے نہایت شیریں اور سلیس فارسی میں لکھ کے ۷۱۷ھ ۱۳۱۷ء میں شائع کیا۔ پروفیسر براؤن اسکی تاریخی معلومات کی بہت تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "علاوہ تاریخ اسلام و تاتاریہ و عجم کے صحیح معلومات بہم پہونچانے کے مصنف نے جزائر برطانیہ و فرانس و روس و پرتگال وغیرہ کی بھی صحیح تاریخ بلکہ رومۃ الکبریٰ اور تاریخ مذہب مسیحی کے صحیح روایات نقل کئے ہیں اور یہ بات مسلمان مورخوں میں بہت شاذ و نادر ہے"

اسی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل چین چھاپنے کا فن بخوبی جانتے تھے اور تختیوں پر اُبھرے ہوئے حروف میں کتابوں کے صفحات تیار کر کے جمع کرلیتے تھے اور جس طرح مہر لگاتے ہیں اسی طرح جب کسی نسخے کی ضرورت ہوتی تھی تو چھاپ کے دیدیتے تھے۔

علامہ قطب الدین شیرازی محقق طوسی کے شاگرد رشید تھے انھوں نے

درۃ التاج — فارسی میں درۃ التاج تصنیف کی جس میں تمام اجزائے فلسفہ کی مکمل بحث موجود ہے۔ اسی طرح اور کاملین نے نایاب کتابیں لکھی ہیں جن کی تفصیل بخوف طول ترک کیجاتی ہے۔

اب ہم تاریخ نظم کی طرف توجہ کرتے ہیں اور بعض مشہور شعرا کے حالات لکھتے ہیں۔ رزمیہ مثنوی کا اس زمانے میں بڑا زور تھا مگر ظفرنامہ کے علاوہ شاہنامہ۔ چنگیزنامہ۔ غازان نامہ وغیرہ کی عدم شہرت خود بتا رہی ہے کہ یہ کتابیں کس پایہ کی ہونگی۔ اخلاق و تصوف میں بیشک بے نظیر مثنویاں تیار ہوئیں اور حالات ملک مقتضی بھی اسی کے تھے کہ یہ صنف عروج پائے اور صنف اول کو زوال ہو جیسا کہ ابتدائے باب میں لکھا گیا ہے۔ غزل کو بھی اسی زمانے میں اپنا خاص جامہ نصیب ہوا اور سوز و گداز نے اس صنف شعر پر اثر کیا۔ قطعات بھی سمجھے ہوئے دلوں کی فریادیں اور رباعیاں بھی اسی لَے میں زمزمہ سنج ہیں۔

فریدالدین عطار اس عہد میں خواجہ فریدالدین ابو طالب محمد بن ابی بکر ابراہیم بن مصطفےٰ بن شعبان مضامین تصوّف نظم کرنے میں نہایت ممتاز تھے اور عطار تخلص کرتے تھے سال ولادت ۱۱۱۹ء ہے اور مولٰینا یو مولانا روم فرماتے ہیں۔

هفت شهر عشق را عطار گشت ما هماں اندر خم یک کوچه ایم

طبیعت بچپن سے درد آشنا تھی اور اگرچہ پیشہ آبائی عطاری تھا بلکہ طبابت بھی ساتھ ساتھ تھی مگر مذاق تصوّف کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا۔ اپنا پیشہ بھی کرتے تھے اور تصوّف میں تصانیف کرتے جاتے تھے۔ خود کہتے ہیں:۔

مصیبت نامه کاندوه جهان است الٰهی نامه کاسرار عیان است
بدارو خانه هردو کردم آغاز چه گویم زود رستم زین و آں باز

کہتے ہیں کہ خواجہ صاحب کی دُوکان پر ایک روز ایک فقیر نکل آیا اور ناراض ہو کے کہنے لگا کہ کیوں بے فائدہ وقت ضائع کرتے ہو۔ آپ نے جواب دیا کہ جاؤ اپنا راستہ لو۔ اُس نے کہا "تم اپنی فکر کرو میرا جانا کیا مشکل ہے" یہ کہکے وہیں لیٹ گیا۔ خواجہ نے جو اُٹھ کے دیکھا تو واصل بحق ہو چکا تھا۔ عبرت

طاری ہوئی اور دوکان راہِ خدا میں لٹا دی اور کاروبار چھوڑ کے فقیر ہوگئے قصّہ ممکن ہے کہ آخر عمر میں پیش آیا ہو ورنہ بیشتر تصانیف آپکے دواخانے ہی میں ہوئے ہیں۔ ایک مثنوی میں اپنی سیاحی کا حال لکھتے ہیں :۔

سر برآوردہ بہ محبوبی عشق — سیر کردہ مکہ و مصر و دمشق
کوفہ و رے تا خراساں گشتہ ام — سیحوں و جیحونش را ببریدہ ام
ملک ہندوستان و ترکستاں زمین — رفتہ چوں اہل خطا از سوی چین
در نشاپورم بہ کنج خلوتے — با خدائے خویش کردم وحدتے

اِن کی بیش بہا زندگی کا خاتمہ اپنے وطن نیشاپور میں ایک مغل کی تلوار سے سنہ ۶۲۷ھ (مطابق سنہ ۱۲۲۹ء) میں ہوا اور تقریباً ۱۱۴ برس کی (بحساب سال قمری) عمر پائی۔ تصانیف میں منطق الطیر اور پندنامہ کے علاوہ اسرار نامہ۔ الٰہی نامہ۔ مصیبت نامہ۔ وصیت نامہ۔ بلبل نامہ۔ حیدر نامہ۔ گل و ہرمز۔ سیاہ نامہ۔ مختار نامہ وغیرہ بھی ہیں۔ دقائق تصوّف اس حد کے بیان نہیں کئے ہیں کہ سمجھ میں نہ آئیں اور زبان کی صفائی تو اس قدر ہے کہ گویا یہ صفت ان پر ختم ہوگئی اگرچہ پرانے تلفظ اور محاورات بھی شامل ہیں۔ قوت تخیل نے پرانے مضامین کو نیا جامہ پہنا کے بیحد زوردار کر دیا ہے :۔

می پنداری کہ جاں توانی دیدن — اسرار ہمہ جہاں توانی دیدن
ہرگاہ کہ بینشِ تو گردد بکمال — کوری خود آں زماں توانی دیدن

خواجہ صاحب کی معرفت کا اندازہ اِن اشعار سے ہوگا :۔

روزہ حفظ دل است از خطرات — پس بود یا مشاہدہ افطار
حج چہ باشد ز خود سفر کردن — بکجا؟ جانب ہدایت کار
وحی چہ بود چراغچہ در دل تو — سرزند از نتائج اسرار

منطق الطیر میں مقامات تصوّف کو تمثیل کے طور پر بیان کیا ہے۔ طائر (یا مخلوقات) کو سیمرغ (ذات الٰہی) کی تلاش ہوئی۔ ہُد ہُد (مرشد) سے اُسکے آشیانے کی خبر سُنی اور راستے کے مصائب کا اندازہ کیا۔ بلبل گُل پر عاشق ہو کے رہ گئی۔ طوطی قفس میں پھنسا۔ ہُما کو بادشاہ گری کا شوق ہوا۔ بطیں پانی کو نہ چھوڑ سکیں (دنیوی تعلقات نے بہت لوگوں کو روک لیا) کچھ طائر البتہ ہُد ہُد کو راہبر بنا کے روانہ ہوئے اور انس۔ حکمت۔ انقطاع۔ اتحاد۔ حیرت۔ تجرید اور فنا کے منازل طے کرکے مقصد تک پہونچے۔ سلسلہ سفر میں بہت سے روایات و حکایات بھی درج کئے جنسے اثر خاص پیدا ہو گیا ہے۔

مذاق طبیعت کا اندازہ ان اشعار متفرقہ سے ہوگا:۔

وصل تو گنجست ہم پنہاں زخود ۔۔۔ ہر کہ گوید یافتم دیوانہ ایست

مظاہر قدرت کی معرفت:۔

چندیں در بستہ بے کلید ست چہ سود ۔۔۔ کس نام نشان ون شنید ست چہ سود
پیراہن یوسف است یک یک ذرات ۔۔۔ یوسف زمیانہ ناپدید ست چہ سود

مذہب حقیقت مسائل کفر و اسلام سے بلند ہے:۔

لب دریا ہمہ کفر ست و دریا جملہ دینداری ۔۔۔ ولیکن گوہر دریا ورائے کفر و دیں باشد

وحدت الوجود:۔

بعیں دیدہ بنگری ظاہر ۔۔۔ صورت خویش را بصورت یار
ہر کہ اینجا ندیدہ محروم است ۔۔۔ در قیامت زلذّتِ دیدار
انا لیلی بگو اگر مردی ۔۔۔ ورنہ چوں ابلہاں مرے بیکار

دوئی را نیست رہ در حضرتِ تو ۔۔۔ ہمہ عالم توئی و قدرتِ تو
نگو گوئے نگو گفتست در ذات ۔۔۔ کہ التوحید اسقاط الاضافات
(اسم فاعل)

کمال اسمٰعیل خلاق المعانی کمال الدین محمد اسمٰعیل پسر جمال الدین عبدالرزاق اصفہانی۔ تخلص کمال۔ باپ بیٹے دونوں شاعر تھے۔ علمی اعتبار سے فضیلت کا درجہ حاصل تھا اور خاندانی حیثیت میں بھی باثر تھے۔ اصفہان کے قاضیوں کے خاندان صاعدیہ کی مدح کرتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ سلاطین کو چھوڑ کے قاضیوں کی مدح سرائی کیوں کرتے ہو۔ کہا یہ لوگ سخن فہم ہیں حالانکہ سلطان سنجر وغیرہ کی تعریف بھی کبھی کبھی کی ہے۔ ۶۳۵ھ میں اُکتائی قاآن نے اصفہان میں قتل عام کا حکم دیا۔ شہر لوٹا گیا مگر اس گوشہ نشین شاعر سے کوئی نہ بولا بلکہ لوگ امانتیں لاکے اُن کے کنوئیں میں محفوظ کر دیتے تھے۔ اتفاقاً ایک ترک بچہ ادھر نکل آیا اور ایک پرند کو غلیل سے مارنا چاہا۔ زہ گیر کنوئیں میں گر گئی۔ وہ اترا تو پورا خزانہ پایا۔ سب لوٹ لیا اور کمال سے پوچھا اور مال کہاں ہے۔ وہاں کیا تھا جو دیتے۔ آخر ظالم نے شاعر کی جان لی اور شکنجہ میں کس کے مار ڈالا۔ ریاض الشعرا میں ایک رباعی اس اخیر وقت کی لکھی ہے:۔

ایں کشتہ نگر کمال اسمٰعیل است   قربان شد نش نہ از رہ تبجیل است
قربانِ تو شد کمال اندر رہِ عشق   قربان شدن از کمالِ اسمٰعیل است

شاعری میں اسلاف کی استواری اور اخلاف کی نزاکت اور مضمون آفرینی دونوں کو جمع کیا ہے یہی وجہ ہے کہ متوسطین اور متاخرین سب ان کے معترف ہیں۔ حافظ کہتے ہیں:۔

کز باورت نمی‌شود از بندہ ایں حدیث   از گفتۂ کمال دلیلے بیاورم

حزیں کا فیصلہ باپ بیٹے کی شاعری میں یہ ہے:۔

در شعر جمال ارچہ جمالے بہ کمال است   امّا نہ بزیبائیِ افکارِ کمال است
دریوزہ گرِ رشحۂ او بیند حریفاں   الحق رگِ ابرِ قلمش بحرِ نوال است

سب سے زیادہ باعث فخر یہ ہے کہ معاصر جلیل القدر محقق طوسی نے معیار الاشعار میں کمال کی عظمت کا اعتراف کیا ہے:۔ مضمون آفرینی کے علاوہ مشکل طرحوں میں زور طبع دکھانا کمال کے لئے مخصوص ہے:۔

ہرگز کسے ندید بدینساں نشانِ برف — گوئی کہ لقمہ ایست زمیں در دہانِ برف
مانند پنبہ دانہ کہ در پنبہ تعبیہ است — اجرام کوہ گشتہ نہاں درمیانِ برف

سلاست زبان اور شیرینی ادا میں متقدمین سے آگے قدم بڑھایا ہے:۔

سپیدہ دم کہ نسیم بہار می آید — نگاہ کردم و دیدم کہ یار می آید
شراب در سر و چہرہ ز شرم رنگ آمیز — چنیں میانۂ شرم وحقار می آید
زبسکہ داشت دل خستہ بستہ در فتراک — چناں نمود مرا کز شکار می آید

ہجو کو فحش اور لغویات سے پاک کیا ہے۔ ایک بخیل کی ہجو میں کہتے ہیں:۔

بدہن نانِ خواجہ چوں بُردم — خواجہ گفتا کہ آہ من مُردم
گفتمش خواجہ میر و خواہ مَمیر — کہ من ایں لقمہ را فرو بُردم

خان آرزو کا خیال ہے کہ غزل کا پیلا خاکہ کمال نے بنایا ہے۔ معاملات عشق میں خاص لذت بھر دی ہے۔ دیکھو کیا مزے کی طبیعت پائی ہے:۔

از چشم نیمخواب تو امروز روشن است
آن نالہا کہ در غم تو دوش کردہ ایم

بود ہمیشہ۔ جانِ من! رسم تو بے گنہ کشی
ہیچ نمی کشی مرا۔ من چہ گناہ کردہ ام

چو انداز دہمن تیرے کنم در سینہ پنہا نش
بداں تا از پئے ہر تیر تیرِ دیگر اندازد

رُباعی میں جسقدر ترقی کی ہے قدما کے یہاں نہیں :-

گل خواست کہ چوں عارضش نکو باشد نیست ۔۔۔ چوں دلبر من بہ رنگ و بو باشد و نیست
صد روے فراہم آورد در سالے ۔۔۔ باشد کہ یکے چو روے او باشد و نیست

مولانا روم

جلال الدین محمد بن بہاء الدین محمد بن الحسین البکری عرف مولانا روم
سال ولادت ۶۰۴ھ مطابق ۱۲۰۷ء ہے اور مولد بلخ۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل
کی جن کا آستانہ سلطان محمد خوارزم شاہ کے زمانے میں طالبان حقیقت کا مرجع
تھا کہتے ہیں کہ اس مرجعیت پر سلطان کو حسد ہوا اور امام رازی کے ابھارنے
سے مولانا سے ناراضی کا اظہار کیا۔ وہ بھی کبیدہ خاطر ہو گئے اور بلخ سے نیشاپور
چلے گئے (۶۱۷ھ مطابق ۱۲۲۰ء) یہاں شیخ فریدالدین عطار سے ملاقات ہوئی مولانا روم
اُسوقت کمسن تھے۔ صاحب زادے کو ہونہار دیکھکے اُنھوں نے اپنا اسرارنامہ
عطا کیا اور باپ سے کہا "زود باشد کہ ایں پسر آتش در سوختگانِ عالم زند" پھر مولانا
بہاء الدین بغداد چلے گئے اور وہاں سے زیارت حرمین شریفین و سفر بیت المقدس
کرکے زنجان آئے اور پھر آق شہر اور لارندہ پہونچے۔ یہاں مولانا روم کی شادی
کی۔ لارندہ سے علاء الدین کیقباد[2] نے قونیہ بلایا اور یہیں انکی وفات (۶۲۸ھ) میں ہوئی بعض کا

---

[1] انکے تفصیلی حالات اور کلام کی کامل تنقید کے لیے مولانا شبلی کی سوانح مولوی روم سے بہتر کتاب ملنا مشکل ہے۔

[2] سلجوقیوں کی تیسری شاخ کا بادشاہ قتلمش (دیکھو صفحہ ۱۱۰) کی اولاد میں تھا۔ ۲۲۰ سال تک ان لوگوں کی سلطنت ایشیائے کوچک پر رہی جنہیں اس زمانے میں سلاجقہ روم کہتے تھے اور مولوی روم کا لقب اسی ملک میں توطن کی وجہ سے ہوا۔ اس علاء الدین کے بعد اس کا بیٹا غیاث الدین کیخسرو بادشاہ ہوا اور ۶۴۵ھ میں مر گیا۔ اسکے تین بیٹے تھے۔ علاء الدین کیقباد۔ عزالدین کیکاؤس۔ رکن الدین قلیچ ارسلان۔ پہلے دو بھائی یکے بعد دیگرے قونیہ کے حاکم رہے لیکن ۶۵۹ھ میں تاتاریوں کے پنجے میں آکے سارا خاندان ختم ہو گیا۔ معین الدین پروانہ مولانا روم کا شاگرد اور پسر خواندہ رکن الدین قلیچ ارسلان کا حاجب تھا۔

خیال ہے کہ مولانا بہاء الدین کا انتقال شام میں ہوا اور مولانا روم تنہا قونیہ گئے۔ باپ کے انتقال کے بعد مولانا روم نے بلادِ مختلفہ میں تحصیل شروع کی یہاں تک کہ انواع علوم میں کمال ہو گیا۔ جب قونیہ واپس آئے تو وہاں علوم ظاہری و باطنی کے مرجع ہو گئے۔ حضرت شمس تبریزی جو فرقۂ اسمٰعیلیہ کے امام کیا بزرگ کی اولاد میں تھے یہاں (۶۴۲ھ) میں آ کے مولانا سے ملے اور انھیں اپنا مرید بنایا۔ شہر میں غوغا ہوا کہ ایک دیوانے نے مولانا روم پر سحر کر کے تسخیر کر لیا اور ایسی شورش بڑھی کہ شمس اپنے وطن تبریز چلے گئے۔ مولانا کو انکے فراق کا اتنا صدمہ ہوا کہ سب سے ملنا جلنا ترک کر دیا اور اپنے پیر کے ہجر میں نہایت دردناک شعر کہے (ا)۔ آخر مولانا نے شمس کو بڑی مشکل سے پھر بلایا مگر مولانا کے صاحبزادہ علاء الدین چلپی کو ان سے کچھ شکایت ہو گئی چنانچہ شمس تبریز ایسے ناراض ہو گئے کہ پھر واپس نہ آئے (بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہیں قونیہ میں مولانا کے مریدوں نے یا علاء الدین چلپی نے ۶۴۵ھ مطابق ۱۲۴۷ع میں قتل کر ڈالا)۔ بہر تقدیر شمس تبریز کے فراق نے انکا سوز و گداز اور بڑھا دیا اور اسی عالم وارفتگی میں زبان پر اشعار جاری ہونے لگے جنکا مجموعہ مثنوی مولانا روم ہے۔ تاتاریوں کا حملہ اسی زمانے میں روم پر ہوا مگر مولانا کی عظمت سے متاثر ہو کے وہ لوگ ہٹ گئے اور قونیہ کو تباہ نہ کیا۔ شمس تبریز کے بعد شیخ صلاح الدین زرکوب کے ساتھ گوشۂ تجرید میں بیٹھنا شروع کیا اور انکی شان میں غزلیں کہیں:۔

مطربا اسرار ما را باز گو — قصہ ہای جانفزا را باز گو
ما دہاں بر بستہ ایم از ذکر او — تو حدیث دلکشا را باز گو
چوں صلاح الدین صلاح جان ماست — آن صلاح جانہا را باز گو

شیخ صلاح الدین کی بیٹی سے مولانا کے بیٹے سلطان ولد کا عقد ہوا اور رشتہ ظاہری

ا؎ مولانا روم کے صاحبزادے سلطان ولد نے یہ واقعہ اور اسکے بعد کے واقعات اپنی مثنوی میں نظم کئے ہیں۔

بھی قائم ہوگیا۔ صلاح الدین کے انتقال (۶۶۴ھ) کے بعد اپنے مرید حسام الدین چلپی کو ہمراز بنایا۔ انکو اپنی مثنوی میں بھی اکثر یاد کیا ہے :۔

ای ضیاء الحق حسام الدین بیار — این سیم دفتر کہ سنت شد سہ بار

مدتے این مثنوی تاخیر شد — سالہا بایست تا خون شیر شد

آخر ۶۷۲ھ (مطابق ۱۲۷۳ء) میں انتقال ہوگیا اور حسام الدین انکے خلیفہ ہوئے۔ انکے بعد مولانا کے بیٹے سلطان ولد سجادہ نشین ہوئے اور انکے مریدوں کا فرقہ جلالیہ کہلایا۔ بعد کو یہ لوگ مولویہ کہلانے لگے۔ رقص و سماع اس فرقے کے لئے مخصوص ہیں۔ کلام کی تنقید سوء ادب سے ہے خصوصاً مثنوی جو اس وقت تک مقبول خلائق ہے۔ کسی نے کہا ہے :۔

مثنوی مولوی معنوی — ہست قرآں در زبان پہلوی

من نمیگویم کہ آں عالیجناب — ہست پیغمبر و لے دارد کتاب

صاحب آتشکدہ کے نزدیک اس مثنوی میں "علم الیقین کو بواسطہ علم الیقین مرتبۂ عیانی تک پہونچادیا" اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اسرار معارف و رموز حقائق کو جس جذب کامل و جوش سرمستی کے عالم میں مولانا نے نظم کیا ہے اُس کا جواب تاریخ عالم میں نہیں ملتا۔ صاحب مجمع الفصحا کی رائے بھی یہی ہے کہ "دُنیائے شعر میں شاہنامہ اور مثنوی ایسی بے نظیر کتابیں ہیں جنکا جواب ناممکن ہے" (دیکھو صفحہ ۹۴) اکثر مقبول کتابوں کے متعلق دیکھا ہے کہ عام فہم اور سلیس ہونیکی وجہ سے مشہور ہوئیں پھر خواص کو التفات ہوا اور اگر قابل قبول ہوئی تو مقبول خاص و عام ہوگئی والا فلا۔ مثنوی معنوی میں اسقدر دقیق باتیں ہیں کہ خاص لوگ بھی مشکل سے سمجھتے ہیں مگر پھر بھی شہرت اور مقبولیت ایسی ہے کہ حد نہیں۔ خدا جانے اس میں کیا راز ہے؟ اس کتاب کی تصنیف حسام الدین چلپی کی فرمایشوں کی وجہ سے دس برس

میں ہوئی ہے چنانچہ ہر دفتر کے آغاز میں اس امر کی طرف اشارہ ہے چھٹا دفتر ناتمام تھا کہ مولانا بیمار پڑ گئے خیال ہوا کہ کوئی اور سوختہ دل اُسے تمام کرے گا مگر اتفاق سے اچھے ہو گئے اور تمام کیا بلکہ ساتواں دفتر بھی نظم کیا چنانچہ کہتے ہیں:۔

ای ضیاء الحق حسام الدین فرید　　دولتت پائندہ فقرت بر مزید
چونکہ از چرخ ششم کردی گزر　　بر فراز چرخ ہفتم کن سفر
سعد اعداد است ہفت اے خوش نفس　　زانکہ تکمیل عدد ہفت است و بس

اس میں شک نہیں کہ مولانا کے سامنے منطق الطیر اور حدیقہ سنائی دونوں کتابیں موجود تھیں اور آن سے فیض پایا ہے خود فرماتے ہیں:۔

ترک جوشی کردہ ام من نیم خام　　از حکیم غزنوی بشنو تمام
در الہی نامہ گوید شرح ایں　　آں حکیم غیب و فخر العارفیں

سنائی ۱۲ — عطار ۱۲

بلکہ بعض اشعار بھی ان کتابوں سے لیکے اور بحر بدل کے اپنی مثنوی میں داخل کئے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ جو سکندر نامہ کو شاہنامہ سے نسبت ہے وہی ان کتابوں کو مثنوی سے مناسبت ہے۔ اہل تصوّف عارف کہنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ حدیقہ کے اشعار دیکھو:۔

نالۂ نے زدرد خالی نیست　　شوق از روے زرد خالی نیست
بے زباں گوش را خبر کردہ　　بے بیاں ہوش را خبر کردہ
از دمش شعلہا ہمی خیزد　　چہ عجب گر نئے آتش انگیزد

مولانا کہتے ہیں:۔

بشنو از نے چوں حکایت میکند　　وز جدائیہا شکایت میکند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق　　تا بگویم شرح درد اشتیاق

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش | باز جوید روزگارِ وصلِ خویش
من بہر جمعیتے نالاں شدم | جفتِ خوشحالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من | وز درونِ من نجست اسرارِ من
سرِ من از نالۂ من دور نیست | لیک چشم و گوش را آں نور نیست
تن ز جان و جاں ز تن مستور نیست | لیک کس را دیدِ جاں دستور نیست

مولانا کی شاعری پر اگر بالاستیعاب نظر ڈالی جائے تو خلِ اضافات۔ تعقیداتِ لفظی۔ الفاظِ غیر مانوس و ثقیل وغیرہ اس امر کے شاہد ہیں کہ فن کی نزاکتوں سے انھیں کوئی واسطہ نھیں۔ انکا کلام سحر نھیں ہے کہ اسباب و آلات کا محتاج ہو۔ یہ ایک کرامت ہے جو ان کی ذات سے مخصوص ہوگئی ہے۔

ملتِ عشق از ہمہ مذہب جداست | عاشقاں را مذہبِ ملت خداست
گر باستدلال کارِ دیں بدے | فخر رازی رازدارِ دیں بدے

اکثر غلط حکایات و روایات (جو انکے زمانے میں مشہور تھے) نظم کردیے ہیں جسکا اعتراف خود کو بھی ہے:۔

ای برادر قصہ چوں پیمانہ ایست | معنی اندر وے بساں دانہ ایست
گفت نحوی زید عمرواً قد ضرب | گفت چونش کرد بیجرمے ادب
عمرو را جرمش چہ بد کاین زید خام | بیگناہ او را بزد ہمچو غلام
گفت ایں پیمانۂ معنی بود | گندمش بستاں کہ پیمانہ است رد

یعنے جس طرح زید و عمر کے نام مثالاً بغرض اثبات اعراب لئے جاتے ہیں حالانکہ زید ضارب ہے نہ عمر و مضروب اسی طرح یہ قصص و روایات ہیں کہ اثباتِ نتائجِ حقیقت کے لئے اختیار کئے گئے ہیں نہ کہ تاریخ بیان کرنیکے لئے۔ ایک اور خصوصیت مثنوی میں یہ ہے کہ اسکا استدلال اکثر قیاس و استقرا سے قطع نظر کرکے تمثیل کی صورت میں

ہوتا ہے کیونکہ اپنے ہم جنس کا حال سن کے سمجھنا بھی آسان ہوتا ہے اور اتباع کی طرف بھی رغبت پیدا ہوتی ہے تمثیل ڈھونڈھنا بیشک مشکل ہے کیونکہ اس کے لیے تخیل کی کمال قوت درکار ہے ۔ مولانا کی قوت متخیلہ ان مشکلوں پر ہمیشہ غالب آجاتی ہے اور بے مثل تمثیلیں تلاش کر لیتے ہیں ۔ مباحث کلامیہ اور اصول اخلاقیہ کو بھی اپنے مذاق میں ڈھال لیا ہے اور بڑے بڑے دشوار راستوں سے نکل کر تصوف اور علوم باطن کا تفوق بدیہی طور سے ثابت کر دیتے ہیں ۔

دیوان کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ یہ مجموعہ جو شمس تبریز کے نام سے مشہور ہے سب مولانا روم کا ہے جس کی غزلیں کہیں بطور خطاب اور کہیں تبرکاً اپنے مرشد کے نام سے مزین کی ہیں ۔ اس وقت تک جن شعرا نے مضامین عشقیہ نظم کیے تھے ۔ ان کے دل چوٹ کھائے ہوئے نہ تھے تصوف نے عشق حقیقی کا راستہ پیدا کر کے اہل باطن میں ایک خاص ذوق پیدا کر دیا تھا جس کی وجہ سے مولانا کی غزلیں محفل سماع کی زینت ہونے لگی تھیں اور چونکہ عشق مجازی سے لگاؤ نہ تھا اس لئے معاملہ بندی وغیرہ میں قاصر نظر آتی تھیں ۔ اکثر غزلیں مسلسل ہیں اور زبان و عنوان ادا کے اعتبار سے اتنی شیریں اور خوشگوار نہیں کہ سعدی اور حافظ کے مقابلے میں پیش کی جائیں ۔ معرفت کی کھلی راہیں ہیں جو اہل معرفت کے لئے مخصوص ہیں ۔ چند موثر اشعار نقل کیے جاتے ہیں :۔

یار کہ آمد زدر ۔ خلوتیان ! دوست دوست

دیدہ غلط می کند ۔ نیست غلط ! اوست اوست

واردات قلبی کا اظہار ہے اور اتنی ہی جتنی گذری ہے ۔ ایک مرتبہ خیال آگیا کہ اگر معشوق کسی پر عاشق ہو جائے تو لطف ہے ۔ ایک غزل

اسی خیال میں کہہ ڈالی :-

ای خداوند یکے یار جفاکارش دہ   دلبر عشوہ گر و سرکش و خونخوارش دہ

چند روزے زپئے تجربہ بیمارش کن   با طبیباں دغا پیشہ سروکارش دہ

تا بداند کہ شب ما بچساں میگذرد   درد عشقش دہ و عشقش دہ و بسیارش دہ

مقام فنا میں سالک پر خضوع و خشوع کی حالت طاری ہوتی ہے اور مقام بقا میں جلال و عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ اس عالم میں مولانا کے اشعار عجیب رنگ میں ہو گئے ہیں :-

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند   فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

اسم فاعل   اسم فاعل   اسم فاعل

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم   چو غلام آفتابم ہمہ آفتاب گویم

بنمودے نشانے ز جمال دوست لیکن   دو جہاں بہم برآید سر شور و شر ندارم

گفتیم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما   گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

ای بلبل سحر گہ ما را بپرس گہ گہ   آخر تو ہم غریبی ہم از دیار مائی

رباعی کا انداز دیکھو :-

در مذہب عاشقاں قرارے دگر ست   ویں بادۂ ناب را خمارے دگر ست

ہر علم کہ در مدرسہ حاصل کردیم   کارے دگر ست و عشق کارے دگر ست

آخری خصوصیت انکے کلام کی یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ مولانا پہلے شاعر ہیں جنکی زبان امرا کی ستائش یا بیہودہ ہجو سے آلودہ نہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ دور از کار باتیں انکے کلام میں بالکل نہ ملیں گی۔ نثر میں ایک کتاب فیہ مافیہ

معین الدین پروانہ کو مخاطب کر کے لکھی تھی جو نایاب ہے اسی طرح ایک مجموعہ خطوط بھی تھا جو نہیں ملتا۔

سعدی

شیخ شرف[1] الدین بن مصلح الدین عبد اللہ۔ انکے والد اتابک سعد[2] بن زنگی والی شیراز (۱۱۹۵ع تا ۱۲۲۶ع) کے ملازم تھے اسوجہ سے سعدی تخلص اختیار کیا۔ سال ولادت غالباً ۵۸۹ھ (مطابق ۱۱۸۴ع) ہے اور مولد شیراز شیخ کے حالات تفصیلی طور سے کسی تاریخ میں درج نہیں۔ البتہ خود اُنکے تصانیف میں جا بجا آ گئے ہیں جنسے اچھا ذخیرہ تیار ہو سکتا ہے۔ دارالعلم شیراز میں درس و تدریس کا بہت موقع تھا خصوصاً مظفر الدین تکلہ بن زنگی المتوفی ۵۹۱ھ کا مدرسہ مجمع علما و فضلا تھا مگر ان کی تعلیم نظامیہ بغداد میں ہوئی اور ابن جوزی سے بھی شہر بغداد ہی میں حدیث پڑھی جب تصریح دولتشاہ تیس برس طالب علمی کی تیس برس سیاحت اور تیس برس عبادت۔ انھیں سیاحتوں کے دوران میں پانچ بار حج کیا اور شہاب الدین سہروردی کے

۱؎ عوام میں مصلح الدین مشہور ہیں اور انڈیا آفس کے ایک نسخۂ قدیم میں جو سعدی کے ۳۶ برس بعد کا لکھا ہوا ہے مشرف الدین درج ہے۔ ۲؎ یہ خاندان بھی سلجوقیوں کا قائم کیا ہوا تھا سعد زنگی اس سلسلے کا پانچواں حکمراں تھا۔ ۶۳۵ھ میں اسکا انتقال ہوا اور اسکا بیٹا ابوبکر سعد تخت نشین ہوا۔ اسکے زمانے میں صوبۂ فارس نہایت امن و امان کی حالت میں ہو گیا جب اسکا بھی انتقال ہوا تو محمد بن ابی بکر اسکا بیٹا دارالسلطنت میں موجود نہ تھا۔ باپ کی موت کی خبر سنکر شیراز کو چلا مگر راہ میں انتقال ہو گیا اور اُسکا صغیر السن بیٹا بادشاہ ہوا مگر وہ بھی دو برس سات مہینے کے بعد مر گیا آخر محمد بن سلغر بن سعد حکمراں ہوا۔ اسکی سفاکی سے لوگ عاجز آ گئے اور آٹھ مہینے بعد ہلاکو خاں کے پاس گرفتار کر کے بھیجدیا۔ پھر اس کا بھائی حکمراں ہوا اور وہ بھی ۶۶۳ھ میں مر گیا۔ اب خاندان میں کوئی مرد باقی نہ رہا لہذا آتش خاتون دختر سعد کی حکومت ہوئی۔ اسنے ہلاکو کے بیٹے منگو تیمور سے شادی کر لی اور ۶۸۶ھ میں مر گئی۔ اسکے بعد شیراز اور فارس براہ راست تاتاریوں کی زیر حکومت آ گیا اور انگیانو والی مقرر ہوا۔

مرید ہوئے پھر ہند وشام وبلقان ہوتے ہوئے بلاد روم میں پہونچے جہاں مولانا روم سے ملاقات ہوئی (امیر خسرو سے ہند میں ملاقات ثابت نہیں۔ ہاں اتنا معلوم ہوتا ہے کہ امیر صاحب کا کلام سن کے پسند کیا تھا)۔ فترت تاتاریہ کے زمانے میں خواجہ شمس الدین جوینی اور علاء الدین جوینی ان کے بڑے قدردان تھے اور اباقہ (اباقاآن خاں) تک رسائی بھی انھیں کی وجہ سے ہوئی بلکہ آزاد ملنشی نے ان کی شان اُس دربار میں بہت بڑھادی تھی۔ بادشاہ نے اشعار سننا چاہے تو آپنے کہا:-

شہے کہ حفظ رعیت نگاہ می دارد　　حلال باد خراجش کہ مزد چوپانی است

دگرنہ راعی خلق است زہر مارش باد　　کہ ہرچہ میخورد از جزیت مسلمانی است

بادشاہ نے باربار پوچھا کہ میں راعی ہوں یا نہیں ہر مرتبہ یہی جواب دیا کہ آپ ہیں تو پہلا شعر حسب حال ہے ورنہ دوسرا (شعر العجم جلد دوم)۔ آخر عمر میں شیخ نے زاویہ نشینی اختیار کرلی اور ارغون خاں کے زمانے میں ۱۰۲ برس کی عمر پاکے ۶۹۱ھ (مطابق ۱۲۹۲ء) میں انتقال کیا۔ ایک مقام دلکشا نام تھا وہاں مزار بنا جو سعدیہ کہلاتا ہے اور زیارت گاہ عجم ہے۔

شیخ کے تصانیف میں گلستاں کا ذکر ہو چکا ہے جو صاحب مجمع الفصحا کے نزدیک فارسی لٹریچر کی چار نایاب کتابوں میں ہے (باقی تین کتابیں شاہنامہ۔ مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ ہیں) بلکہ نثر میں یہی تنہا کتاب بے نظیر ہے۔ اسکی شیرینی ادا اور لطف بیان نے آدبائے یورپ کو بھی تسخیر کرلیا ہے چنانچہ پروفیسر ویمبری۔ سرگور اوسلی۔ سرایڈون آرنلڈ وغیرہ اسکی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ بوستاں ایک مثنوی ہے جس کی سادگی توصیف سے بالاتر ہے بلکہ سہل ممتنع کی نظم میں اگر مثال ہے تو یہی۔ بچے سے لیکے بوڑھے تک ان دونوں کتابوں کو بلاد اسلامیہ وغیر اسلامیہ میں پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں۔ فلسفۂ اخلاق کے مفید مسائل ایسے

سہل اور شیریں کردیئے ہیں کہ دل میں جگہ کر لیتے ہیں اور زبانوں پر ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ قصے بھی تمثیل کے طور پر بیان ہوئے ہیں اور نہایت پُر لطف ہیں حضرت ابراہیم نے ایک کافر کو دسترخوان پر سے اٹھادیا وحی ہوئی کہ

منش داد صد سال روزی و جاں　　ترا نفرت آید از و یک زماں

کس قدر عمدہ صلح کل کی تعلیم ہے۔ قناعت اور اسکے ساتھ خودداری کی تعلیم دیکھو۔ عنوان ادا ایسا ہے کہ قلب کو تسکین ہوتی ہے:۔

قناعت کن ای نفس بر اندکے　　کہ سلطان و درویش بینی یکے
گر آزادۂ بر زمیں خسپ و بس　　مکن بہر قالی زمیں بوس کس

تربیت کے متعلق آجکل یہ خیال ہے کہ بید وغیرہ نہ مارنا چاہیئے بلکہ اگر ممکن ہو تو ڈانٹنا بھی نہیں چاہیئے۔ شیخ نے معلم کی زبانی تو یہ کہا کہ "جور استاد بہ مہر پدر" مگر خود یہ تعلیم دیتے ہیں:۔

نکو آموز را ذکر تحسین و زہ　　ز توبیخ و تہدید استاد بہ

یاد دلانا اور شاباش کہنا ۱۲

صنعت و حرفت کی تعلیم کو بھی جزو تکمیل سمجھتے ہیں۔

بیاموز پرورده را دست رنج　　وگر دست داری چو قارون بگنج
بپایاں رسد کیسۂ سیم و زر　　نگردد تہی کیسۂ پیشہ ور

(صنعت)

بے تعصبی کی مثالیں بھی شیخ کے کلام میں بکثرت ہیں اور ایسے صوفی منش بزرگ سے یہی اُمید بھی کی جاتی ہے۔ بدگوئی کی ممانعت بالکل نادر طرز میں کی ہے:۔

بد اندر حق مردم نیک و بد　　مگو اے جوانمرد صاحب خرد
کہ بد مرد را خصم خود میکنی　　وگر نیک مرد است بد میکنی

زاہدان ترشخو اور عارفان ریاکار سے بے حد ناراض ہیں۔ اخلاقی زندگی میں ہمیشہ عمل کو ترجیح دیتے ہیں اور وہ دور از کار باتیں نہیں بیان کرتے جو مایوس کن ہیں

یا فطرت انسانی کے مقتضیات کے بالکل خلاف جاتی ہیں۔ یہ کامل تعلیم اس وجہ سے ہے کہ شیخ نے حدیث[1] و تفسیر وغیرہ کو بھی سمجھ لیا تھا اور اُسکے فیض سے جو اثر پایا ہے اُسی سے اپنے کلام کو موثر بنایا ہے۔ بلیشتر احادیث حضرت رسولؐ اور کلمات علی بن ابی طالب علیہ السلام و ائمہ کبار کے لفظی ترجمے کر دئے ہیں جن کی نورانیت نے شیخ کے کلام کو ابدی جلوہ دیدیا ہے بلکہ جس مقام پر اِن تعلیمات قدسیہ سے ہٹ گئے ہیں اور اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں وہاں مورد اعتراض بھی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

زنِ نو کن اے دوست ہر نوبہار — کہ تقویم پارینہ ناید بکار

شیخ کی نظر معمولی واقعات پر عارفانہ پڑتی ہے اور دنیا کی ہر چیز سے ایک عبرت کا سبق حاصل کرتے ہیں:۔ اپنے بچپن کا حال لکھا ہے :۔

بُدر کرد ناگہ یکے مشتری — بشیرینی از دستم انگشتری
چو نشناسد انگشتری طفل خُرد — بشیرینی از وے تواتند برد
تو ہم قیمت عمر نشناختی — کہ در عیش شیریں بر انداختی

ایک مقام پر کہتے ہیں :۔

زدم تیشہ یک روز بر تلّ خاک — بگوش آمدم نالۂ دردناک
کہ زنہار اگر مردی۔ آہستہ تر! — کہ چشم و بنا گوش و روی است و سر

قصائد و قطعات کی بھی یہی حالت ہے کہ مواعظ و نصائح کا سرچشمہ بنے ہوئے ہیں اور لطف ادا اور فصاحت خداداد کا سچا نمونہ۔ کہیں کہیں مناظر قدرت کی تصویریں کھینچی ہیں اور وہ بھی سچی :۔

---

[1] تعجب ہے کہ باوجود اس فضل و کمال کے اکثر حدیثیں ضعیف اور موضوع بھی نقل کر دی ہیں اور تاریخی غلطیاں بھی گلستان و بوستاں میں نظر آتی ہیں۔

بامداداں کہ تفاوت نکند لیل و نہار   خوش بود دامنِ صحرا و تماشای بہار
آدمی زادہ اگر در طرب آید چہ عجب   سرو در باغ برقص آمدہ و بید و چنار
ژالہ بر لالہ فرود آمدہ ہنگامِ سحر   راست چوں عارضِ گلبوی عرق کردہ یار
گو نظر باز کن و خلقتِ نارنج ببیں   ای کہ باور نہ کنی فی الشجر الاخضر نار

اُمرائے وقت کی مدح سرائی بھی کبھی کبھی کر دیتے ہیں نہ کرتے تو کیا کرتے۔ زمانے کا رنگ یہی تھا مگر بیجا مبالغات کے قصور کا اعتراف بھی ہے اگرچہ ایسے قصور شاذ و نادر ہوئے ہیں۔ بلکہ حق یہ ہے کہ بیجا خوشامدیوں کی آلودگی سے اپنے دامن کو بہت بچاتے ہیں مستعصم باللہ کے قتل پر جو مرثیہ کہا ہے اُس میں اپنے دردِ دل کا پورا ثبوت دیا ہے۔ بادشاہِ وقت قاتلوں کا شریک تھا۔ اُس کا ڈر بھی ہے۔ تعریف میں شعر بڑھاتے ہیں معلوم نہیں تقیہ ہے یا ہجو ملیح :-

مصلحت[۱] بود اختیارِ رای روشن بینِ او   زیر دستاں را سخن گفتن نشاید جز چنیں

غزل گوئی کے موجد شیخ سعدی سمجھے جاتے ہیں۔ زبان کو تو زمانہ خود صاف کر لایا تھا۔ چوٹ کھائے ہوئے دل بھی فترت تاتاریہ کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے شیخ خود بھی حسن پرست اور عاشق مزاج تھے۔ اُنھوں نے یہ ایجاد کی کہ تشبیبِ قصیدہ سے عشقیہ اشعار کو جدا کر کے ایک الگ صنف قرار دے دیا۔ اُن کی غیرتِ عشق قبول نہیں کرتی کہ معشوق کی تعریف کے بعد کسی اور کی تعریف کی جائے۔ خود کہتے ہیں :-

دعویِ عشق حرام است براں بیہدہ گوی   کہ چو دہ بیت غزل گفت مدیح آغازد
مرحبا ہمت سعدی و سخنگو یئے او   کہ ز معشوق بہ ممدوح نمی پردازد

عشق اک آگ تھی جو شیخ کے قلب میں بھڑکتی تھی۔ عالمِ مجاز کے واقعات نے

---

[۱] یعنے ہلاکو کو مدد کسی مصلحت سے دی ہوگی اور ہم رعایا کیا کہہ سکتے ہیں۔

طبیعت میں سوز و گداز بھر دیا تھا۔ عالمِ حقیقت میں آئے تو وہ شعلے اور تیز ہو گئے۔ موسم بہار میں بلبل کے نغمے سنے اور بے چین ہو گئے۔ مُنہ سے نکل گیا :۔

خبرِ ما برسانید بمرغانِ چمن　　　　که ہم آوازِ شما در قفسے افتاد ست

کبھی اپنی بیتی یوں سناتے ہیں :۔

سعدیا! نوبتیؔ امشب دہلِ صبح نکوفت　　　　یا مگر صبح نباشد شبِ تنہائی را

اور سنئے :۔

سعدیا! ایں ہمہ فریاد تو بے چیزے نیست　　　　آتشے ہست کہ دود از سرِ آن می آید

پچھلے شاعروں کی غزل میں یہ سوز و گداز کہاں سے آتا؟ شیخ پر جو گذری وہ اُن پر کب گذری؟ سعدی کیا کہتے ہیں :۔

حدیثِ عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عمر　　　　بسر نکوفتہ باشد درِ سرائے را

اس سرائے کی تنکیر کا لطف دیکھنا! اگر معشوق یا دوست کہدیتے تو یہ بات نہ رہتی۔ اُن کو تو بعض وقت یہ بھی کہتے اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں جورِ محبوب سے فریاد کرتا ہوں۔ جس عالم میں خود ہیں وہاں ظالم و مظلوم کے درمیان اتنا اتحاد ہے کہ دوئی کو راہ نہیں۔ جو معشوق کے جور و جفا کے شکوہ پرداز ہیں وہ فنا فی المعشوق نہیں ہوئے :۔

ہمہ از دستِ غیر نالہ کنند　　　　سعدی از دستِ خویشتن فریاد

سچ یہ ہے کہ غزل کی پیغمبری انھیں کے لئے ہے (دیکھو صفحہ ۹۳) طول کا خوف اگر نہ ہوتا تو جی بھر کے لکھتا۔ تبرکاً چند شعر اور لکھے جاتے ہیں :۔

بمن ایں نظر حرام است و بسے گناہ دارم
چہ کنم نمی توانم کہ نظر نگاہ دارم

ـــــــــــــــ

؎۱ اگلے زمانہ میں پانچوں وقت نوبت بجتی تھی اب بھی حسین آباد مبارک (لکھنؤ) میں صبح و شام نوبت بجتی ہے۔

ستم از کسے است برمن کہ ضرورت است بردن
نہ قرارِ زخم خوردن نہ مجالِ آہ دارم
چہ شب است یارب امشب کہ ستارہ بر آمد
کہ دگر نہ عشقِ خورشید و نہ مہرِ ماہ دارم

اسی شوریدہ سری نے گلستان کے دامن پر باب پنجم کا داغ لگا دیا ورنہ وہ پاکیزہ کتاب اس قابل نہ تھی کہ ایسے واقعات درج ہوتے۔
شیخ نے عربی میں بھی قصائد کہے ہیں اور ایک مختصر پند نامہ بھی جو فارسی میں بچوں کے لئے نظم ہوا ہے انھیں کی طرف منسوب ہے کسی نے تعرضاً کہا کہ رزمیہ اشعار نظم نہیں کر سکتے۔ فوراً چند اشعار نظم کئے جو بوستاں میں شامل ہیں :-

ہماندم کہ دیدیم گردِ سپاہ — زرہ جامہ کردیم و مغفر کلاہ
چو ابر اسپ تازی برانگیختیم — چو باراں بلا لک فرو ریختیم
دو لشکر بہم بر زدند از کمیں — تو گفتی زدند آسماں بر زمیں
ز بار یدنِ تیر ہمچوں تگرگ — ز ہر گوشہ برخاست طوفانِ مرگ
بصیدِ ہزبران پرخاش ساز — کمند اژدہائے دہن کردہ باز
زمیں آسماں شد ز گردِ کبود — چو انجم درو برق و شمشیر و خود

دیکھو! زورِ طبیعت خوب دکھایا ہے مگر فردوسی اور نظامی والی بات کہاں :-

برانگیختم گرد ہیجا چو دود — چو دولت نباشد تہور چہ سود

واقعاً ان کے لئے میدانِ رزم میں قدم رکھنا تہورِ محض ہے عشقیہ اور وعظیہ کلام کے بادشاہ ہیں۔ ایک یورپین نے مجھ سے کہا تھا کہ اسلام کی جو تعلیم سعدی نے نظم کردی ہے اس سے بہتر کسی مذہب میں شاید ہی ملے گی :-

چو بینی یتیمے سر افگندہ پیش — مدہ بوسہ بر روی فرزند خویش

اور تعلیم کو قوی یوں کر دیا ہے۔

مرا باشد از دردِ طفلاں خبر　　　　　کہ در طفلی از سر برفتم پدر
از سر من برفت

رباعیاں بیشتر وعظیہ ہیں اور خوب ہیں :۔

دورانِ بقا چو بادِ صحرا بگذشت　　　　　تلخی و خوشی و زشت و زیبا بگذشت
پنداشت ستمگر کہ جفا بر ما کرد　　　　　برگردنِ او بماند و بر ما بگذشت

قانعی　قانعی طوسی تاتاریوں کی شورش سے خوف زدہ ہو کر ہندوستان چلا گیا اور وہاں سے عدن ہوتا ہوا حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوا پھر بغداد گیا اور وہاں سے قونیہ پہونچا سلجوق روم کی بارگاہ میں رسائی ہوئی اور خطاب ملک الشعرائی پایا مولانا روم کا مرثیہ اس نے نظم کیا ہے کہتے ہیں اس کے دیوان میں تین لاکھ شعر تھے ۔

پوربہائے جامی　پوربہائے جامی صاحب دیوان شمس الدین جوینی کا شاعر تھا۔ زلزلۂ نیشاپور کے حال میں ایک مشہور قصیدہ یادگار ہے لیکن شاعرانہ اعتبار سے کوئی خاص بات اُس میں نہیں جو نقل کیا جائے۔ کسی کا ایک دانت ٹوٹ گیا تھا۔ تسلّی کے لئے یہ رباعی کہدی :۔

گر شد گہرے ز درج نوشینت کم　　　　　در حسن نگشت ہیچ تمکینت کم
صد ماہ ز اطرافِ رخت می تابد　　　　　گو باش ستارۂ زیر وینت کم!

امامی و مجد ہمگر　امامی ہروی ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر بن عثمان المتوفی ۶۶۷ھ (مطابق ۱۲۶۹ء) اتابکانِ فارس کے شعرا میں سر بلند تھا۔ مجد الدین ہمگر سے پوچھا گیا کہ سعدی اور امامی دونوں میں کون بہتر شاعر ہے۔ جواب دیا :۔

ما گرچہ بنطق طوطئ خوش نفسیم　　　　　بر شکّرِ گفتہ ہای سعدی مگسیم
در شیوۂ شاعری باجماعِ امم　　　　　ہرگز من و سعدی بامامی نرسیم

امامی نے سُنا تو یہ کہا :-

درصدرِ بلاغت ارچہ بادست رسم   درعالمِ نظم ارچہ مسیحا نفسم
دانم کہ بخاکِ درِ دستورِ جہاں   سحبانِ زمانہ مجدِ ہمگر نہ رسم

سعدی کو یہ سُن کے نہایت رنج ہوا۔ غور کرو تو سعدی پر صریحی ظلم تھا کہ اس کا نام بھی کسی ایسے شاعر کے ساتھ لیا جاتا نہ کہ امامی سے کم درجہ قرار پاتا۔ شیخ نے بھی تعریضاً کہا :-

ہرکس کہ بپائگاہ سامی نرسد   از بخت بد و سیاہ کامی نرسد
ہمگر چو بعمر خود نکردست نماز   آری چہ عجب گر بہ امامی نرسد

اب ہم امامی کے چند بہترین اشعار نقل کرتے ہیں۔ قصیدے کی حد دیکھو:- امامی و مجد ہمگر

سحرگہ در جہانِ جاں بعونِ مُبدعِ اشیا (پیدا کرنے والا)   مسافت قطع می کردم ز لا تا حضرتِ اِلاّ
جہاں را مرکزی دیدم محیطش دورِ پرکاری   کہ کروے آخر ہر دو را ز دورِ دگر مبدا
کواکب را چناں دیدم رواں بر صفحۂ گردوں   کہ از سیماب گوئے چند در میدانے از مینا
یکے چوں کاسۂ سیمیں میانِ نیلگوں وادی   یکے چوں زورقِ زریں درونِ نیلگوں دریا

سلاست بھی کبھی کبھی آجاتی ہے جس کا نمونہ اِس قصیدے سے معلوم ہوگا:-

یک روز بود عید بہ یکسال یہ یکبار   ہموارہ مرا عید ز دیدار تو ہموار
یک روز بشاخ اندر پُربار بود گُل   روی تو مرہست ہمیشہ گُلِ پُر بار
یکہفتہ پدیدار بود نرگسِ دشتی   آن نرگس چشم تو ہمہ سالہ بدیدار

بس جسقدر کلام امامی کا دیکھا اِنھیں دو رنگوں میں ہے کجا سعدی کجا امامی۔

مجد ہمگر اور بھی پست ہیں :-

چو عکسِ روئے تو پرتو بر آسماں انداخت   زمانہ رایدِ خورشید در کماں انداخت
جہاں ز زحمتِ تاریکیٔ شب ایمن شد   چو آفتابِ رُخت سایہ بر جہاں انداخت

فزود رونقِ بُتانِ عارضت کامسال　　بنفشہ سایہ براطراف ارغواں انداخت

یہ تشبیب ایک بہترین قصیدے کی ہے جس میں اظہار تغزل کیا گیا ہے۔ رباعیاں بھی کہی ہیں۔ بعض فحش ہیں بعض صاف۔ مذاق طبیعت کا اندازہ اس رباعی سے ہوگا:۔

درعشق تو کس تاب نیارد جز من　　درشورہ کسے تخم نکارد جز من

با دشمن و یا دوست بدت میگویم　　تا ہیچکست دوست ندارد جز من

بہترین رباعی یہ ہے:۔

تا کی عمرت بخود پرستی گزرد　　یا در غم نیستی و ہستی گزرد

آن عمر کہ مرگ باشد اندر پئے آن　　آں بہ کہ بخواب یا بمستی گزرد

عراقی ۶ **عراقی**۔ فخر الدین ابراہیم ہمدانی کا نام تصوف کی شاعری میں اس دور کی آخری یادگار ہے۔ قرآن مجید کا ناظرہ اور حافظہ ختم کرنے کے بعد کوئی سترہ برس کی عمر ہوگی کہ قلندروں کے ایک گروہ سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک قلندر ایسا پسند آیا کہ اُس کے ہمراہ ہندوستان آئے اور یہاں **شیخ بہاء الدین زکریا** کے مریدوں میں شامل ہوئے۔ حسب دستور چلّہ کشی کے لئے بیٹھے لیکن دسویں ہی دن مریدوں نے شیخ سے شکایت کی کہ نیا مرید بجائے اذکار و اوراد کے اپنی ایک غزل گایا کرتا ہے جو تمام اوباشوں میں مشہور ہو گئی ہے۔ شیخ نے بلوا کے وہ غزل سُنی۔ بعض اشعار درج کئے جاتے ہیں:۔

نخستیں بادہ کاندر جام کردند　　ز چشم مستِ ساقی وام کردند

لب میگونِ جاناں جام در داد　　شرابِ عاشقانش نام کردند

سرِ زلفِ بتاں آرام نگرفت　　ز بس دلہا کہ بے آرام کردند

بمجلس نیک و بد را جائے دادند　　بجامی کار خاص و عام کردند

نہاں با محرمے رازے بگفتند　　جہانے را ازاں اعلام کردند

بعالم ہر کجا دردو غمے بود　　بہم کردند و عشقش نام کردند

چو خود کردند راز خویشتن فاش   عراقی را چرا بدنام کردند

آخری شعر سننا تھا کہ شیخ نے کہا کہ انکے لئے ریاضت کی ضرورت نہیں اور خرقہ وغیرہ عطا فرمایا۔ پچیس برس ہندوستان میں قیام رہا۔ یہانتک کہ شیخ نے رحلت فرمائی اور ان کو خلیفہ نامزد کر گئے مگر مریدوں کو مخالفت زیادہ ہو گئی مجبوراً زیارت حرمین کے لئے چلے گئے اور وہاں سے قونیہ میں آئے اور شیخ صدرالدین رومی کے شاگرد ہوئے۔ یہیں ابن عربی کی فصوص الحکم پر ایک کتاب تصوّف میں لکھی جس کا نام لمعات ہے (ملّا جامی نے اسکی شرح اشعة اللمعات لکھی ہے) یہ کتاب عجیب دلکش پیرایہ میں ہے۔ اصل تو نثر ہے لیکن بیچ بیچ میں عربی اور فارسی کے دلکش اشعار بھی درج کئے ہیں۔ معین الدین پروانہ کو ان سے ارادت ہو گئی اور ایک خانقاہ قیام کے لئے بنوا دی۔ آخر عمر میں بلادِ شام کا سفر کیا۔ وہیں انکے بیٹے کبیرالدین ہندوستان سے آکے ملے اور وہیں ۸۔ ذیقعدہ ۶۸۸ھ مطابق ۲۳۔ نومبر ۱۲۸۹ء کو انتقال کیا اور صالحیۂ دمشق میں ابن عربی کے مزار پر دفن ہوئے۔

غزل میں تصوّف کا رنگ غالب ہے اور ایک عجیب قسم کی لذت کلام میں ملتی ہے۔ یہ بھی وہی اظہار واردات قلب ہے جس سے زبان خود بخود دلکش ہو جاتی ہے:۔

از پردہ برون آمد ساقی قدحے بر دست   ہم پردۂ ما بدرید ہم توبۂ ما بشکست

بنمود رخ زیبا گشتیم ہمہ شیدا   چوں ہیچ نماند از ما آمد بر ما بنشست

دیکھو مرتبۂ فنا کو کن خوبصورت لفظوں میں ادا کیا ہے۔ اب مرتبۂ اتحاد کے لذّات بیان کرتے ہیں:۔

زلفش گرہے بکشاد بند از دل ما برخاست   جان دل ز جہاں برداشت اندر سر زلفش بست

در دام سر زلفش ماندیم ہمہ حیران   وز جام مئے لعلش گشتیم ہمہ سرمست

چوں سلسلۂ زلفش بند دلِ حیران شد   آزاد شد از عالم وز ہستی خود وارست

جام الست کا سیت اپنی دھن کا پکّا ہے۔ ایک مثنوی عشاق نامہ بھی

نظم کر ڈالی ہے اگر ملتی تو یقیناً عجب کیفیت کی ہوتی۔ ایک شعر اور سنو:۔

عراقی طالب درد است آن نیز — بامید ے کہ درمانش تو باشی

سعدی و عراقی کے کلام پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کی یادگار کمال کو آراستہ کرنے کے لئے ساز و سامان مہیا ہو رہے ہیں۔ نہ ایسے کامل شعرا گذرتے نہ حافظ کی طبیعت میں زور آتا۔

اوحدالدین کرمانی

اسی سلسلے میں اوحدالدین کرمانی کا ذکر مناسب ہے۔ ان کی ایک مثنوی مصباح الارواح اور ایک دیوان بھی سات ہزار شعر کا ہے شیخ محی الدین ابن عربی شمس تبریز اور مولانا روم کے فیض صحبت سے مستفیض ہوئے تھے۔ مثنوی میں حقائق و معارف بیان کئے ہیں۔ انھیں کے ایک ہمنام اصفہان یا مراغہ میں پیدا ہوئے

اوحدالدین اصفہانی

تھے جو ان کے مرید بھی تھے۔ ان کی مثنوی جام جم مشہور رہے اور سلطان ابوسعید کے نام پر معنون ہے۔ اس مثنوی کا رنگ حدیقہ سنائی سے ملتا ہے۔ دیوان بھی چھ سات ہزار شعر کا ہے جس میں علاوہ وعظیات کے غزلیں بھی ہیں۔ ایک غزل درج کی جاتی ہے تاکہ رنگ طبیعت کا اندازہ ہو جائے:۔

پیداست حال مردم رنداں چنان کہ ہست
خرم کسیکہ فاش کند ہر نہان کہ ہست

ای محتسب تو دانی شرع و آساس آن
آئین عشق رایگذار آنچنان کہ ہست

مومن ز دین برآمد و صوفی ز اعتقاد
ترسا محمدی شد و عاشق ہمان کہ ہست

خلقے نشان دوست طلب می کنند و باز
از دوست غافلند بچندین نشان کہ ہست

گر نام اوحدی سگِ تست از درش مراں
او را بہر لقب کہ تو خوانی بداں کہ ہست

سال وفات ۶۵۴ھ مجمع الفصحا میں دیا ہے مگر صحیح نہیں کیونکہ اوحدالدین سلطان ابوسعید کے ہمعصر تھے اور یہ سنہ چنگیز سے بھی سو برس پیشتر ہے بلکہ ۷۳۸ھ جو مشہور ہے وہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

محمود شبستری **محمود شبستری** (المتوفی ۷۲۰ھ مطابق ۱۳۲۰ء) نے مثنوی گلشن راز نظم کی جس میں مقاماتِ تصوّف میر حسینی کے پندرہ سوالوں کے جواب میں بیان ہوئے ہیں۔ اور اکثر قصص و روایات و تمثیلات لطیف درج ہیں (ملا عبدالرزاق لاہجی نے اس کتاب کی شرح کی ہے)۔ اس کے علاوہ حق الیقین اور رسالۂ شاہد بھی انھیں کے تصنیفات سے ہیں۔

ہمام تبریزی **ہمام تبریزی** (المتوفی ۷۱۴ھ مطابق ۱۳۱۴ء) کا نام صاحب دیوان کے شعرا میں لیا جاتا ہے اور شیخ سعدی سے ایک نزاع لفظی کے سلسلے میں بھی ذکر آتا ہے۔ شاعری کا رنگ یہ ہے:۔

وداع یار و دیارم چو بگذرد بخیال   شود مسافرم از آب دیدہ مالا مال
فراق را نفسے چوں ہزار سال بود   ببیں کہ چوں گزرد روز و ہفتہ و مہ و سال

ایک رباعی بھی درج کی جاتی ہے:۔

شد دوش بہ یار حکایت آغاز   از ہر سخن موئیم بر آمد آواز
شب رفت و حدیث ما بپایاں نرسید   شب را چہ گنہ قصۂ ما بود دراز

افضل کاشی۔ سیف الدین اسفرنگی۔ رفیع ابہری۔ فرید احول۔ نزاری قہستانی وغیرہ وغیرہ بکثرت شعرا ہیں جنکا ذکر کرتا رہ گیا۔ سب سے آخر میں مولانا روم کے بیٹے

سلطان ولد **سلطان ولد** کا نام ہے جنکا سال ولادت ۶۲۳ھ مطابق ۱۲۲۶ء ہے۔ انکی مثنوی رباب نامہ میں علاوہ فارسی اشعار کے ترکی اشعار بھی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی لٹریچر کا اثر ترکی شاعری پر کتنا نفیس پڑا ہے۔ اس مثنوی میں مولانا روم کے بھی اکثر واقعاتِ زندگی درج ہیں جنکا تاریخی حیثیت سے اس سے زیادہ مستند حوالہ نہیں ہو سکتا۔

———— ✻ ————

باب نہم

تیموریہ

تمہید

ابو سعید ایلخانیوں کا آخری فرمانروا ۱۳ - ربیع الثانی ۷۳۶ھ مطابق ۳۰ رنومبر ۱۳۳۵ء کو
رہگرائے ملک عدم ہوا اور اسی سال ۲۵ رشعبان سنہ ھ مطابق اپریل ۱۳۳۶ء کو حسب روایت مطلع السعدین
تیمور لنگ کی ولادت ہوئی۔ ابو سعید کی وفات سے لیکے فترت تیموریہ تک
جتنا زمانہ گذرا اُس میں ایران چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں تقسیم ہو گیا تھا جن میں سے
ممتاز سلطنتیں چار تھیں (۱) آل مظفر جن کی حکومت فارس اور عراق عجم اور
کرمان پر تھی۔ (۲) جلائر (ایلخانی) جو بغداد اور آذربائجان میں سلطنت کر رہے
تھے۔ (۳) سربدار (یا سربدال) جو سبزوار کے بادشاہ تھے۔ اور (۴) کرت
جن کا مستقر پایہ تخت ہرات تھا۔ یہ چند سلطنتیں اگرچہ مختصر تھیں مگر تربیت اہل فضل
و کمال کے معاملے میں ہر ایک سبقت لے جانے کے لئے کوشاں تھی۔ لہذا پہلے انہیں
کے مختصر حالات لکھے جاتے ہیں۔

آل مظفر

(۱) آل مظفر (۱۳۱۳ء تا ۱۳۹۳ء) کی سلطنت کا آغاز مبارز الدین محمد سے ہے جسے
سلطان الجائتو نے یزد کی حکومت عطا کی تھی۔ اس کے بزرگ بھی ہلاکو خاں کے ساتھ
رہے تھے اور اپنے کو عرب کہتے تھے جو ابتدائے فتوحات اسلامیہ میں آ کے آباد
ہوئے تھے ۷۱۳ھ مطابق ۱۳۱۳ء سے مبارز الدین کی حکومت کا آغاز ہوا اس کے پانچ بیٹے تھے۔
شرف الدین مظفر۔ شاہ شجاع قطب الدین محمود۔ احمد۔ بایزید۔ مبارز الدین
کے عہد میں فتوحات بھی ہوئے۔ کرمان کو قطب الدین سے لیا اور فارس کو
مع شیراز و اصفہان ابو اسحٰق انجو کو شکست دیکے حاصل کیا پھر تبریز پر

حملہ آور ہوا اور نخجوان تک فتح کر لیا۔ آخر قسمت کا ستارہ گردش میں آیا اور اس کے دو بیٹے محمود اور شاہ شجاع جو فتوحات میں مددگار رہے تھے مخالف ہو گئے جنہوں نے اُسے قید کر کے آخر عمر تک نہ نکلنے دیا۔ مبارزالدین کے بعد شاہ شجاع سنہ ۷۵۹ھ مطابق ۱۳۵۷ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ خود قابل آدمی تھا اور شاعر بھی تھا اس کے زمانے میں خواجہ حافظ شیراز کی شاعری۔ مولانا قوام الدین کا درس اور سید شریف جرجانی کا مدرسہ دارالشفائے شیراز میں تقریر یادگار ہے۔ اس نے محمود سے شیراز اور دولتشاہ سے کرمان لیا اور سلطان اویس جلائر کے انتقال کے بعد تبریز۔ نخجوان۔ قراباغ۔ سلطانیہ۔ شوستر بلکہ بغداد تک پر قبضہ کیا۔ محمود کا انتقال ۳۸ برس کی عمر میں ہو گیا اسے بیحد افسوس ہوا اور یہ رباعی کہی :۔

محمود برادرم کہ شیر کمیں | میکرد خصومت از پئے تاج و نگیں
کردیم دو بخش تا برآساید خلق | او زیر زمین گرفت و من روئے زمیں

آخر عمر میں اپنے دو بیٹوں سلطان اویس اور سلطان شبلی سے ناراض ہو گیا بلکہ شبلی کی آنکھیں بھی نکلوا لیں اور اسی واقعے کے دوسرے سال سنہ ۷۸۶ھ مطابق ۱۳۸۴ء میں انتقال کر گیا۔ بستر مرگ پر سے ایک خط تیمور کو لکھوایا جس میں اپنی وفاداری اور خیرخواہی کا اظہار کر کے اپنے بیٹے زین العابدین کی سفارش کی مگر وہ تین برس یعنی ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء سے ۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء تک بھی تخت پر نہ بیٹھ سکا تھا کہ اہل خاندان نے معزول کر کے سلطنت آپس میں بانٹ لی آخر سنہ ۷۸۹ھ میں تیمور نے پہلا حملہ عراق عجم اور فارس پر کیا اور ستر ہزار ایرانی قتل کئے اور مال و اسباب لوٹ کے چلا گیا۔ اس کے بعد چھ سال تک آل مظفر کے شاہزادے شاہ منصور والی فارس و اصفہان شاہ یحییٰ والی یزد اور شاہ احمد حاکم کرمان آپس میں لڑا کئے یہانتک کہ

تیمور کا دوسرا حملہ ہوا جس میں شاہ منصور کو شکست دیکے زین العابدین کو پھر بادشاہ بنایا۔ آخر تمام آل مظفر نے تیمور کی اطاعت قبول کی مگر رفتہ رفتہ سب قتل ہو گئے اور ۱۰۔ رجب ۷۹۵ھ مطابق ۲۱ مئی ۱۳۹۳ء میں بجز شبلی اور زین العابدین کے کوئی نہ بچا۔ پھر تیمور ان دونوں کو بھی سمرقند لے گیا جہاں اپنی زندگی کے دن پورے کر کے مر گئے اور آل مظفر کا اس عبرتناک طریقے سے خاتمہ ہو گیا۔

(۴) جلائر: امیر چوپان اور حسن جلائر کا ذکر ابو سعید کے حال میں آچکا ہے جسکے انتقال کے بعد حسن جلائر نے اُس کی بیوہ دلشاد خاتون سے عقد کر لیا اور [illegible] امیر چوپان کی اولاد اور حسن جلائر سے لڑائیاں رہیں۔ انقلاب زمانہ نے امیر چوپان کے خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ ان میں سے حسن کوچک زیادہ مشہور ہے اور حسن جلائر کو تاریخ میں حسن بزرگ کہتے ہیں۔ یہ دونوں کسی نہ کسی شخص کو ہلاکو کے خاندان میں بادشاہ بنا کے آپس میں لڑا کرتے تھے۔ آخر حسن بزرگ کا ۷۴۰ھ مطابق ۱۳۳۹ء میں بغداد و تبریز پر قبضہ ہو گیا اور خود جلائر خاندان کا پہلا بادشاہ قرار پایا۔ ۲۷۔ رجب ۷۴۴ھ مطابق ۱۵۔ دسمبر ۱۳۴۳ء کو حسن کوچک کو اسکی زوجہ نے مار ڈالا تو اور بھی اطمینان ہو گیا۔ بیس برس سلطنت کر کے حسن جلائر نے قضا کی اور اُس کا بیٹا سلطان اویس جو دلشاد خاتون کے بطن سے تھا وارث سلطنت ہوا۔ بیس برس اس نے بھی حکومت کی اور اہل فضل و کمال کی تربیت میں منہمک رہا۔ سلمان ساوجی اسکی تعریفوں کا مداح ہے۔ ۲۔ جمادی الاول ۷۷۶ھ مطابق ۹۔ اکتوبر ۱۳۷۴ء کو اسکا بھی انتقال ہوا اور خاندان جلائر پر زوال آنے لگا جس دن اُس کا انتقال ہوا اُسی دن اسکے بڑے بیٹے کو امراے دربار نے قتل کر کے چھوٹے بیٹے حسین جلائر کو تخت نشین کیا

---

(۱) اس خاندان کو کبھی ایلخانی بھی کہتے ہیں کیونکہ حسن جلائر بن آق بوغا بن ایلکا ق اپنے کو ہلاکو کی اولاد میں گنتا تھا۔

جس کے زمانے میں شاہ شجاع مظفری نے حملہ کرکے بغداد تک پر قبضہ کرلیا تھا۔
پہلے اس کے بھائی علی نے مخالفت کی پھر دوسرے بھائی احمد نے اسے
قتل کرکے سلطنت حاصل کی مگر اس پر اس کے بھائی بایزید نے حملہ کیا۔
آخر دونوں میں بٹوارہ ہوگیا مگر خانہ جنگیوں کا خاتمہ تیمور کے حملے نے کیا۔ احمد اور
اس کے سپہ سالار قرا یوسف نے مقابلہ بھی کیا اور دونوں ہزیمت پاکے سلطان
بایزید یلدرم کے یہاں پناہ گزین ہوتے پھر مصر چلے گئے۔ تیمور کے انتقال کی
خبر سن کے واپس آئے تو دونوں آپس میں لڑ گئے۔ آخر قرا یوسف کے ہاتھوں
۲۵ ربیع الثانی سنہ ۸۱۲ھ مطابق ۶ ستمبر ۱۴۰۹ء کو جلائیروں کا خاتمہ ہوگیا۔

(۴۳) کرت۔ سلطان غیاث الدین محمد غوری کا نواسہ شمس الدین کرت کرت
امیر نوبان کے ساتھ ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور ملتان میں شیخ بہاء الدین زکریا[۱]
سے ملاقات کی پھر منگو قاآن خاں سے ملا جسکے دربار سے ہرات۔ جام۔ غرجستان
مرو۔ فاریاب وغیرہ کی دریائے سیحون تک اور اسفزار، سیستان۔ کابل وغیرہ کی
دریائے سندھ تک سلطنت عطا ہوئی۔ ۶۶۲ھ مطابق ۱۲۶۳ء میں سیستان فتح کرکے
ہلاکو سے ملا اور تین برس بعد اباقاآن خاں سے ملاقات ہوئی اور بہت عزت و
احترام ہوا۔ ۶۷۵ھ مطابق ۱۲۷۶ء میں شمس الدین جوینی کے ہمراہ پھر ملاقات کی مگر ابکی بار
سلطان اس سے مشتبہ نظر آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۶۷۶ھ مطابق جنوری ۱۲۷۸ء میں اسے زہر دیدیا گیا
پھر اس کا بیٹا رکن الدین بادشاہ ہوا اور کہیں لقب اختیار کیا۔ ۱۲ صفر ۷۰۵ھ
مطابق ۳ ستمبر ۱۳۰۵ء میں وہ بھی نذر اجل ہوگیا۔ اس کی زندگی ہی میں ملک
فخر الدین حکومت پا گیا تھا۔ اس نے غازان خاں اور الجائیتو خاں سے مقابلے
کئے اور ۱۲ شعبان ۷۰۶ھ مطابق ۲۶ فروری ۱۳۰۷ء میں مرگیا کہتے ہیں کہ اسکے دربار میں شعراء و علماء

---

[۱] عراقی کے مرشد

رہتا تھا اور تہذیب علم و فضل ہوا کرتی تھی۔ پھر اسکا بھائی ملک غیاث الدین
وارث ہوا۔ ۷۱۸ھ میں نکوداریوں سے مقابلہ ہوا اور ۷۲۰ھ میں فتح پائی اور
نکوداریوں کا بالکل استیصال ہو گیا۔ ۷۲۹ھ مطابق ۱۳۲۹ء میں اسکا انتقال ہوا اور ملک
شمس الدین تخت نشین ہوا مگر دو ماہ کے بعد مر گیا اور اس کا بھائی ملک
حافظ بادشاہ ہوا۔ دو برس بعد وہ بھی مر گیا اور ملک معز الدین تخت نشین ہوا
یہ وہی زمانہ تھا جب سلطان ابو سعید کا انتقال ہوا اور تیمور لنگ کی ولادت
ہوئی۔ اس کی سلطنت چالیس برس رہی اور سربداریوں کا بڑھتا ہوا خاندان
اسی کے ہاتھوں ختم ہوا۔ یہ بڑا بے رحم بادشاہ تھا اور دشمنوں
کے کٹے ہوئے سروں کے مینار نصب کراتے تھے ۷۷۱ھ مطابق ۱۳۷۰ء میں
اس نے وفات پائی اور اس کا بیٹا غیاث الدین پیر علی بادشاہ ہوا۔
اب تیمور لنگ کو اس ملک کی طرف توجہ ہوئی۔ پہلے اپنی بھتیجی سونج قتلق آغا کو
پیر علی کے بیٹے پیر محمد کے عقد میں دیا۔ پھر سلطنت پر حملہ کرکے اپنے بیٹے میران شاہ
کو حاکم کر دیا اور پیر علی اور پیر محمد کو گرفتار کرکے سمرقند لے گیا اور ۷۹۱ھ مطابق ۱۳۸۹ء میں
سارا خاندان کرت ختم کر دیا۔

سربدار۔ (۴) سربدار۔ یہ خاندان پچاس برس تک امن و امان سے سبزوار
میں حکمراں رہا۔ اس عرصے میں بارہ بادشاہ ہوئے آخری بادشاہ خواجہ علی مؤید
نے اپنی حکومت بڑھائی تھی مگر معز الدین کرت کے ہاتھوں ۷۵۸ھ مطابق ۱۳۵۷ء
میں ساری منگولوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ابن یمین اسی دربار سے توسل رکھتا تھا۔

امیر تیمور۔ امیر تیمور گورگان صاحبقران بعض کے نزدیک قوم کا گڈریا تھا
اور بعض مورخ چنگیز خاں کی اولاد سے بتاتے ہیں۔ اسکے حالات فارسی میں
ظفر نامہ شرف الدین علی یزدی اور ظفر نامہ نظام شامی سے

ملتے ہیں اور عربی میں ابن عرب شاہ کی تاریخ تیمور ہے جس میں اس کی
ہجو کے پل باندھ دیئے ہیں۔ علاوہ بریں تزک تیموری۔ خود اس کی ترکی زبان
میں لکھی ہوئی ہے جس کا ترجمہ شاہجہان صاحبقران ثانی میں ابو طالب
حسینی نے فارسی میں کیا ہے۔ ۸ شعبان ۷۳۶ھ مطابق ۹ اپریل ۱۳۳۶ء میں ولادت ہوئی
اور ساری عمر ایک فتوحات کا سلسلہ ہے جو ختم ہی نہیں ہوتا۔ ممالک اسلامیہ
کی تاخت و تاراج اس حد تک کی کہ ہلاکو خاں ثانی کا لقب[1] ملا۔ ایران کی سلطنت
ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے اور بھی آسانی ہوئی۔ اسکے زیر سلطنت
روس کے جنوب سے لیکے بلاد روم و عراق عرب و سلطنت ایران و ملک افغانستان
بلکہ بیشتر بلاد ہندوستان بھی آ گئے تھے۔ سلطان بایزید یلدرم عثمانی کو شدید
شکست دی تھی اور برقوق سلطان مصر سے صلح کر لی۔ آخر عمر میں اسپین کے
سفیر بھی تحائف لیکے آئے تھے اور چین پر حملہ کرنے کا ارادہ تھا کہ پیمانہ عمر
لبریز ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تیمور ایک "دجال کذاب" تھا۔ نہ "صفات
جلالیہ و قہریہ الٰہی کا مظہر" بلکہ ایک ملک گیر اور سخت مزاج بادشاہ تھا۔
سکندر ہو یا چنگیز۔ تیمور ہو یا نپولین۔ کسی ملک گیر کی نظر میں انسان کی
زندگی کوئی چیز نہیں۔ لہذا مرنا۔ قتل و غارت کرنا ان کا کام ہے اور اسی میں
انکی کامیابی۔ بہرکیف فارسی لٹریچر کے لئے یہ زمانہ بھی عجیب ترقی کا ہے۔
خواجوی کرمانی۔ کمال خجند۔ ابن یمین۔ مغربی اور سب سے بڑھ کے حافظ شیرازی
اسی عصر میں ہوئے ہیں جنکے حالات عنقریب لکھے جائینگے۔ ۸۰۷ھ مطابق ۱۸ فروری ۱۴۰۵ء میں
۷۱ سال دنیا میں رہ کے تیمور نے انتقال کیا اور چونکہ بڑے بیٹے جہانگیر اور دوسرے

---

[1] "لنگ" کا لقب شاہ سیستان کو شکست دینے میں حاصل ہوا کیونکہ
اس جنگ میں اسکے پاؤں پر ایسا تیر لگا کہ بیکار ہو گیا (سائکس "پرشیا")۔

بیٹے عمر شیخ مرزا کا انتقال ہو چکا تھا لہٰذا پیر محمد جہانگیر اپنے پوتے کو اس عظیم سلطنت پر حکمرانی کے لئے نامزد کر گیا۔

شاہرخ

تیمور کے بعد میران شاہ تیسرا بیٹا دو تین سال زندہ رہا مگر مخبوط الحواس۔ البتہ شاہرخ چوتھا بیٹا خراسان پر اطمینان سے حکومت کرنے لگا حسب وصیت پیر محمد کو سلطنت ملی مگر میرانشاہ کے بیٹے خلیل سلطان نے حملہ کر کے شکست دیدی اور سمرقند میں تخت نشین ہوا۔ اپنی معشوق شاد ملک کا اتنا گرویدہ تھا کہ امرائے دربار ناراض ہو گئے اور اسے معزول کر کے جلا وطن کر دیا۔ اب شاہرخ نے اس طرف کا قصد کیا اور وارث سلطنت تیموری ہوا۔ اسکے حکومت کا زمانہ نہایت امن و آسائش کا تھا۔ رفتہ رفتہ کل مفتوحات پر قبضہ کر کے باپ کے تاراج کئے ہوئے شہروں کو آباد کیا اور صنائع و فنون کی تربیت میں مصروف ہو گیا سلاطین وقت سے بھی دوستانہ مراسم پیدا کئے اور خیرات و مبرات میں وہ نام پیدا کیا کہ حاتم وقت کہلانے لگا۔ آخر ۸۵۰ھ مطابق ۱۴۴۷ء میں ۴۳ برس سلطنت کر کے وفات پائی۔

الغ بیگ

اسکے بعد الغ بیگ اسکا بیٹا تخت نشین ہوا۔ اس نے سمرقند کی مشہور رصدگاہ تعمیر کی اور خود زیچ الغ بیگی مرتب کی جو علم ہندسہ و ہیئت کی بہترین خدمت کہلانے کے قابل ہے۔ اسکا بیٹا عبداللطیف مخالف ہو گیا اور ایک شخص عباس نام کے ہاتھوں قتل کرا دیا (عباس کشت۔ تاریخ وفات ہے) مگر خود بھی عرصے تک زندہ نہ رہ سکا اور ایک شخص باباحسین نے اسکا خاتمہ کر دیا (باباحسین کشت اسکی تاریخ وفات ہے)۔ ۸۵۴ھ

زوال تیموریہ

اب آل تیمور پر زوال آ گیا سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ ہر تیموری اپنے کو وارث تخت سمجھتا تھا۔ ادھر ترکمانوں کا زور بڑھا۔ پہلے قراقیونلو (قرا یوسف) کا خاندان غالب آنے لگا پھر ان لوگوں پر زوال آیا اور آق قیونلو ترکمان غالب ہوئے۔ آخر اسمٰعیل شاہ صفوی ان کا خاتمہ کر کے ۹۰۶ھ مطابق ۱۵۰۱ء میں تخت نشین ہوا اور رفتہ رفتہ تمام ایران

اطمینانی اور اجتماعی حالت سے اسکے زیر نگیں آگیا۔ تیموریہ خاندان کا ایک فرد فرید ازبکوں کے ہاتھ سے شکست کھا کے ہندوستان گیا اور عظیم الشان سلطنت مغلیہ کا بانی ہوا۔ یہ تیمور کے پوتے کا پوتا ہے اور نام اسکا **ظہیر الدین محمد بابر شاہ** ہے۔

آل تیمور کی شائستگی

عہد تیموریہ جسکی ابتدا قتل و غارت سے ہے اور انتہا پراگندگی اور شورشوں پر ہے۔ ترقی علوم و فنون کے لئے مشہور ہے۔ ایران کی نفاست طبع کے نمونے جو آج ملتے ہیں اسی عہد کی یادگار ہیں۔ تہذیب و شائستگی کے اعتبار سے تیموری خاندان کے افراد اپنے زمانے میں فرد نظر آتے ہیں صفوی خاندان کے آرائش و زیبائش کے سامانوں کی صنعت یہی لوگ اپنے زمانے میں شروع کر گئے تھے اور انکے عظمت و جلال کی خشت اولین گویا پہلے ہی سے رکھ گئے تھے۔

ترقی علوم کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے کہ سعد الدین تفتازانی۔ سید شریف جرجانی۔ صاحب مواقف اور صاحب قاموس وغیرہ اس دور کے آغاز میں گزرے ہیں اور فارسی میں بھی بعض عمدہ تصنیفیں اسی عہد میں شائع ہوئی ہیں۔ پہلا شخص قابل ذکر **شمس فخری** ہے جسکی کتاب معیار ۷۴۵ھ میں شیخ ابو اسحٰق انجو کے لئے لکھی گئی۔ اس میں علاوہ عروض و قافیہ و بدیع کے قدیم اور غیر مستعمل فارسی الفاظ کی فرہنگ دی ہوئی ہے جو نہایت مفید ہے۔ **معین الدین یزدی کی مواہب الٰہی** آل مظفر کی تاریخ ابتدا سے ۷۶۷ھ تک ہے اور بیشتر چشمدید واقعات درج ہیں۔ **شیخ فرید الدین** ابو العباس احمد شیرازی نے شیراز نامہ ۷۴۴ھ میں تصنیف کیا جس میں علاوہ شعرا کے بکثرت علما و مشائخ کے حالات درج کئے ہیں۔ **نظام الدین شامی** کے ظفر نامہ کا ذکر ہو چکا ہے۔ جب تیمور نے بغداد پر حملہ کیا تو یہ پہلا شخص تھا جو فاتح سے ملنے کو باہر چلا آیا تھا ۸۰۳ھ میں حلب میں قید تھا اور یہاں کے قلعے کی تسخیر اپنی آنکھوں سے دیکھی

شمس فخری

معین یزدی

فخر شیرازی

نظام الدین شامی

سنہ ۸۰۴ھ میں امیر تیمور نے اُسے تاریخ لکھنے کا حکم دیا اور کاغذات متعلقہ حوالے کئے۔ سنہ ۸۰۶ھ میں جب تیمور ملک گیری کے لئے چلا تو اُسنے اپنے پوتے عمر بہادر بن میران شاہ کے یہاں بھجوا دیا جہاں یہ تاریخ ختم ہوئی۔

شرف الدین یزدی

شرف الدین علی یزدی کا ظفرنامہ اسکے بعد تصنیف ہوا ہے۔ عبارت مغلق اور مسجع ہے اور بیشتر واقعات ظفرنامۂ نظام شامی سے لئے ہیں یہانتک کہ قرآن مجید کے اقتباسات اور اشعار بھی اسی کتاب کے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہی ظفرنامہ مرصع کیا گیا ہے لیکن اس ظفرنامہ کی اشاعت نے اسکا چراغ گُل کردیا۔ سنہ ۸۲۸ھ میں ظفرنامہ تصنیف ہوا مصنف فی شیراز تاریخ ختم ہے اسکے علاوہ ایک کتاب معما اور چیستان پر لکھی اور ایک شرح قصیدہ بُردہ کی تصنیف کی حلل المطرزہ علم وفق اعداد میں طلسمات اور تعویذات درج کئے ہیں۔ ایک دیوان اور ایک مثنوی نظم میں اسکی یادگار ہے مصنف کی بیشتر زندگی شاہرخ اور اسکے بیٹے مرزا ابراہیم سلطان کے یہاں گذری پھر درس و تدریس میں مشغول ہوگیا یہانتک کہ سلطان محمد والی عراق نے اُسے قم میں بلالیا۔ جب شاہرخ نے اس پر بجرم بغاوت حملہ کیا اور فتح پائی تو مشیران کار کو قتل کیا شرف یزدی بھی انھیں میں تھا مگر مرزا عبد اللطیف نے سفارش کی کہ اسے میرے باپ الغ بیگ کے پاس بھیج دیجئے۔ رصد خانہ میں ضرورت ہے۔ بادشاہ نے جان بخشی کی اور سمرقند بھیجدیا۔ وہاں سے آخر عمر میں وطن واپس ہوا اور سنہ ۸۵۸ھ میں وہیں انتقال کیا۔

آبرو

حافظ آبرو (نور الدین لطف اللہ ہروی) نے زبدۃ التواریخ لکھی اور بائسنغر پسر شاہرخ کو نذر کی۔ مجمل فصیحی میں اس کتاب کا نام مجمع التواریخ سلطانی لکھا ہے سنہ ۸۳۰ھ میں۔ علاوہ تاریخ کے ایک جغرافیہ بھی تصنیف کرکے شاہرخ کے نام پر معنون کیا تھا۔ مصنف تیمور کے ہمراہ بعض فتوحات میں موجود تھا اور شاہرخ کے

زمانے میں بیشتر اپنے وطن ہرات میں رہا۔ ۸۴۳ھ (مطابق ۱۴۳۹ء) میں زنجان میں وفات پائی
اور وہیں دفن ہوا۔ فصیح خوافی کی مجمل بھی اسی عہد کی تصنیف ہے اور ۸۴۵ھ فصیحی
تک کے حالات اس میں درج کئے ہیں۔ مصنف کو ۸۴۰ھ مطابق ۱۴۳۶ء میں نظارت خزانہ کا
عہدہ ملا۔ ۸۱۸ھ میں جب شاہرخ اپنے بھتیجے بیقرا کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے
شیراز گیا تو یہ ہمراہ تھا۔ پھر نظارت مالیہ کا کام کرمان میں کرتا رہا۔ وہاں سے بادغیس
گیا۔ ۸۲۶ھ میں بایسنغر نے اسے پھر سرکاری ملازمت عطا کی۔ ۸۴۳ھ میں عتاب
سلطانی ہوا اور قید خانے میں زندگی کاٹی جب رہا ہوا تو ۸۴۹ھ مطابق ۱۴۴۵ء میں اپنی کتاب
مجمل شاہرخ کو نذر دی۔ یہ کتاب فارسی میں ہے اور ادبیات کی زیادہ توضیح کی گئی
ہے۔ کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی (تاریخ ولادت ۸۱۶ھ مطابق ۶ نومبر ۱۴۱۳ء مولد ہرات) کمال الدین سمرقندی
نے پچیس سال کی عمر میں ایک کتاب صرف و نحو میں لکھ کے شاہرخ کو نذر دی اور مورد الطاف
ہوا۔ ۸۴۵ھ میں بیجاپور سفارت پر آیا اور تین برس رہ کے واپس گیا۔ ۸۵۰ھ میں پھر سفیر
ہو کے گیلان گیا۔ شاہرخ کے بعد مرزا عبداللطیف، عبداللہ[1]، ابوالقاسم بابر[2] اور
آخر میں ابوسعید[3] کی ملازمت میں رہا۔ آخر عمر میں ہرات واپس گیا اور شاہرخ

۱۔ عبداللہ بن ابراہیم بن شاہرخ (المتوفی ۸۵۵ھ) کو عبداللطیف کے بعد سلطنت ملی۔ اور عراق و فارس و کرمان پر اسکے زمانے میں جہانشاہ بن قرا یوسف ترکمان کا قبضہ ہو گیا۔

۲۔ ابوالقاسم بابر بن بایسنغر بن شاہرخ کو عبداللہ بن ابراہیم کے مقابلے میں دعوائے سلطنت ہوا تھا اور بعض شہروں پر سلطنت بھی کرتا تھا۔ (یہ سلطنت مغلیہ کا بانی ظہیر الدین محمد بابر نہیں ہے)۔

۳۔ سلطان ابوسعید نبیرہ میرانشاہ بن تیمور گویا آل تیمور کا آخری چراغ تھا۔ علما و فضلا کی تربیت کا اسے شوق تھا۔ ترکستان۔ خراسان۔ زابلستان۔ مازندران پر عبداللطیف کے بعد اسکی حکومت ہوئی۔ جہانشاہ نے اسکے زمانے میں ہرات کو فتح کیا اور اسکے مقبوضات پر تسلط حاصل کیا۔ ازون حسن آق قیونلو نے جہانشاہ کو قتل کیا تو ابوسعید حکومت ایران کے شوق میں اس سے لڑنے گیا مگر شکست کھائی اور گرفتار کر کے فاتح کے سامنے لایا گیا جس نے اسے قتل کرا دیا۔

کی جوائی ہوئی خانقاہ کا شیخ ہوگیا۔ ۸۸۷ھ مطابق ۱۴۸۲ء میں انتقال کیا۔ مطلع السعدین اسی کی تصنیف ہے جس میں ابو سعید ایلخانی[1] کے حال سے ابو سعید تیموری[2] تک کے حالات درج ہیں۔ معین الدین محمد اسفزاری نے روضۃ الجنات فی تاریخ مدینۃ ہرات میں ۸۷۵ھ تک کے واقعات لکھے (شہر صفر تاریخ اختتام ہے۔ اسی مہینے میں یہ کتاب ختم بھی ہوئی تھی)۔ اور سلطان حسین ابوالغازی[52] کو نذر دی۔

معین الدین اسفزاری

یہ بادشاہ اور اسکا وزیر امیر علی شیر (المتوفی ۹۰۶ھ) دونوں تربیت فضل وکمال کے لئے تاریخ میں مشہور ہیں۔ محمد بن خاوند شاہ بن محمود المعروف بمیر خوند (المتوفی ۹۰۳ھ) نے روضۃ الصفا لکھی اور امیر علی شیر کو نذر دی۔ ابتدائے آفرینش سے ۸۷۳ھ تک کی تاریخ چھ جلدوں میں ہے۔ ساتویں جلد غالباً اسکے پوتے خوندمیر نے اضافہ کی اور ۹۱۲ھ تک پہونچا دیا۔ اسی جلد میں سلطان حسین ابوالغازی کے حالات بالتفصیل ہیں۔ عبارت پوری کتاب کی فصیح و بلیغ ہے اور کسی قدر پُر تکلّف بھی۔ رضا قلی خاں ہدایت نے ناصرالدین شاہ قاچار کے عہد میں ایک ضمیمہ بڑھایا جس میں اپنے وقت تک کے حالات درج کئے ہیں اور بابیوں کے واقعات اچھی طرح لکھے ہیں۔ خوندمیر (المتوفی ۹۴۱ھ مطابق ۱۵۳۴ء) اسکے پوتے نے حبیب السیر لکھی۔ یہ ۹۲۹ھ کی تصنیف ہے اور اچھی تاریخ ہے۔

روضۃ الصفا

حبیب السیر

ان تاریخوں کے علاوہ تذکرے بھی نہایت عمدہ لکھے گئے۔ منجملہ ان کے دولت شاہ سمرقندی کا تذکرۃ الشعرا ہے۔ ۸۹۲ھ میں یہ کتاب ختم ہوئی اور حالات شعرا میں علاوہ قصص و حکایات کے کلام کے انتخابات بھی درج کئے گئے

تذکرۂ دولت شاہ

---

[1] چنگیز خانیوں کا آخری فرمانروا۔ [52] حسین بن منصور بن بیقرا بن عمر شیخ بن تیمور کی حکومت ابو سعید تیموری کے بعد ہرات میں قائم ہوگئی اور ۳۸ برس سلطنت کرکے ۹۱۱ھ میں انتقال کیا۔ ملا جامی۔ میر خوند اور مشہور بہزاد المصور اسی کے دربار سے متوسل تھے (سائکس "پرشیا")۔

بلکہ اکثر سلاطین کے حالات بھی ذیل کلام میں آ گئے ہیں۔ عبارت نہایت صاف

مجالس العشاق ہے۔ ابوالغازی سلطان حسین نے ۹۰۸ھ مطابق ۱۵۰۳ء میں مجالس العشاق لکھی اور

اپنی علمی قابلیت کا پورا ثبوت دیا۔ دیباچہ کی عبارت رنگین ہے اور شعرائے

صوفیہ کے کلام سے مزین۔ ابتدا میں عشق حقیقی اور مجازی کی بحث ہے۔ پھر

۷۶ مضمون ہیں جن میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے لیکر جامی تک کے حالات

درج کئے ہیں آخر میں اپنے حالات بھی لکھے ہیں۔ اس نے بابر نامہ کا بابر کی

تصنیف ہونے سے انکار کیا ہے اور کہتا ہے کہ میر علی شیر کا تربیت یافتہ کمال الدین

حسین گازرگاہی اس کا مصنف ہے۔ دیکھو اس زمانے کے سلاطین بھی طبقۂ

اہل علم میں داخل ہونا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔ ملا حسین[1] واعظ کاشفی

اس زمانے کے کامل انشا پرداز تھے سلطان ابوالغازی نے انھیں خراسان

کے بلاد کے ہرات کا خطیب مقرر کیا اور یہیں ۹۱۰ھ میں انکا انتقال ہوا۔

طرز تحریر نہایت رنگین اور دلکش ہے۔ نثر میں پوری نظم کی دلکشی ہے اور جا بجا

نظموں نے سونے میں سہاگے کا کام کیا ہے۔ ان کی نثر کے بارے میں یہ کہا

جا سکتا ہے کہ گلستاں اور سہ نثر ظہوری کی درمیانی حالت میں ہے یعنے نہ گلستاں

کے سے بے تکلف اور سہل ممتنع فقرے ہیں۔ نہ ظہوری کے پیچ در پیچ

استعارات و صنائع۔ آورد ہے مگر اعتدال کے ساتھ مترادف الفاظ اور جملے

روضۃ الشہدا ہیں مگر تکلیف دہ نہیں۔ ان کی تصانیف میں روضۃ الشہدا معروف بہ

دہ مجلس ہے۔ محققانہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو بعض واقعات مصائب امام حسین

علیہ السلام میں ضعیف بلکہ موضوع بھی ملیں گے مگر ترتیب ایسی دلکش ہے

کہ مجالس میں عام طور سے یہی پڑھی جاتی ہے اور فرمائش ہوتی تھی کہ روضۃ الشہدا

---

[1] حبیب السیر میں انکا نام کمال الدین حسین لکھا ہے اور خوش آوازی کی بھی تعریف کی ہے۔

خوان کو بلائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجلسین پڑھنے والے روضہ خوان کہلانے لگے۔

اخلاق محسنی **اخلاق محسنی** (مؤلفہ ۹۰۰ھ مطابق ۱۴۹۵ء) میں مختلف اخلاق فاضلہ کی توضیح کی ہے مگر عربیت کی کثرت سے ہر توضیح مغلق ہو گئی ہے۔ پھر ہر خلق کے متعلق حکایتیں درج کی ہیں۔ اگر گلستاں کا جواب سمجھا جائے تو دونوں میں ذرہ اور آفتاب کی بھی نسبت نہیں۔

انوار سہیلی یوں بہت اچھی ہے۔ **انوار سہیلی** میں کلیلہ و دمنہ کا قصّہ نہایت شیریں اور دلکش انداز میں لکھا ہے اگرچہ زورِ قلم سے داستان کو بیحد طویل کر دیا ہے۔

لب لباب مثنوی مولانا روم کا خلاصہ بھی تیار کیا تھا جس کا نام **لب لباب** ہے۔

جواہر التفاسیر اور تفسیر میں جواہر التفاسیر لکھی تھی۔ **محقق دوانی** (جلال الدین محمد بن سعد الدین اسعد) ۸۲۸ھ میں پیدا ہوئے۔ پہلے اپنے والد ماجد کے شاگرد ہوئے پھر ملا محی الدین انصاری۔ خواجہ حسن شاہ اور سید شریف وغیرہ سے درسیات پڑھے یہاں تک کہ علمائے زمانہ میں شمار ہونے لگا اور رفتہ رفتہ محقق کہلانے لگے۔ تحصیل علم سے فراغت حاصل ہونیکے بعد گازروں کے قاضی ہوئے پھر مدرسۂ دارالایتام کے صدر مقرر ہوئے۔ سلاطین آق قویونلو نے انھیں قاضی القضاۃ کا عہدہ عطا کیا۔ آخر ۹۰۸ھ میں انتقال کیا۔ نظم میں فانی تخلص تھا اور نثر میں عمدہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ شرح ہیاکل۔

اخلاق جلالی شرح عقائد عضدی۔ نور الہدایہ وغیرہ مگر شہرت انکی **اخلاق جلالی** سے دنیائے ادب میں قائم ہوئی۔ یہ کتاب ۱۴۶۷ء اور ۱۴۷۷ء کے درمیان میں تصنیف ہوئی ہے عبارت کسی قدر دقیق ہے اور جملے طویل۔ عالمانہ و حکیمانہ رنگ کے آدمی ہیں اخلاق ناصری کے مباحث اپنے رنگ میں بیان کئے ہیں مگر اتنی پختگی نہیں جتنی محقق طوسی کے یہاں ہے لیکن کسی دوسرے کی مجال نہیں کہ ان سے اس رنگ میں ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔

افسوس کہ نثر ہی کے بیان میں اتنا طول ہو گیا اور ابھی بہت لوگ

باقی ہیں مگر اب ہم ایک اور بزرگ کا ذکر کرتے ہیں جو اس عہد کے نظم و نثر دونوں کے خاتم ہیں۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی کی تاریخ ولادت ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ مطابق ۷ نومبر ۱۴۱۴ء ہے اور مولد جام۔ انکا فروغ ہرات میں ہوا۔ درسیات سے فراغت کے بعد علوم باطن کی طرف توجہ ہوئی اور شیخ سعدی کاشغری کے مرید ہوکے ایسا تصفیہ قلب کیا کہ شیخ کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ علم و فضل کے علاوہ فن شعر اور سلسلہ ارادت میں جامی کا پایہ اتنا بلند ہے کہ اس جامعیت کا شخص ایران میں مشکل سے نظر آئے گا۔ سلاطین روزگار انکی عزت کرتے تھے۔ اور صاحبان ثروت انکی خدمت کو اپنا فخر سمجھتے تھے۔ اس مقام پر انکی کتابیں نثر کی ذکر کی جاتی ہیں۔ نظم پر نظر اس دور کے خاتم الشعرا کی حیثیت سے آخر میں کی جائیگی۔ **نفحات الانس** شاہی میں اولیا کا تذکرہ ہے تاریخ تصنیف ۸۸۳ھ مطابق ۱۴۷۸ء ابتدا میں تاریخ تصوف سلیس زبان میں بیان کی ہے مگر حالات تاریخی ترتیب سے لکھے ہیں یہانتک کہ کمال اسمٰعیل۔ حافظ شیرازی اور مغربی وغیرہ حالات بھی آگئے ہیں۔ مذاق سلیم کا اندازہ طرز تحریر سے ہوتا ہے کہ واقعات کے بیان میں لفاظی اور صنعت گری سے بالکل دور رہتے ہیں۔ دوسری تصنیف **بہارستان** ہے جسے گلستاں کے جواب میں لکھا ہے۔ اس کی عبارت میں کسی قدر تکلفات ہیں اور گلستاں سے قطع نظر کرکے نہایت عمدہ کتاب ہے۔ ہاں سعدی کا مقابلہ اس میدان میں بالکل بیکار ہے۔ **اشعۃ اللمعات** عراقی کے لمعات کی شرح تصوف میں بے نظیر کتاب ہے اور دقائق معارف کو نہایت خوبی سے حل کیا ہے۔ ۸۸۶ھ میں یہ کتاب ختم ہوئی اور تمّت تاریخ اختتام ہے۔ اسی طرح لوائح بھی تصوف میں ہے۔ طرز تحریر کے اندازہ کے لئے خاتمہ کے چند فقرات لکھے جاتے ہیں:۔

جامی

نفحات الانس

بہارستان

اشعۃ اللمعات

لوائح

الٰہی الٰہی خلِّصنا من اشتغال الملاہی واَرِنا

حقائق الاشیاء کما ہی۔ غشاوتِ غفلت از بصرِ بصیرت ما بکشاے۔ وہر چیز را چنانکہ ہست بنماے۔ نیستی را در صورتِ ہستی جلوہ مدہ۔ و از نیستی بر جمالِ ہستی پردہ منہ۔ این صورِ خیالی را آئینہ تجلیاتِ جمالِ خود گرداں نہ علتِ حجاب و دوری۔ و ایں نقوش وہمی را سرمایۂ دانائی و بینائی ما گرداں نہ آلتِ جہالت و کوری" الخ

مولانا جامی کے اور بھی تصانیف نادرہ ہیں یہاں تک کہ موسیقی پر بھی ایک رسالہ لکھا ہے مگر ہم اب اختصار کو مدّنظر رکھ کے تاریخ نظم شروع کرتے ہیں۔

ابن یمین — امیر فخر الحق والدین محمود بن یمین فریومدی المتوفی ۷۶۹ھ مطابق ۱۳۶۷ء انکے باپ یمین الدولہ ترکی النسل تھے اور سلطان الجایتو کے زمانے میں آکے فریومد میں مقیم ہوئے تھے۔ خواجہ علاء الدین وزیر سلطان ابوسعید انکے مربی تھے ابن یمین اسی قریہ میں پیدا ہوئے۔ صاحب مجمع الفصحا وغیرہ نے انھیں سربداریوں کے مدّاحوں میں شمار کیا ہے اور امیر تغا تیمور کا بھی مداح سمجھا ہے۔ کہتے ہیں کہ سربداریوں کے ہنگامۂ زوال میں دیوان ضائع ہوگیا۔ اخلاقی شاعری میں قطعات بہت بلند پایہ کے ہیں۔ تمثیلات میں قوتِ تخیل بھی نہایت قوی ہے اور زبان سلیس اور شستہ۔ جاہ طلبی پر کیا خوب کہا ہے:۔

زدیوانہ کرد روزے سوال — سلیمان مرسل علیہ السلام
کہ چوں بینی ایں سلطنت کز پدر — مرا ماند با اینہمہ احتشام
چہ خوش گفت دیوانہ او را جواب — کہ چوں نیست ایں مملکت مستدام

پدر ہرزہ آہن سرد کوفت — تو در باد پیمودنی صبح و شام
بیکار کام کرنا — بیکار کام کرنا

تخت سلیمان اور زرہ سازی داؤد پر نظر کرو تو محاورات میں لطف

ایہام خاص رنگ میں نظر آئے گا۔ زر پرست شعرا کی شان میں کہتے ہیں :۔

شاعری نیست پیشۂ کہ ازاں ۔۔۔ رسدت نان و نیز ترّہ و دوغ

راستی سخت زشت و بے معنی است ۔۔۔ اجرتے خواستن برائے دروغ

زاں بود کار شاعراں بے نور ۔۔۔ کہ ندارد چراغ کذب فروغ

کبھی کبھی رموز فلسفہ اور نکات تصوّف بھی نظم کرتے ہیں اور صفائے زبان کی قوت سے دقیق مطالب کو آسان کر دیتے ہیں ۔

خواجو کمال الدین ابو العطا محمود بن علی بن محمود المعروف بہ **خواجوے کرمانی** شرفائے کرمان سے تھے۔ ۶۷۹ھ میں پیدا ہوئے۔ علوم رسمیہ پڑھ کے سیاحت کا شوق ہوا۔ مختلف بلاد کا سفر کیا۔ اسی سلسلے میں شیخ علاء الدین سمنانی کے مرید ہوئے۔ شاعری کی حیثیت سے آغاز حال میں انکا تعلّق پہلے آل مظفر کے دربار سے معلوم ہوتا ہے اور غالباً یزد میں **مبارز الدین محمد** مظفری کے یہاں ابتدا میں حاضری دی ہے۔ پھر **شیخ ابو اسحٰق انجو** کے یہاں شیراز میں رہے۔ بعض قصائد میں **شیروانشاہ** اور **قزل ارسلان** والی عراق کی تعریف کی ہے اور بعض میں دربار بغداد سے بھی تعلق ظاہر کیا ہے۔ بظاہر سیر و سیاحت کا شوق ایسا غالب تھا کہ کہیں جم کے نہ رہے۔ خزانہ عامرہ میں لکھا ہے کہ شیخ ابو اسحٰق کے بیٹے **ابو سہل** کا ختنہ ہوا۔ اس تقریب میں **خواجو** نے ایک قصیدہ کہا۔ بادشاہ نے انعام میں ایک کشتی اشرفیوں سے بھر کے عطا کی۔ یہ دولت دیکھتے ہی شادی مرگ ہو گئے۔ سال وفات ۷۵۳ھ ہے اور مدفن مقام اللہ اکبر جو بعد کو **حافظ شیرازی** کی سیر گاہ بن گیا تھا۔ غزل گوئی[1] انکا خاص جوہر ہے۔ حافظ کہتے ہیں :۔

استاد غزل **سعدی** است پیش ہمہ کس اما ۔۔۔ دارد سخن **حافظ** طرز روش **خواجو**

---

[1] غزل گوئی کی تنقید کے لئے صفحہ (۲۴۳) دیکھو۔

خمسہ نظامی کا جواب بھی نظم کیا ہے۔ نوروز گل[1] (۵۱۲۶ شعر) ہمائے[2] و ہمایوں (۳۲۰۳ شعر) کمال نامہ[3]۔ روضۃ الانوار[4]۔ ایک[5] اور مثنوی جس کا نام یاد نہیں آتا۔ علاوہ ان کے قطعے اور رباعیاں بھی کہی ہیں اور مستزاد بھی نظم کئے ہیں:۔

کس نیست کہ گوید زمن آن ترک خطا را	گر رفت خطائے
باز آے کہ داریم توقع بتو ما را	یا وعدہ وفائے
مندا ز بنام من دلسوختہ قلقل	برآتش رخسار
ملیندا ز کافتادم ازاں دانۂ مشکین تو یا را	در دام بلائے
امروز منم چوں خم ابروے تو در شہر	مانند ہلالے
تا دیدہ ام آں صورتِ انگشت نما را	انگشت نمائے
در شہر شما قاعدہ باشد کہ نپرسند	احوال غریباں
آخر چہ زیاں مملکت حسن شما را	از بے سر و پائے الخ

عبید زاکانی

عبید زاکانی[1] نظام الدین عبید اللہ کی نشو و نما شیراز میں **ابو اسحق انجو** کے زمانے میں ہوئی اور علم و فضل میں امتیاز حاصل کیا یہاں تک کہ قزوین کا قاضی مقرر ہو گیا۔ اسکے زمانے میں تاتاریوں کی بڑھی ہوئی قوت سے ایرانیوں کی حالت خراب کر دی تھی اور اخلاق رذیلہ کی طرف شغف بڑھتا جاتا تھا۔ مجبوراً اس زمانے کی حالت دکھانے کے لئے **اخلاق الاشراف** تصنیف کی اور جہالت کا خاکہ رسالۂ دلکشا میں کھینچا۔ پھر اخلاق حسنہ کی تعلیم کے لئے **رسالۂ صد پند** اور **رسالۂ تعریفات** تصنیف کئے۔ جن سے اس کا کمالِ علمی بخوبی ثابت ہوتا ہے۔ خستہ حالی اور ناداری کے غلبہ نے درباری شعرا میں داخل ہونے کا شوق پیدا کیا اور ایک رسالہ معانی و بیان میں تیار کر کے

---

[1] زاکان اضافات قزوین کا ایک قریہ ہے۔ سال وفات ۷۷۲ھ مطابق ۱۳۷۱ء

ابواسحق کو پیش کرنا چاہا مگر اہل دربار نے کہا کہ بادشاہ کو یہ لغویات پسند نہ آئیں گے۔ پھر ایک قصیدہ نظم کیا۔ مگر کہا کہ بادشاہ جھوٹی خوشامدیں ناپسند کرتا ہے۔ آخر ہزل گوئی شروع کردی اور بے تکان ہجوئیں تصنیف کرنے لگا جن میں سے اگر فحش نکال ڈالا جائے تو عالی دماغی۔ نازک خیالی سب کچھ ملیگی۔ اب عبید کی طرف توجہ ہوگئی اور بڑے بڑے انعام اور جائزات ملنے لگے۔ زمانے کا عجیب رنگ ہے عبید سا ہنرمند اور یہ تفضیح اوقات! خود جل کے کہتا ہے:۔

ای خواجہ مکن تا بتوانی طلبِ علم — کاندر طلب راتبِ ہر روزہ بمانی
رزق ۱۲ عاجز ہو جائیگا ۱۲

رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز — تا دادِ خود از مہتر و کہتر بستانی

سلمان ساوجی اس کا ہمعصر تھا۔ اس نے جو فن شعر میں یہ لغویات سنے تو عبید سے ناراض ہوگیا اور کہا:۔

جہنّمی ہجاگو عبید زاکانی — مقرر است بہ بیدولتی و بیدینی

اگرچہ نیست ز قزوین و روستازادہ است[۱] — ولیک میشود اندر حدیث قزوینی[۱]

عبید نے یہ ہجو سنی تو بغداد جا پہونچا۔ دیکھا سلمان دجلہ کے کنارے بڑی شان و شوکت سے کھڑا ہوا سیر کر رہا ہے اور علما و کاملین فن اسے حلقے میں لئے ہوئے ہیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح یہ بھی اُس صحبت میں شریک ہوا۔ سلمان نے یہ مصرعہ کہا:۔

دجلہ را امسال رفتارے عجب مستانہ است

اور کہا کہ کوئی اس پر دوسرا مصرعہ لگائے۔ عبید نے برجستہ جواب دیا:۔

پائے در زنجیر و کف بر لب مگر دیوانہ است[۲]

---

[۱] یعنے گفتگو میں آسے قزوینی کہنا ٹھیک ہے حالانکہ اس سے بدتر ہے کیونکہ قزوین کا دیہاتی ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ ایران میں قزوینی لوگ بیوقوف سمجھے جاتے تھے جیسے طوس کے لوگ بیل اور خراسانی لوگ گدھے۔ ہندوستان میں بھی بعض مقامات ایسے ہی خصوصیات سے منسوب ہیں۔ [۲] دولت شاہ نے یہ مصرعہ نام بخاری سے منسوب کیا ہے۔

سلمان پھڑک گیا اور پوچھا کہ "کہاں سے آئے ہو؟" جواب دیا "قزوین سے"۔ پوچھا ہمارے اشعار بھی وہاں مشہور ہیں یا نہیں" کہا "ہاں! یہ اشعار مشہور ہیں:۔

من خراباتیم و بادہ پرست — در خراباتِ مغان عاشق و مست
می کشندم چو سبو دوش بدوش — می برندم چو قدح دست بدست
مردمان مرا می کشند — مرا می برند

میرے نزدیک بھی سلمان ایک کامل شاعر ہے مگر یہ اشعار اُسکی بیوی کے معلوم ہوتے ہیں" سلمان جھینپا اور سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو عبید یہی ہے اور اپنی ہجو کی بہت معذرت کی۔ اب یہ بغداد میں رہنے لگا اور سلمان اسکی خاطر کرنے لگا۔ عبید کہا کرتا تھا کہ "سلمان تم بڑے خوش قسمت ہو کہ میری زبان کے زہر سے ہلاک نہ ہوئے"۔

عبید کے تصانیف میں **عشاق نامہ** بھی قابل ذکر ہے۔ اسکے علاوہ قصائد و قطعات ہیں جو سنجیدگی کے عالم میں نظم ہوگئے اور ہزلیات سے کوسوں دور رہے مثلاً:۔

افتادہ باز م در سر ہوائے — دل باز دارد میلے بجائے
او شہریارے من خاکسارے — او بادشاہے من بینوائے
بالا بلندے گیسو کمندے — سلطان حسنے فرماں روائے
ابرو کمانے نازک میانے — نا مہربانے تنگے دغائے
دارد شکایت ہر کس ز دشمن — مارا شکایت از آشنائے

دیکھو کتنی شیریں زبان ہے اور کیسی دلکش طرز ادا۔ افسوس! متاخرین نے اس رنگ کی قدر نہ کی۔ ایک مثنوی اسکی اور دلچسپ ہے جسے فارسی کا چوہے نامہ کہنا چاہئے۔ اس کا نام موش و گربہ ہے۔ بلّی کی تعریف ہے:۔

از قضائے فلک یکے گربہ — بود چوں اژدہا بکرمانا

گربۂ دور بین و شیر شکار | کہربا چشم و تیز مژگانا
پاے کژ دم عقاب پیشانی | بود پر مکر و پر ز دستانا
شکمش طبل و سینہ اش قاقم | ابروش قوس و تیز دندانا

یہ بلّی گوشت کی تلاش میں میخانے پہونچی اور ایک خُم کے پیچھے چھپ کے بیٹھ رہی۔ ایک چوہا ڈینگیں مارتا ہوا نکلا کہ میں رستم وقت ہوں۔ بلّیوں کا مجھسے دم نکلتا ہے :۔

سر صد گربہ را ببخشم من | گر شود رو برو بہ میدانا

× × × × × × × ×

ناگہاں جست و موش را بگرفت | گفت موشک کجا بری جانا
موش گفتا کہ من غلام توام | عفو کن بر من ایں گناہانا

غرض بلّی اُسے کھا گئی۔ پھر اپنے گناہ پر نادم ہو کے ایک مسجد میں گئی اور توبہ و استغفار کرنے لگی۔ چوہوں کو خبر ہوئی تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے :۔

مژدگانے کہ گربہ عابد شد | زاہد و مومن و مسلمانا

پھر سات چوہوں کا وفد مع تحف و ہدایا کے روانہ کیا مگر بلّی انھیں پکڑ کے کھا گئی۔ آخر تیں لاکھ تیس ہزار چوہوں کی فوج لے اس پر حملہ کیا اور قید کر کے اپنے بادشاہ کے پاس لے گئے۔ حکم ہوا کہ اُسے سُولی دیجائے۔ یہ قید توڑ کے نکل آئی اور چوہوں کے بادشاہ اور رعایا سب کو قتل کر ڈالا۔

ہست ایں قصۂ عجیب و غریب | یادگار عبید زاکانا[1]

بسحاق اطعمہ ابو اسحٰق فخرالدین احمد حلاج شیرازی کو بسحٰق اطعمہ بھی کہتے ہیں۔ اسکندر بن عمر شیخ مرزا والی فارس و اصفہان اس کا مربّی تھا۔ فن شعر میں اسکا

---

[1] یہ شعر ضرب المثل ہو گیا ہے۔

رنگ خاص تھا۔ ہر نظم میں کھانے کا ذکر ہوتا تھا۔ استعارہ تشبیہ۔ صنائع۔ غرض ہر قسم کی تخیل۔ اسی التزام کے ساتھ ہوتی تھی شلاً اسکے پیر شاہ نعمت اللہ نے یہ رباعی کہی:۔

گوہر بحر بیکراں مائیم — گاہ موجیم دگاہ دریائیم
ما بدیں آمدیم در دنیا — کہ خدا را بخلق بنمائیم

اس نے فوراً یوں اُلٹ دی:۔

رشتۂ لاک معرفت مائیم — گہ خمیریم دگاہ بغرائیم
ما ازاں آمدیم در مطبخ — کہ بما ہیچ قلیہ بنمائیم
(موئے خمیر)

نعمت اللہ سے جو ملاقات ہوئی تو کہا کہ میں نے خدا کا ذکر کیا تھا تو نے یہ کیا کیا؟ جواب دیا کہ "اللہ تک تو رسائی نہ تھی میں نے نعمت اللہ (خدا کی نعمت) کا ذکر کیا"۔ اپنی شاعری پر فخر کرتا ہے:۔

خوانے کشیدہ ام زسخن قاف تا بقاف — ہم کاسۂ کجاست کہ آید برابرم

کلیات کا نام دیوان اطعمہ نام ہے۔ رباعی۔ غزل۔ قصیدہ۔ قطعہ۔ سب کچھ کہا ہے اور اسی رنگ میں کہا ہے۔

محمود قاری — نظام الدین محمود قاری یزدی نے دیوان البسہ جمع کیا۔ یہ لباسوں کا ذکر کرتا ہے۔ کبھی کبھی مقامی محاورات میں اشعار بھی کہے ہیں اور یہی اسکے فہلوبات وشیرازیات ہیں۔

شاہ نعمت اللہ — شاہ نعمت اللہ کرمانی کا کلام تصوف میں یادگار ہے۔ اُنکے والد کا نام میر عبداللہ ہے اور نسب امام محمد باقر علیہ السلام تک پہونچتا ہے۔ سنہ ۷۳۰ھ مطابق سنہ ۱۳۲۹ء میں بمقام حلب آپ کی ولادت ہوئی ۲۴ برس کے تھے کہ حج بیت اللہ کیا اور مکہ معظمہ میں سات برس مقیم رہے۔ پھر سمرقند۔ ہرات اور یزد میں زندگی کے دن کاٹے آخر عمر میں کرمانشاہ واپس آئے اور وہیں ۲۲ رجب ۸۳۴ھ مطابق ۵ اپریل ۱۴۳۱ء میں

انتقال کیا۔ مقبرہ آپکا ماہان کرمانشاہ میں آجتک موجود ہے اور لوگ زیارت کرنے جاتے ہیں۔ اکثر قصائد آپکے نام پر منسوب ہیں جنمیں بذریعہ کشف اخبار آیندہ کی پیشین گوئی کی ہے چنانچہ ایک قصیدے میں کہتے ہیں :۔

از نجوم ایں سخن نمی گویم   بلکہ از کردگار می گویم

غزلیں اکثر وحدت الوجود کے رنگ میں ہیں یا حقائق تصوّف کی تشریح میں مثلاً :۔

بادشاہ و گدا یکیست یکیست   بے نوا و نوا یکیست یکیست
دردمندیم و دَرد مینوشیم   دَرد و دَرد و دوا یکیست یکیست
آئینہ صد ہزار می بینم   روی آں جانفزا یکیست یکیست
مبتلائے بلائے بالائیم   مبتلا و بلا یکیست یکیست الخ

قاسم الانوار کا نام سادات صوفیہ میں مشہور ہے مسقط الراس تبریز کے مضافات میں سراب میں ہے اور سال ولادت ۷۵۷ھ (مطابق ۱۳۵۶ء) انکے مرشدوں میں خاندان صفویہ کے مورث اعلیٰ شیخ صدر الدین اردبیلی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ گیلان و خراسان میں بقصد توطن بود و باش اختیار کی تھی مگر رہ نہ سکے اور ہرات میں جاکے قیام کیا۔ یہاں پیری مریدی کا سلسلہ شروع ہوا۔ احمد لُر نے جب ۸۳۰ھ (مطابق ۱۴۲۷ء) میں شاہرخ کو چھری ماری تھی تو مرزا بایسنغر کو ان پر بھی اس جرم میں سازش کا اشتباہ ہوا۔ آخر ہرات چھوڑ کے سمرقند چلے گئے اور الغ بیگ نے انھیں پناہ دی۔ آخر عمر میں خراسان واپس آئے اور ۸۳۷ھ (مطابق ۱۴۳۳-۳۴ء) میں انتقال کیا۔ انیس العارفین و انیس العاشقین کے علاوہ ایک کلیات نظم چھوڑا ہے جس میں حقائق تصوّف سے بحث کی ہے اور تلمیحات صوفیہ بھی ایسے ہیں کہ عوام سمجھ نہیں سکتے۔ رنگِ طبیعت کا اندازہ (margin: قاسم الانوار)

اس غزل کے بعض اشعار سے ہو جائیگا :-

ستہ ایام گفت و سبع سماوات — ثم علی العرش استواست نہایات

حضرتِ حق را عرش نامتناہی است — فاش بگویم عرش جملۂ ذرات

بہر ہر ذرہ مستوی است با سمے — چوں بشناسی رسی بہ نیل مرادات

نعرۂ مستی مزن کہ مست ہوائی — غایت عمیا بود بجہل مباہات

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ یہ غزل فرقۂ حروفیہ[1] کے رنگ میں کہی ہے اور مولانا جامی نے الخبیص اس انتساب میں کسی قدر ماخوذ کیا ہے۔ والعلم عند اللہ۔

مثنوی انیس العارفین بھی تصوف میں ہے جسکے بعض اشعار شیخ صفی الدین اردبیلی کی تعریف میں ہیں:۔

شیخ عالم آفتاب اولیا — پیشوائے دیں صفی الاصفیا

آنکہ از وے گشت مشہور اردویل — وز جمالش گشت پرنور اردویل

اردبیل

---

[1] فرقہ حروفیہ کی ابتدا فضل اللہ استرابادی کی ذات سے امیر تیمور کے زمانے میں ۸۰۰ھ میں ہوئی۔ یہ لوگ حروف تہجی کو مظاہر حالات انسانی سمجھتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ حلال وحرام کے منکر تھے۔ ابتدا میں کوشش رہی کہ یہ مذہب خاندان تیموریہ میں پھیل جائے مگر احمد لُر کی وجہ سے یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ اسکی جیب سے بوقت قتل ایک کنجی برآمد ہوئی جس سے ایک مکان کھولا گیا معلوم ہوا کہ وہ حروفیوں کی خفیہ خانقاہ ہے اور اس سوسائٹی کے ممبروں کے نام بھی معلوم ہو گئے جو رفتہ رفتہ قتل کر ڈالے گئے۔ ۷۹۶ھ میں میرانشاہ نے فضل اللہ کو قتل کرکے لاش کو تشہیر کرایا اس واقعے سے حروفیوں میں جوش پیدا ہوا اور اپنا مذہب پھیلانے نکل پڑے چنانچہ ایک خلیفہ علی الاعلی بلاد روم میں پہونچا اور وہاں بکتاشیوں میں مل کے اپنے اعتقاد پھیلائے جسکے آثار آج تک ملتے ہیں۔ جاویدنامۂ کبیر فضل اللہ کی کتاب اور اسکے خلفا کے پانچ جاویدان اس مذہب کے اصل لٹریچر ہیں۔ انکے علاوہ آدم نامہ، عرش نامہ، ہدایت نامہ، استوا نامہ، کرسی نامہ، محبت نامہ وغیرہ فارسی میں ہیں اور فیض نامہ، گنجنامہ وغیرہ ترکی میں ہیں۔ انکے جاویدان میں بعض مقامات مبہم ہیں اور رموز میں بیان کئے گئے ہیں جسکا حل انکی ایک کتاب مفتاح الحیات میں ہے۔ ترکی شعرا میں اس فرقے کے لوگ نامور ہوئے ہیں۔ ایران میں یہ مذہب نہ پھیل سکا۔

اسکے بعد شیخ سعدی سے ملاقات کا ذکر کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ حقائق معرفت سُن کے شیخ نے صفی الدین کے کمال باطنی کا اعتراف کیا اور کہا:۔

داری الحق مملکتِ بے انتہا — گر لغش اللہ یہدی من یشاء

ابھی اس عصر کے بہت سے شعرا باقی ہیں جیسے کاتبی نیشاپوری۔ عارفی ہروی۔ کمال خجند۔ مغربی نیشاپوری وغیرہ مگر بخیال اختصار اب ہم تین ممتاز شاعروں کا حال اور لکھتے ہیں جن کی ذاتیں فارسی لٹریچر کے لئے مایہ ناز ہیں یعنے سلمان ساوجی۔ خواجہ حافظ شیرازی اور ملا جامی۔

جمال الدین محمد سلمان بن علاء الدین محمد ساوجی اپنے وطن ساوہ (عراق عجم) میں ۷۰۰ھ (مطابق ۱۳۰۰ء) میں پیدا ہوا اور درسیات پڑھنے کے بعد شعر گوئی کی طرف توجہ کی۔ ابتدائی شاعری کا نمونہ وہ مرثیہ ہے جو سلطان ابوسعید کے انتقال پر نظم کیا تھا۔ سال بھر بعد (۱۲ رمضان ۷۳۶ھ میں دوسرا مرثیہ غیاث الدین محمد کے قتل پر کہا۔ اسی سال حسن بزرگ ایلخانی نے خاندان جلائر کی سلطنت بغداد میں قائم کی اور سلمان وہاں چلا گیا۔ حسن بزرگ کی زوجہ دلشاد خاتون جو اپنی قابلیت خداداد کے زور پر سلطنت بغداد کو چلا رہی تھی۔ سلمان کی قابلیت کی خاص قدردان تھی اور وہ بھی اسکی مداحی نہایت زور و شور سے کرتا تھا۔ سلمان

حسن کے بعد سلطان اویس بادشاہ ہوا۔ یہ شاعر بھی تھا اور سلمان سے اصلاح لیا کرتا تھا۔ مختصر یہ کہ جلائری خاندان کے عروج کا زمانہ ملجانے کی وجہ سے سلمان ساوجی کا ڈنکا بج گیا اور عزت و دولت دونوں چیزیں اچھی طرح ملیں۔ آخر عمر میں ملازمت ترک کر کے خانہ نشین ہو گیا اور ۱۲ صفر ۷۷۸ھ مطابق یکم جولائی ۱۳۷۶ء کو راہی ملک بقا ہوا۔ اسکے کلیات میں دو مثنویاں (فراق نامہ اور جمشید و خورشید) اور متعدد قطعات و غزلیات و قصائد وغیرہ ہیں۔ کلام میں اتنی قوت ہے

کہ خواجہ حافظ فرماتے ہیں :۔

سرآمد فضلائے زمانہ دانی کیست | ز راہ صدق ویقیں نی ز راہ کذب وگماں
شہنشہ فضلا پادشاہِ ملکِ سخن | جمالِ ملت ودیں خواجۂ جہاں سلماں

فی الحقیقت خواجہ سلمان کی شاعری کی داغ بیل کمال اسمٰعیل اور ظہیر فاریابی کی طرح پہ پڑی اور اکثر انھیں کے جواب میں قصائد نظم کئے لیکن ذوق سلیم اور مناسبت خداداد نے اس کا پایہ کافی بلند کر دیا۔ زبان میں شیرینی۔ ترکیبوں میں چستی۔ دقیق اور نازک مضمون آفرینی سے کلام مالا مال ہے۔ جدّت پسند اور شوخ طبیعت معمولی تشبیہوں اور استعاروں میں بھی مزہ بھر دیتی ہے :۔

چشمت بخنجرِ مژہ عالم خراب کرد | کس خنجرِ کشیدہ بمستے چناں دہد؟

مژہ کو خنجر کہنا یا آنکھوں کو مست کہدینا ہر شاعر کے لئے ممکن ہے مگر دوسرے مصرعے میں جو سوالیہ صورت اختیار کی ہے دیکھو کتنے مزے کی ہے۔ ایک سادہ شعر اسی قصیدے کا سنو :۔

در رستۂ جمالِ تو ہر کس کہ عاشق است | جانے بیک نظر دہد و بس گراں دہد

تخلیص کا مقام قصیدے میں قوت شاعری کی امتحان گاہ ہے۔ سلمان کی شوخ طبیعت عجیب نزاکتیں پیدا کر دیتی ہے۔ معشوق کے دہن کی تعریف میں مبالغہ کیا جاتا ہے کہ معدوم ہے اور فتنہ پرداز بھی۔ ان دونوں مبالغوں کو یکجا کر کے مدح کی طرف گریز کرتا ہے :۔

نیست پیدا دہنت برخ و در دولت شاہ | فتنہ آں بہ ہمہ وجہ کہ پنہاں باشد

مشکل ردیفیں اور قافئے اس کی زور طبیعت کے سامنے پانی ہیں :۔

منم امروز بلائے شب ہجراں برسر | کردہ در کار تو چوں شمع دل وجاں برسر
سرو بر پائے تو می میرد و مرغانِ چمن | میکنندش ہمہ شب نالہ و افغاں برسر

گریز دیکھو :۔

آفتابِ تو اگر سایہ زمن باز گرفت   باد پائندہ مرا سایۂ سلطاں بر سر

فخریہ شعر بھی خوب کہا ہے اور ردیف کو بالکل آسان کر دیا ہے :۔

شعرم از تربیتِ لطفِ تو بر جائے رسید   کہ نہندش ہمہ اشرافِ خراساں بر سر

حسن بزرگ جب (۷۳۹ھ مطابق ۱۳۳۸ء) میں بھاگ کے بغداد پہونچا سلمان کا قصیدہ تسکین قلب کے لئے موجود تھا مطلع سنو بے حد رنگین کہا ہے :۔

وقتِ صبحت ولبِ دجلہ و انفاس بہار   اے پسر کشتئ مے تا شطِ بغداد بیار

شاہ شجاع کی فتح آذربائجان پر (۷۷۶ھ مطابق ۱۳۷۵ء) جو تہنیت میں قصیدہ کہا اُس نے خود بادشاہ کے قلب کو مسخر کر لیا۔ مطلع یہ ہے :۔

سخن بوصف رخش چوں ز خاطرم سر زد   ز مطلعِ سخنم آفتاب سر بر زد

توریہ اور ایہام کا بے حد شوق ہے۔ "سر بر زد" ٹکرا یا یا نکل آیا دونوں معنوں پر لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کہا ہے :۔

بادِ سحر گہی بہوائے تو جان دہد   آبِ حیات را لبِ لعلت روان دہد

اس میں بھی "جان دہد" کے دو معنے ہیں۔ جان عطا کرنا اور مرنا اور دونوں معنے لئے جا سکتے ہیں۔ مذاقِ سلیم اس بد مذاقی کو بھی سنبھال لیتا ہے اور جہاں نہیں سنبھلی وہاں جگت بازی رہ گئی :۔

چشم سرمست ترا عین بلا می بینم   لیکن ابروئے تو چیزیست کہ بالائے بلاست

خدا اس ضلع جگت کے زہر سے ہر لٹریچر کو محفوظ رکھے ۔

اس میں شک نہیں کہ قصیدہ گوئی میں سلمان کا جواب ملنا دشوار ہے مگر قطعات میں بھی زورِ طبیعت کی یہی حالت ہے۔ ہجو کو دیکھو تو وہ بھی خوش فکری کا اعلیٰ نمونہ ہے ایک گھوڑا بادشاہ نے دیا اس کے بڈھے ہونے کی شکایت کرتا ہے اور

ذوق سلیم دو راز کار مبالغوں سے مانع ہے:۔

از بندہ مہتر ست بسی[بڑا] سال راستی   گستاخی است بر زبر مہتراں نشست

اپنے سے بڑوں پر سوار ہونا بے حد معیوب ہے اور یہی وجہ انکار۔

غزلیں کہی ہیں اور خوب کہی ہیں مگر سوز و گداز نہیں۔چند سادہ شعر لکھے جاتے ہیں جن پر قصیدہ گوئی کا رنگ نہیں چڑھا ہے۔ان میں کسی قدر تغزل ہے:۔

ایکہ در خواب غروری خبرے نیست کہ من   ہر شب از خاک درت بالش و بستر دارم

چشم فتاں تو ہر جا کہ بلا انگیز د   ای بسا کس کہ دراں عرصہ بلاش اندازد

مثنویوں میں کوئی خاص بات نہیں جو ذکر کیجائے۔ایک قادر الکلام قصیدہ گو کی نظمیں ہیں اور بس۔

حافظ   حافظ شیراز[۱]۔خواجہ شمس الدین محمد بن بہاءالدین محمد شیرازی۔باپ تجارت پیشہ تھے۔حافظ اور اُنکے دو بھائیوں کو چھوٹا چھوڑ کے انتقال کر گئے بدسلیقگی کی وجہ سے بھائیوں نے دولت اُڑا دی اور وطن آوارہ ہو گئے۔ حافظ شیراز ہیں رہے اور ماں نے پرورش کی۔گھر میں فاقے ہونے لگے تو خمیر گری اختیار کی۔اسی افلاس کے عالم میں پڑھنے کا شوق ہوا اور قرآن مجید حفظ کر کے کچھ درسیات بھی ختم کر لئے۔محلے میں ایک بزاز رہتا تھا۔وہاں شاعری کا چرچا تھا۔حافظ کو یہ صحبت پسند آئی اور خود بھی نظم کرنے لگے مگر بے تکے اشعار جن کی وجہ سے خوب بنائے جاتے تھے۔ایک دن اتنا بنائے گئے کہ دل ٹوٹ گیا۔بابا کوہی کے مزار پر رات بھر رو دیا کئے کہ یا تو شعر کہنا آجائے یا موت آجائے۔آخر آنکھ لگ گئی۔خواب میں امیر المومنین

---

[۱] شعر العجم جلد دوم میں نہایت عمدہ تحقیقی حال اور تنقیدی تذکرہ دیا ہوا ہے۔
یہاں جو کچھ لکھا جاتا ہے بیشتر اسی کا اقتباس ہے۔

علیہ السلام کی زیارت ہوئی جنھوں نے بشارت دی کہ مایوس نہ ہو۔ تجھ پر علوم کے دروازے کھل گئے۔ صبح اُٹھے تو یہ غزل کہی :۔

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند — واندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

مجمع میں جب یہ غزل پڑھی تو لوگوں کو حیرت ہوئی اور سمجھے کہ کسی سے کہوائے ہیں مگر امتحاناً جو طرح دی گئی اُسی میں عمدہ شعر کہدیئے۔ ابتو اُنکے کمال کا شہرہ ہوگیا اور سلاطین وقت کا تقرب نصیب ہوا۔ شاہ ابو اسحٰق انجو جس کا ذکر تربیت شعرا واہل کمال میں بار بار آیا ہے ان کا خاص قدرداں تھا اور حافظ صاحب بھی اسکا نام اپنے کلام میں بڑی محبت سے لیتے ہیں۔ جب مبارز الدین محمد بن مظفر کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا تو بے حد قلق ہوا۔ فرماتے ہیں :۔

راستی خاتمِ فیروزۂ بو اسحاقی — خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

(جلد جانے والی)

مبارزالدین کی عہد حکومت میں عیش و عشرت کا خاتمہ ہوگیا۔ شراب خانے بند کردیئے گئے محتسب مقرر ہوئے۔ لہو ولعب بالکل موقوف۔ یہ حال بھی نظم کیا ہے :۔

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است — بہ بانگِ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است

در آستینِ مرقع پیالہ پنہاں کن — کہ ہمچو چشمِ صراحی زمانہ خونریز است

امیر مبارزالدین کے بعد شاہ شجاع وارث تخت ہوا۔ یہ عیش پسند تھا۔ پھر شراب خانے کھل گئے اور دور چلنے لگے۔ اس کا حوالہ بھی دیوان میں موجود ہے :۔

سحر ز ہاتفِ غیبم ندا رسید بگوش — کہ دورِ شاہ شجاع است مے دلیر بنوش

خیال تھا کہ اس کے زمانے میں خوب کٹے گی مگر سوء اتفاق سے عماد فقیہ دربار میں بارسوخ تھے اور بادشاہ ان کا معتقد تھا مگر حافظ انھیں ریاکار سمجھتے تھے۔ فقیہ صاحب نے ایک بلی کو سدھایا تھا۔ جب وہ نماز پڑھتے تھے یہ بھی ساتھ ساتھ رکوع و سجود بجالاتی تھی۔ حافظ نے اسی زمانے میں ایک غزل کہی جس کا ایک شعر

چھپتا ہوا تھا:-

ای کبکِ خوش خرام کہ خوش میروی بناز غرّہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

صفت و موصوف کی صورت میں محض عبید زاکانی کے گربہ و موش کا حوالہ ہے جہاں اُس نے کہا ہے:-

مژدگانی کہ گربہ عابد شد زاہد و مومن و مسلمانا

مگر مضاف و مضاف الیہ کی حیثیت سے فقیہ صاحب پر لگتی ہوئی تھی۔ شاہ شجاع ناراض ہو گیا اور ہمیشہ اسی تاک میں رہا کہ خواجہ کو کسی طرح شکنجے میں لائے مگر اُسکا (۷۸۶ھ) میں انتقال ہو گیا اور منصور بادشاہ ہوا۔ خواجہ صاحب نے مبارکباد دی:-

بیا کہ رایت منصور بادشاہ رسید نوید فتح و ظفر تا بمہر و ماہ رسید

جب منصور تیمور کے ہاتھوں مارا گیا تو بغداد سے سلطان احمد بن اویس نے بلا بھیجا اور جانے کو جی بھی چاہتا تھا مگر وطن کی خاک دامنگیر نے نہ چھوڑا۔ غزل کہہ کے بھیج دی جس کا مطلع یہ ہے:-

احمدُ اللہ علیٰ معدلۃ السلطان احمدِ شیخ اویسِ حسن ایلخانی
از گلِ فارسی ام غنچۂ عیشی نشگفت حبذا دجلۂ بغداد و مئے روحانی

پھر دکن سے محمود شاہ بہمنی نے طلب کیا اور زادِ راہ بھی بھیجا۔ خواجہ صاحب نے بھی تہیۂ سفر کیا مگر راہ میں لٹ گئے۔ آخر دو تاجروں نے اُنکی کفالت کی اور ساحل تک لاکے جہاز میں بٹھا دیا۔ اتفاقاً جہاز چلنے نہ پایا تھا کہ طوفان آگیا۔ خواجہ صاحب ڈر کے اتر آئے اور یہ غزل کہہ کے بھیج دی:-

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد بمی بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد
بس آساں می نمود اول غم دریا ببوئے سود غلط کردم کہ یک موجش بصد من زر نمی ارزد

سلطان غیاث الدین حاکم بنگالہ نے بلایا مگر وہاں بھی نہ گئے۔ ایک قصّہ یہ بھی مشہور ہے کہ اسکی تین کنیزیں تھیں۔ سرو۔ گل۔ لالہ۔ بادشاہ بیمار ہوا تو یہ تینوں خدمت گذاری کرتی رہیں۔ جب غسل صحت کا وقت آیا تو تینوں میں تکرار ہونے لگی کہ کون غسل صحت دے۔ غرض فیصلہ ہوا کہ تینوں اس خدمت کو بجا لائیں۔ اس واقعے پر بادشاہ نے یہ مصرعہ کہا :۔

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود

اور حافظ کے پاس بھیجدیا کہ اسی پر غزل کہدیں۔ انھوں نے کہا :۔

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود — ویں بحث با ثلاثۂ غسالہ[1] می رود

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند[2] — زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

طیّ مکاں ببین و زمان در سلوک شعر — کایں طفل یکشبہ رہِ یکسالہ می رود

حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دین — غافل مشو کہ کارِ تو از نالہ می رود

خواجہ صاحب کی وفات ۷۹۱ھ (مطابق ۱۳۸۹ء) میں ہوئی۔ خاکِ مصلّٰی تاریخ وفات ہے اور یہی مقام مدفن جو اب حافظیہ[3] کہلاتا ہے اور آخر ماہ رجب میں لوگ زیارت کو جاتے ہیں۔ خود بھی کہہ گئے تھے :۔

بر سر تربتِ ما چوں گذری ہمّت خواہ — کہ زیارت گہِ رندانِ جہاں خواہد بود

شاخ نبات کے ساتھ انکی عشق و ازدواج کا قصہ پایۂ ثبوت تک نہیں پہونچا۔ البتہ تاہّل کیا تھا اور اولاد بھی تھی چنانچہ انکے ایک صاحبزادے شاہ نعمان ہندوستان میں آکے برہانپور میں مقیم ہوئے تھے اور اسیر گڈھ میں انکی قبر ہے (خزانۂ عامرہ)۔

---

[1] ثلاثۂ غسالہ وہ تین گھونٹ شراب کے ہیں جو صبوحی کے طور پر علی الصباح خمار شکنی کے لیئے پیے جاتے ہیں)۔

[2] ایران میں طوطی نہیں ہوتا۔ یہ ہندوستان کی چڑیا ہے اور شکر خوار سمجھی گئی ہے۔

[3] بابر بادشاہ نے یہ مقبرہ میر محمد معمائی کی تحریک سے بنوایا تھا۔

علاوہ بریں دیوان میں بعض اولاد کے مرنے پر مرثیے بھی موجود ہیں۔حافظ کی علمی حالت بھی نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے۔فارسی غزلوں میں بے تکلف عربی مصرعے نظم کئے ہیں اور معقول و منقول جاننے کا ادّعا بھی کیا ہے:۔

زحافظان جہاں کس چو بندہ جمع نکرد　　لطائفِ حکما با کتاب قرآنی

یہ بھی غلط ہے کہ امراء اور رؤسا کے درباروں سے علیحدہ تھے۔دیوان سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین وقت کی مدح سرائی کی ہے اور انعامات بھی حاصل کئے ہیں۔ ہاں گداگری نہیں کرتے تھے۔اگر کچھ مل گیا تو شکر ورنہ صبر:۔

شاہ ہر مز دیدم و مدحش گفتم و ہیچم نداد　　شاہ ہرمز نہ دیدہ بے سخن صد لطف کرد

داور دین رسالتِ تحقیق و نصرت شاہ یزید　　کارِ شاہان اینچنیں باشد تو اے حافظ مرنج

انکی شاعری کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب فن شعر کی طرف انھیں توجہ ہوئی تھی تو اُس زمانے میں سعدی ، خواجو اور سلمان کے کلام کا چرچا تھا۔پہلے خواجو کا کلام پیش نظر رکھا اور شعر کہنا شروع کیا:۔

اُستادِ غزل سعدی ست پیش ہمہ کس امّا　　دارد غزل حافظ طرزِ سخنِ خواجو

خسرو اور سعدی کا سوز و گداز دنیائے شعر کو تسخیر کرچکا تھا مگر خواجو اور سلمان نے جدید ترکیبیں اور شوخ استعارات ، تشبیہات کی قوت سے غزل میں بھی نام پیدا کرلیا۔پھر زمانہ بھی موافق تھا۔خواجو شیراز کا ملک الشعرا تھا اور سلمان بغداد کا۔ غریب خمیر گر کا کہیں ٹھکانا نہ تھا۔انھیں اُستادوں کے کلام سُنے اور کچھ اخذ کیا مثلاً خواجو کے کلام میں بے ثباتی دنیا کا ذکر ہے یا رندی و مستی کا جوش اور سلمان کے یہاں بدیع الاسلوبی ہے اور ضلع جگت بھی۔حافظ کے کلام کی داغ بیل انھیں پر پڑی ہے اور رفتہ رفتہ طبیعت خداداد نے وہ عمارت بنادی ہے جہاں غزل کو خود معراج نصیب ہوتی ہے۔خواجو کہتے ہیں:۔

خرقہ رہن خانۂ خمار دارد پیرِ ما　　　ای ہمہ رنداں مرید پیرِ ساغر گیرِ ما

حافظ نے جواب کہا ہے:۔

دوش از مسجد سوے میخانہ آمد پیرِ ما　　　چیست یارانِ طریقت بعد ازین تدبیرِ ما

اہل ذوق جانتے ہیں کہ دونوں مطلعوں میں کتنا فرق ہے؟۔ دوسرا شعر خواجو کا ہے:۔

گر شدیم از بادہ بدنامِ جہاں تدبیر چیست　　　ہمچنیں رفتست از روزِ ازل تقدیرِ ما

حافظ کہتے ہیں:۔

در خراباتِ مغاں ما نیز ہمدستاں شدیم　　　کاینچنیں رفتست از روزِ ازل تقدیرِ ما

دیکھو یہاں حافظ کتنا پست ہو گئے۔ نہ خواجو کی طرح تدبیر و تقدیر کا مقابلہ نہ عنوان ادا بے تکلف۔ خواجو کہتے ہیں:۔

تا دلِ دیوانہ در زنجیرِ زلفت بستہ ایم　　　ای بسا عاقل کہ شد دیوانۂ زنجیرِ ما

حافظ کا شعر ہے:۔

عقل اگر داند کہ دل در بندِ زلفش چوں خوش است　　　عاقلاں دیوانہ گردند از پئے زنجیرِ ما

یہاں بھی حافظ کا شعر پھیکا ہے اور خواجو کا شعر شوخ۔ دل دیوانہ تھا یا عاقل۔ وہ پھنس گیا اور حسن و عشق کا طلسم کامل ہو گیا۔ اب جو کیفیت پیدا ہو گئی ہے وہ اہل عقل کو بھی اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ حافظ نے عاقلوں کے دیوانہ ہونے کی وجہ بالتصریح بیان کر دی۔ والکنایۃ ابلغ من التصریح۔ اسی طرح سلمان سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ دیوانِ ازل نے کسی کو محروم نہیں رکھا خواجہ حافظ کہتے ہیں:۔

گل رفت ای حریفاں غافل چرا نشینید　　　بے بانگِ رود و چنگے بے یادہ جام و بادہ

سلمان کا شعر کہیں اچھا ہے:۔

سودائے زہد خشکم برباد دادہ حاصل   مطرب بزن ترانہ ساقی بیار بادہ

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہم طرح غزلیں بظاہر ابتدائی مشق کی ہیں ورنہ جب سے خداداد مقبولیت کا دور شروع ہوا رنگ ہی اور ہو گیا بلکہ جو خصوصیات انکی غزلوں میں پیدا ہو گئے اُن کا اجتماع کسی ذات میں بھی آجتک ممکن نہ ہوا۔ مثلاً شیرینی کلام اور فصاحت خداداد میں روزمرہ اور محاورات کی چاشنی دیکے شعروں کو دلکش بنادیا ہے اور انکے اشعار میں جوش اس قدر ہوتا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود صاحب معاملہ ہیں اور اپنی بیتی سنا رہے ہیں۔ مثلاً معشوق کی یاد میں ایک وجد کی حالت طاری ہوتی ہے اور کہتے ہیں :-

در نماز خم ابروے تو ام یاد آمد   حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

یا مثلاً نشہ کی ترنگ یاد آتی ہے اور شوق پیدا ہوتا ہے کہ مرتے دم تک یہی حالت رہے۔ کہتے ہیں :-

زان پیشتر کہ عالمِ فانی شود خراب   مارا بجام بادۂ گلگوں خراب کن

غریبوں کے ستانے کا انجام دکھاتے ہیں :-

بس تجربہ کردیم درین دیر مکافات   با دردکشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

یوں تو خواجہ صاحب ہر رنگ میں پُر جوش ہیں لیکن شراب و ساقی کے معاملات میں خدا جانے کتنا بلند ہو جاتے ہیں :-

بیا تا گُل برافشانیم وے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو دراندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم
چو در دست است رودے خوش بزن مطرب سرودِ خوش
کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم

خیام کی کائنات پر بھی خواجہ صاحب کا قبضہ ہے اور بوریائے فقر کو مسند جمشید سمجھتے ہیں بلکہ زمین سے آسمان تک جوش مسرّت سے لبریز نظر آتا ہے۔ اس سرشاری کا نتیجہ یہ ہے کہ سوز و گداز حافظ کے کلام میں گویا کہ مفقود ہو گیا۔ وہ اپنے رنگ میں مست ہیں :۔

بنوش بادہ کہ ایّام غم نخواہد ماند چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

شکوہِ تاج سلطانی کہ بیم جان درو درج است کلاہِ دلکش است اما بدردِ سر نمی ارزد

یہ وہ مقام ہیں جہاں خواجہ صاحب کی شخصی سلطنت ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ دم مار سکے۔ سلمان کا شعر ہے :۔

رندی و عاشقی و قلاشی ہیچ شک نیست کہ در ما ہمہ است

حافظ کہتے ہیں :۔

عاشق و رند و نظر بازم میگویم فاش تا بدانی کہ بچندیں ہنر آراستہ ام

جدّت ادا کا خاصّہ ہے کہ پرانی بات نئے انداز سے کہدی جائے۔

خواجہ صاحب کا یہ رنگ خاص ہے اور جب ادھر متوجہ ہوتے ہیں تو مضمون بالکل اپنا کر لیتے ہیں۔ سعدی سا جگر سوختہ کہہ گیا ہے۔

ای بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم تو عشقِ گلے داری من عشق گل اندامے

حافظ اسی مضمون کو کہتے ہیں :۔

بنال بلبل اگر با منت سر یاری است کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاری است

یہاں بلبل سے برابری کا شوق نہیں ہے بلکہ اُسے بھی اپنے حلقۂ ماتم میں شریک کہتے ہیں۔ "تو ہاے گل پکار میں چلاّؤں ہائے دل"۔ اور ایک شعر مقابلہ کا سُنئے۔ سلمان کہتے ہیں :۔

شاہد آں نیست کہ دارد خطِ سبز و لبِ لعل ‏ شاہد آن است کہ ایں دارد و آنے دارد

حافظ کا شعر ہے :۔

بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد ‏ شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد

ذوقِ سلیم خود بتائے گا کہ سلمان کے ایں و آں نے شعر کا زور کتنا کم کر دیا اور حافظ کا حکم "بندۂ طلعتِ آں باش" کتنا قوی ہے؟ واقعاتِ عشق بیان کرنے پہ آجاتے ہیں تو بدیع الاسلوبی اور بھی مؤثر ہو جاتی ہے۔ خیال یہ ہے کہ جوشِ عشق کو وصل سے بھی سکون نہیں ہوتا۔ وہی سرمستی رہتی ہے اور وہی ولولے۔ البتہ دونوں عالموں میں فرق ہے۔ ہجر میں جلنا مرنا ہے اور وصل میں لذّتِ عشق حاصل کرنا۔ دیکھو کس لُطف سے تصویر کھینچی ہے :۔

بُلبلے برگِ گُلے خوش رنگ در منقار داشت ‏ واندریں برگ و نوا خوش نالہائے زار داشت

معشوق عاشق پر ظلم کرتا ہے۔ پھر پشیمان ہوتا ہے۔ تلافی کرنا چاہتا ہے۔ عاشق سمجھتا ہے کہ یہ کیوں عنایت ہو رہی ہے۔ اس معاملہ کو یوں نظم کیا ہے :۔

آفریں بر دلِ نرمِ تو کہ از بہرِ ثواب ‏ کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

غور کرو۔ کس مزے کا طعنہ دیا ہے۔ فلسفیت کا رنگ بھی اسی جوشِ بیان اور بدیع الاسلوبی سے چوکھا ہو گیا ہے۔ اسرارِ کائنات کا معلوم نہ ہو سکنا ایک عام مضمون ہے مگر حافظ جب نظم کرتے ہیں نیا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی یہ خیال آتا ہے کہ جو معلوم ہو جائے وہ راز نہیں اور جو راز ہے وہ معلوم نہیں ہو سکتا۔ شاعرانہ رنگ میں اس مطلب کے ظاہر کرنے کے لئے ایک لفظ "عنقا" تلاش کر لیا جسکے معنی ہی ہیں معلوم الاسم معدوم الجسم اگر مل جائے تو عنقا نہیں اگر عنقا ہے تو ملے گا نہیں۔ عقل کے لئے اسرارِ کائنات کے علم حاصل کرنیکی کوشش ایسی ہی لغو ہے جیسے عنقا کے شکار کا شوق کہتے ہیں :۔

عنقا شکارِ کس نشود دام باز چین ‏ کانیجا ہمیشہ باد بدست است دام را

کبھی مہندس کے مذاق میں جاتے ہیں اور کہتے ہیں :-

آنکہ بر نقش زد ایں دائرۂ مینائی　　　کس ندانست کہ در گردشِ پرکار چہ کرد

کبھی یہ خیال آتا ہے کہ علم تو نہیں ہو سکتا لیکن ریاضت مرتبۂ شہود تک پہونچا دیگی اور اگر فنا فی المعشوق ہو گئے تو فصل ہی مٹا۔ تلاش کسکی؟

حلاجِ برسر دار ایں نکتہ خوش سراید　　　از شافعی مپرسید امثالِ ایں مسائل

منصور

خواجہ صاحب کا کلام کیفیاتِ عشق سے لبریز ہے اور ہوا و ہوس سے اکثر دور۔ یہی وجہ ہے کہ بازاری طبائع سے لیکے اربابِ حال تک کو ان کے کلام سے لذت ملتی ہے۔ اہلِ مجاز کو جو کیفیت ہجر میں پیدا ہوتی ہے اہلِ حقیقت کو اس سے زیادہ کوفت فیضانِ غیب کے رک جانے سے ہو جاتی ہے معشوق کی مختلف ادائیں عاشق کے لئے عجیب لذتیں پیدا کرتی ہیں۔ شاہدِ حقیقی کا متوالا اس سے زیادہ لذت تجلیات کے تنوع اور کثرت میں پاتا ہے۔ عارف کو مصائب و آلامِ دنیوی میں وہی مزا ملتا ہے جو شاہدانِ دنیا کی بیوفائی اور کج ادائی سے اہلِ دنیا کو ملتا ہے۔ رنج و مسرت، شکوہ و شکر، صبر اور بیچینی غرض جتنے واردات عشق ہیں حقیقت و مجاز دونوں میں اپنے اثر دکھاتے ہیں۔ اخلاق رذیلہ سے انسان کو بچاتے ہیں۔ رضا و تسلیم کا مادہ پیدا کرتے ہیں۔ جان بازی۔ جان نثاری اس کا شیوہ ہوتا ہے۔ رشک و رقابت سے کوسوں دور۔ چھاگل۔ چوڑی۔ دوپٹہ۔ آنچل ہوس بازوں کے لئے چھوٹ جاتا ہے۔ بلکہ ناک نقشہ۔ ملاحت و صباحت پر عاشق صادق کی نظر نہیں رہتی حقیقت ہو یا مجاز۔ خدا جانے وہ کس ادا پر مرتا ہے حافظ کہتے ہیں :-

ہزار نکتہ دریں کار و بار دلداری است　　　کہ نام آں نہ لبِ لعل و خطِ زنگاری است

میخانۂ حقیقت کے سرمست شراب کو کیف عشق سمجھتے ہیں۔ ساقی رہبر طریقت ہے۔ پیر مغاں مرشد کامل۔ جام دل ہے اور وہ بھی صنوبری ٹکڑا گوشت کا نہیں بلکہ

ایک لطیفۂ رُوحانی ہے جو کبھی کاشفِ اسرار ہوتا ہے کبھی مہبطِ انوار۔ نشۂ وخمار۔ مطرب و نغمہ۔ شیشۂ وصراحی۔ نقل و گزک۔ یہ سب مدارج عرفان کے نام ہیں۔ بسط کیحالت میں فیضانِ غیب ہوتا ہے۔ لطائف باطنی میں انشراحی حالت آجاتی ہے۔ یہی اِن کی بہار رہے۔ نئے نئے حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ عجیب عجیب اسرار ظاہر ہوتے ہیں۔ یہی اس بہار کے پھول ہیں اور غنچے۔ پھر بہار بھی وہ جو آنی و فانی نہیں بلکہ ازلی و ابدی ہے۔ اب ذرا اس رنگ میں ڈوب کے حافظ کے اشعار سنو تو دوسرا عالم نظر آئیگا۔ ساقی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:۔

دیدمش خرم وخنداں قدح بادہ بدست وندراں آئنہ صد گونہ تماشا میکرد
گفتم ایں جامِ جہاں بیں بتو کے داد حکیم گفت آں روز کہ ایں گنبد مینا میکرد

تصوف کی رضا و تسلیم کبھی کبھی جبریہ کے عقائد سے ملجاتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کیفیت جبر و اختیار دونوں سے بالاتر ہے:۔

بہ دُرد و صاف ترا کام نیست دم درکش کہ ہرچہ ساقیِ ما ریخت عینِ الطاف است

اس عالم میں مقام فنا کا نام خرابات ہے۔ سالک عارف باخبر قلندر وہ عارف جو مرتبۂ تکلیف سے گذر گیا۔ انسان عالمِ اکبر ہے اگر کامل ہو جائے تو فرشتوں اور آسمانوں سے بلند تر ہے۔ معشوق جلوہ وحدت شہود کا نام ہے۔ خود مست جانا وحدت وجود کے درجے تک پہونچنا ہے۔ عرفانِ کامل کو کفر کہتے ہیں (کیونکہ علمائے ظاہر کی نظر میں عارفِ کامل کافر ہوتا ہے)۔ اسلام رسم ظاہری کا مجموعہ بلکہ ریاکاری کا مخزن (یہ عارف کی نظر ہے جو علمائے ظاہر کے نام نہاد اسلام پہ پڑتی ہے)۔ نتیجہ یہ ہے کہ علما کی برائیاں۔ واعظوں کی پردہ دری سب کچھ کی جاتی ہے کیونکہ وہاں استدلال کا زور ہے۔ دلیل مٹی اور دعویٰ ضعیف ہوا۔ یہاں عین الیقین اور حق الیقین کا مرتبہ ہے جو مٹائے سے نہیں مٹتا:۔

آنہمہ شعبدہ ہا عقل کہ می کرد آنجا   سامری پیش عصا و ید بیضا می کرد

مختصر یہ کہ خواجہ صاحب کا بیشتر کلام حقیقت و مجاز دونوں میں یکساں خوشرنگ ہے اور مذاق سلیم کا تقاضا بھی ہے کہ ہوسناکی و گندیدگی سے عشق کے ایسے احساس لطیف کو پاک رکھے۔ البتہ یہ کہنا درست نہیں کہ حافظ کا ہر شعر روحانیت میں ہے۔ بعض مدارس میں ہنسی آتی ہے جب ایسے شعر مقام معرفت میں کھینچ کے لائے جاتے ہیں جیسے :۔

احمد اللہ علی معدلۃ السلطانِ   احمدِ شیخ اویسِ حسنِ ایلخانی

اور احمد سے مراد حضور سرورِ کائنات صلعم لئے جاتے ہیں اور اویس سے اویس قرنی رضی اور حسن سے حسن بصری۔ پھر سکوت طاری ہوتا ہے۔ پوچھو کہ ایلخانی کیا؟ کہا جاتا ہے کہ بیحد بلند درجہ معرفت کا۔ سچ کہا ہے کہ "شعر را بمدرسہ کہ برد" شاید اسی افراط و تفریط سے متاثر ہو کے محمد بن محمد دارابی نے **لطائف غیبیہ** لکھی جس میں ثابت کیا ہے کہ حافظ کے (۱) بعض اشعار بے معنی ہیں (اگرچہ یہ بھی زبردستی ہے۔ ہاں! استعارات بعیدہ ضرور ہیں) مثلاً :۔

ماجرا کم کن و باز آ کہ مرا مردم چشم   خرقہ از سر بدر آورد و بشکرانہ بسوخت

اور (۲) بعض محض رندی و ہوسناکی کی تعلیم دیتے ہیں مثلاً :۔

ہزار آفریں بر مئے سرخ باد   کہ از روئے ما رنگ زردی ببرد

اور (۳) بعض اشاعرہ کے رنگ میں ہیں اور جبریت کی تعلیم دیتے ہیں۔ مثلاً۔

در کوی نیکنامی ما را گذر ندادند   گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

بہر حال یہ تنقید بھی افراط و تفریط سے خالی نہیں ہے اور مثالیں اکثر ناقص ہیں۔

اب ہم بخوف طول اتنا اور کہتے ہیں کہ

حسد چہ می بری ای سست نظم بر حافظ — قبول خاطر و لطف سخن خدا داد ست

اس کلام کی مقبولیت اتنی ہے کہ لوگ اس سے فال لیتے ہیں اور حضرت خواجہ حافظ کو لسان الغیب اور ترجمان الاسرار سمجھتے ہیں۔ کسی کام کا قصد ہوا اور دیوان کھولا۔ جس شعر پر نظر پڑی وہی حالت آئندہ کا ترجمان تھا۔ ملا مگس نے شاہ اسمٰعیل صفوی کو حافظ سے خلاف کر دیا اور چاہا کہ حافظیہ کو مسمار کرا دے۔ بادشاہ نے دیوان کھولا تو یہ شعر نکلا:۔

جوزا سحر نہاد حمائل برابرم — یعنی غلام شاہم و سوگند میخورم

بادشاہ خوش ہو گیا اور ملا مگس کا کہنا نہ مانا۔ اب کی ملا نے دیوان کھولا تو نکلا:۔

ای مگس حضرت سیمرغ نہ جولانگہ تست — عرض خود میبری و زحمت ما میداری

خوش اعتقادوں کا خیال ہے کہ ہمیشہ صحیح فال نکلتی ہے اور روزانہ ہزاروں فالیں دیکھی جاتی ہیں۔ اگر اتفاق بھی مان لیا جائے تو عجیب اتفاق ہے کہ بار بار ظاہر ہوتا ہے۔

خواجہ صاحب نے قصائد اور مثنویاں بھی نہایت عمدہ کہی ہیں مگر۔

خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست

جامی — ملا نورالدین عبدالرحمٰن جامی خراسان کے ایک قریہ جام میں ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ مطابق ۷۔ نومبر ۱۴۱۴ء کو پیدا ہوئے اور علوم و فنون میں اس حد کا کمال حاصل کیا کہ ہر فن میں صاحب تصنیف ہو گئے اور اپنے اہل عصر میں نہایت معزز اور محترم رہے۔ سلطان حسین میرزا آخری چراغ تیموری خاندان کا انکا قدردان تھا سلسلہ تصوف میں خواجہ عبیداللہ الاحرار نقشبندی سے بیعت تھی سلطان روم نے انکے کمالات

کی شہرت سن کے اپنے یہاں بلایا مگر یہ ہرات سے نہ گئے یہاں تک کہ ۱۸ محرم ۸۹۸ھ کو انتقال ہوگیا۔ نظم میں خمسہ نظامی کے طور پر سات مثنویاں نظم کیں جو ہفت اورنگ کہلاتی ہیں۔

(۱) سلسلۃ الذہب میں سات ہزار دو سو شعر ہیں اور سلطان حسین کو ۸۹۰ھ مطابق ۱۴۸۵ء میں نظم کر کے نذر کی گئی ہے۔ زبان صاف اور سلیس ہے۔ پہلے حصے میں اعتقادیات ہیں۔ دوسرے میں عشق حقیقی و مجازی کی بحث ہے اور تیسرے میں سلطان و حکما وغیرہ کے قصص و روایات ہیں۔

(۲) سلامان و ابسال میں ایک تمثیلی قصہ نظم ہے۔ بحر مولانا روم کی مثنوی کی ہے جس کے مقابل کسی طرح نہیں آسکتی۔ تخییلی شاعری محاکات پر غالب آجاتی ہے لیکن جہاں تصویر کھینچ گئی ہے خوب ہے اور جدت ادا میں ڈوبی ہوئی مثلاً ایک باغ دہر کا منظر دکھایا ہے:۔

نو درختاں شاخ در شاخ اندرو | در نوا مرغانِ گستاخ اندرو
میوہ در پاے درختاں ریختہ | خشک و تر با یکدگر آمیختہ
چشمۂ آبے بزیر ہر درخت | آفتاب و سایہ گردش لخت لخت الخ

(۳) تحفۃ الاحرار وعظیہ اور اخلاقیہ نظم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مخزن الاسرار نظامی کے جواب میں کہی گئی ہے۔ سال تصنیف ۸۸۶ھ مطابق ۱۴۸۱ء۔

(۴) سبحۃ الابرار میں حقائق تصوف بیان کئے گئے ہیں اور اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔

(۵) لیلیٰ و مجنوں میں وہی مشہور عرب کا افسانہ ۸۸۹ھ مطابق ۱۴۸۴ء میں نظم ہوا ہے جو ان دونوں ناموں سے وابستہ ہے۔ انداز بیان کے اشعار سے معلوم ہوگا۔

چون صبح ازل زعشق دم زد | عشق آتش شوق در قلم زد
از لوح عدم قلم سر افراشت | صد نقشِ بداع پیکر انگاشت
ہستند افلاک زادۂ عشق | ارکان بزیں فتادۂ عشق
بے عشق نشان ز نیک و بد نیست | چیزیکہ زعشق نیست خود نیست

(۶) خرد نامۂ سکندری بوستاں کے رنگ و بحر میں ہے کہیں کہیں سکندر نامہ کا تتبع بھی کیا ہے مگر دونوں سے بہت پست ہے۔ ایک ساقی نامہ اسکا بھی نقل کیا جاتا ہے تاکہ طبیعت کا اندازہ ہو جائے۔

بیا ساقیا ساغر مے بیار		فلک وار دورِ پیاپے بیار
ازاں می کہ آرائش دل دہد		خلاصی ز آلائش گل دہد
بیا مطربا عود بنہادہ گوش		بیک گوشمال آور اندر خروش
خروشی کہ دل را بہوش آورد		بدانا پیامِ سروش آورد

(۷) یوسف زلیخا بیشک ان کی مثنویوں میں بے نظیر ہے اور مقامات بزم جس لطف سے بیان کئے ہیں اسکا مثل فارسی لٹریچر میں مشکل سے ملیگا۔ سال تصنیف ۸۸۸ھ مطابق ۱۴۸۳ء ہے۔ تاریخی اعتبار سے واقعہ بہت سے قصص و روایات کا مجموعہ ہو گیا ہے لیکن شاعری کی قوت اور حسن ادا کی دلکشی ہر کمزوری پر غالب ہے۔ بعض مقامات پر مقتضیات فطرت اس شان سے نظم ہو گئے کہ ضرب المثل ہو گئے ہیں مثلاً:-

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد		بسا کیں دولت از گفتار خیزد

اکثر ابواب کی ابتدا براعت استہلال سے کی ہے جو نہایت موثر ہوتی ہے اور افتتاح کلام میں شان پیدا کر دیتی ہے مثلاً جناب یوسف صدیق علیہ السلام کا خواب میں شمس و قمر و کواکب کو سجدہ کرتے دیکھنے کا حال جہاں لکھا ہے اس کی ابتدا یوں کی ہے:-

خوش آں کز بند صورت باز رستہ		ز سحر چشم بند اں[۱] چشم بستہ
دلش بیدار و چشمش در شکر خواب		ندیدہ کس چنیں بیدار در خواب
بپوشیدہ ز نا پائندہ دیدہ		ولے بکشودہ با پائندہ دیدہ الخ

---

[۱] دنیا کا وجود اہل معنی کی نظر میں وہمی و خیالی ہے جیسے کسی نے نظر بندی کر دی ہے۔

کبھی کبھی ایسے موقع پر اخلاقی سبق بھی نہایت عمدہ دیتے ہیں مثلاً اسی واقعے کے بعد برادرانِ یوسف کے حسد اور مشاورت کا حال یوں شروع کیا ہے :-

چو آید مشکلے پیشِ خردمند | وزاں مشکل فتد در کارِ او بند
کند عقل دگر با عقل خود یار | کہ تا در حلِّ آں گردد مددگار
زیک شمعش نگیرد نورِ خانہ | فروزد شمعِ دیگر درمیانہ
ولے ہست ایں سخن در راست بیناں | بصدرِ راستی بالا نشیناں
نہ در کجرو حریفانِ بد اندیش | کہ گردد از دو کجرو کجروی بیش الخ

ایک مقام پر عشقِ مجازی و حقیقی کا فرق دکھایا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ مجاز بھی حقیقۃً پرتوِ حقیقت ہے ۔ اسی طرح اور مسائل بھی عمدہ طور سے حل کئے ہیں اگرچہ مخالفوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جامی نے نظامی اور خسرو کے خزانوں کو بیدردی سے لوٹ لیا ہے[۱] اور ممکن ہے کہ بعض توارد خلاف امید بھی ہوگئے ہوں مگر یہ تنقید خود بیدردی سے خالی نہیں ہے۔ افسوس یہ مقام طول چاہتا ہے مگر کتاب کو مختصر کرنا ہے لہذا قلم روکا جاتا ہے۔ مثنویوں کے علاوہ دیوان غزلیات وغیرہ بھی ہے جسکے تین حصّے ہیں ابتدائی کلام کا نام فاتحۃ الشباب ہے۔ وسطِ عمر کا واسطۃ العقد اور آخر عمر کا خاتمۃ الحیات۔ اسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا جامی کا قلم بیجا خوشامدوں میں آلودہ نہیں ہے ۔ ہر صنف میں یا حقانیت و عرفانیت ہے یا واردات عشق و نصائح۔ بعض غزلیں حافظ کے جواب میں کہی ہیں جو بہت پست ہیں لیکن بیشتر غزلیں کیفیت سے لبریز نظر آتی ہیں مثلاً :-

طرفِ باغ لبِ جو لبِ جام است اینجا
ساقیا خیز کہ پرہیز حرام است اینجا

---

[۱] انکی ہجو کے اشعار صفحہ (۱۵۲) میں دیکھو

شیخ در صومعہ گر مست شد از ذوق سماع
من و میخانہ کہ ایں حال مدام است اینجا
لب شادی بلب جام و ندانم من مست
کہ لب لعل تو یا بادۂ کدام است اینجا
میکشی تیغ کہ سازی دلِ ما را بد و نیم
تیغ بگذار کہ یک غمزہ تمام است اینجا
کانی

وحدت الوجود کے رنگ میں بھی غزلیں کہی ہیں اور شوخی ادا سے مزہ بھر دیا ہے :۔

خوباں ہزار و از ہمہ مقصودِ من یکیست | صد پارہ گر کنند بہ تیغم سخن یکیست
آنجا کہ لعلِ دلکشِ شیریں نہد فروغ | یاقوت و سنگ در نظرِ کوہ کن یکیست

بعض اشعار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شعرائے عرب کے کلام کا ترجمہ کر دیا ہے۔ مثلاً عمر بن الفارض کا شعر ہے :۔

شربنا علی ذکر الحبیب مدامة | سکرنا بها من قبل ان یخلق الکرم

جامی کہتے ہیں :۔

بودم آں روز من از طائفۂ دُرد کشاں | کہ نہ از تاک نشاں بود نہ از تاک نشاں
انگور بونے والا

میرے ایک قابل دوست نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میرے نزدیک جامی کی غزلیں حافظ سے بھی اچھی ہیں مگر افسوس کہ مجھے اس وقت تک اس رائے سے متفق ہونے کا موقع نہ ملا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جامی اس دور کے خاتم الشعرا ہیں۔

خاتمہ

اب شعرائے تیموریہ کا حال ختم کیا جاتا ہے۔ ناظرین نے ملاحظہ کر لیا ہوگا کہ نثر و نظم دونوں پر کس قدر انقلاب ہوا۔ نثر میں سادگی کم ہونے لگی اور مسجع و مرصع

تحریریں پسند آنے لگیں جن میں مرادف و مکرر فقرات کی کثرت ہے اور جتنے زیادہ طریقوں سے ایک ہی مطلب ادا ہوتا ہے اتنا ہی کلام مقبول ہوتا ہے۔ عربی سے اقتباسات اور شاعری کے خصوصیات سے نثر کی زینت شروع کر دی گئی ہے۔ نظم میں محاکات کم ہوتی جاتی ہے اور تخییل بڑھتی جاتی ہے۔ بلادِ اسلام تباہ ہو جانے سے ایرانیوں پر تاتاریوں کا غلبہ ہے۔ عشق کے میدان میں آکے خود مظلوم بنتے ہیں اور ترک و تاتاری ظالم معشوق بنائے جاتے ہیں۔ انھیں کے ظلم سہتے ہیں۔ انھیں سے شکوے اور شکایات ہیں۔ تصوف کا رنگ بھی پورا غالب ہو گیا ہے اور اہلِ ذوق نے مجاز سے حقیقت کی طرف قدم بڑھا کے بازاری باتوں سے کنارہ کشی کی ہے۔ ہوا و ہوس کی بنیاد اکھاڑ ڈالی ہے اور عشقِ خالص کے کیفیات سے لذت اندوزی کی جاتی ہے۔ مضامینِ جدید پیدا کم ہو گئے ہیں بلکہ ایک ہی خیال یا مسئلہ بار بار مختلف اسلوبوں میں کہا جاتا ہے۔ اس سے عاشقانہ وغیرہ بھی مستثنیٰ نہیں۔ تبلیغ حکمت بھی شروع ہو گیا مگر خوش مذاق ہاتھوں میں ہے۔ اس سے فارسی شاعری شاید نہ بگڑنے پائے۔ وعظیات و اخلاقیات کا چرچا ہے۔ رزمیہ نظمیں مفقود ہو گئیں۔ بزمیہ مثنویاں عروج پر آگئیں۔

فغانی

البتہ اس عہد کے آخر میں ایک رند بلانوش فغانی نام شیراز سے قدم باہر نکالتا ہے اور پرانا ڈھونا چھوڑ کے شاعری کے نشتر تیار کرتا ہے مگر کوئی اسے پوچھتا نہیں۔ وہ تو اپنے رنگ میں یکتا ہے اور اس نازک خیالی کا سنگِ بنیاد نصب کرتا ہے جس پہ آنے والے شعرا بڑی بڑی عمارتیں بنائیں گے لیکن نہ سلطان حسین کے یہاں قدر ہوتی ہے نہ ملا جامی کی نظر میں سماتا ہے بلکہ اگر کوئی محل شعر سنائی دیتا ہے تو کہلائے فن کہہ دیتے ہیں کہ یہ قبیلہ ہے نیچے فغانی کے رنگ کا۔ آخر یعقوب بیگ والی تبریز اس کی حمایت کر کے بابا کا خطاب دیتا ہے اور بابا فغانی طرزِ جدید کی نازک خیالیاں شعر میں شامل کرتا ہے۔ آخر عمر میں شراب و کباب چھوڑ کے مشہد مقدس میں اعتکاف

کرتا ہے اور سنہ ۹۲۵ھ میں مرجاتا ہے۔ چند شعر اس کے بھی سن لو:۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست | بسیار شیوہاست بتاں را کہ نام نیست
ایکہ میگوئی چرا جامے بجا نے می خوری | ایں سخن با ساقئی ما گو کہ ارزاں کردہ است

تصوّف کا رنگ دیکھو:۔

مشکل حکایتے است کہ ہر ذرہ عین اوست | اما نمی تواں کہ اشارت باو کنند
مقصود صحبت است ز گل ورنہ بوی گل | انصاف اگر بود ز صبا ہم تواں شنید
از فریب نقش نتواں خامۂ نقاش دید | ورنہ دریں سقف رنگیں ہیچ یکے در کار نیست

اپنے معاصرین کے کلام سے کوئی تعلّق ہی نہیں۔ اگر تیموریہ کے عہد آخر میں ہوتا تو عرفی اور فیضی وغیرہ کے ساتھ اس کا ذکر کیا جاتا اور حق تنقید بھی ادا ہوتا۔

اسی طرح اور ایک شاعر ہلالی استرابادی پیدا ہوا۔ یہ چغتائی ترک سادہ گوئی میں بے نظیر تھا اور مضمون آفرینی بھی سلاست زبان کے حدود میں کرتا تھا۔ ہلالی
امیر علی شیر کے دربار میں گیا اور یہ مطلع پڑھا:۔

چناں از پا فگند امروز آں رفتار قامت ہم
کہ فردا آں بر نخیزم بلکہ فردائے قیامت ہم

امیر خوش ہوا اور تقرب عطا کیا۔ ایک بار عبید اللہ ہاتفی نے کہیں کہدیا کہ ہلالی غزل اچھی کہتا ہے۔ مثنوی کہنا ذرا مشکل ہے۔ فوراً شاہ و درویش نظم کرنی شروع کردی جس میں اس واقعے پر بھی اشارہ کیا ہے:۔

مدعی چوں مذاق شعر نداشت | مثنوی را بہ از غزل پنداشت
آنکہ نظم غزل تواند گفت | مثنوی را چو در تواند سفت

غرض مثنوی تمام کر کے بدیع الزماں تیموری کو نذر دی اور انعام لیا۔ علاوہ اسکے دو مثنویاں اور نظم کی ہیں۔ لیلیٰ مجنوں و صفات العاشقین۔ جب عبید اللہ والیِ خراسان ہوا

تو سیف اللہ نے اُس پر تشیع کا الزام لگا کے قتل کرادیا "سیف اللہ کشت" تاریخ ہے (۹۳۶ھ) - ایک صاف غزل اس کی سن لو :-

عجب شکستہ دل و زار و ناتوان شدہ ام
چنانکہ ہجر تو میخواست آنچنان شدہ ام

تو آفتابی و من ذرہ - ترکِ مہر مکن
کہ در ہوائے تو ام - گرد آسمان شدہ ام

بگفتگوے تو افسانہ گشتہ ام ہر جا
بجستجوی تو آوارہ جہان شدہ ام

دلم ز شادیِ عالم گرفتہ است ولے
غمے کہ از تو رسیدست شادمان شدہ ام

ازان شدست ہلالی دلم شگاف شگاف
کہ ناوکِ غم و اندوہ را نشان شدہ ام

یہ طریقہ اُس رنگ کی بیش بندی کرتا ہے جسے دورِ صفویہ قبول کریگا۔

باب دہم

صفویہ

صفی — شیخ صفی الدین اردبیلی ایک مشہور خاندان سادات کے سجادہ نشین تھے۔ انکی اولاد میں سلطان حیدر پیدا ہوئے جنکے مرید سرخ رنگ کی ٹوپی بارہ گوشے کی پہنتے تھے۔ یہ لوگ قزلباش کہلانے لگے یعنے "سرخ سر"۔ ان کے

شاہ اسمٰعیل — بیٹے شاہ اسمٰعیل صاحب سطوت ہوئے۔ سلطان حسین مرزا کا زمانہ تھا کہ ۷۰۰ آدمی لیکے آذربائجان پر چڑھائی کی اور فتح پائی۔ پھر اپنی جماعت کو بڑھا کے شروان پر حملہ کیا اور وہاں بھی ظفریاب ہوئے۔ اسی ہنگامے میں شیبانی خاں نے زور پکڑا اور سلطان حسین خاں کی وفات ہوجانے سے خاندان تیموریہ کو مغلوب کرکے ہرات پر قبضہ کرلیا۔ بدیع الزماں[۱] پسر سلطان حسین کو سلطنت عثمانیہ میں پناہ لینی پڑی اور وہیں زندگی کے دن پورے ہوگئے۔ شاہ اسمٰعیل نے ازبکوں اور ترکمانوں کا خاتمہ کرنا شروع کیا یہانتک کے ۲۵ سال کی لگاتار کوشش کے بعد حکومت صفویہ کی مستقل بنیاد ڈالدی جسکا دور سلطنت تقریباً ۱۵۰۰ء سے ۱۷۳۶ء تک رہا۔ اس انقلاب کا یہ نتیجہ ہوا کہ سارے ایران کی ایک متحدہ سلطنت اور ایک متحدہ قوم بن گئی جو آجتک باقی ہے۔ لطف یہ ہے کہ تیموریہ کا زوال صفویہ کے عروج کا باعث ہوا مگر فاتحوں کو تیموریوں کے ساتھ ہمیشہ خلوص رہا۔ ظہیرالدین محمد بابر کو شاہ اسمٰعیل صفوی برابر مدد دیتے رہے بلکہ اگر یہ کمک وقتاً فوقتاً نہ پہونچتی تو تیموریوں کی عظمت ہندوستان میں قائم نہ ہوسکتی۔ غرض سنہ ۹۳۰ھ میں شاہ اسمٰعیل کا انتقال ہوا اور ان کے بیٹے شاہ

---

۱ ہلالی استرآبادی نے مثنوی شاہ و درویش اسی کو نذر دی تھی دیکھو صفحہ ۲۵۰۔

طہماسپ تخت نشین ہوئے۔ انھوں نے بیحد قوت حاصل کرلی اور حدود سلطنت شاہ طہماسپ
کو بھی اچھی طرح وسیع کردیا بلکہ ہندوستان بھی فوجیں بھیج کے خاندان سوریہ کا خاتمہ
کرادیا اور ہمایوں کو دوبارہ تخت سلطنت پر بٹھادیا۔ انکے بعد انکا بیٹا اسمٰعیل مرزا
٩٨٤ھ بادشاہ ہوا۔ صاحب مجمع الفصحا نے اس دور کے ظلم و ستم کی شکایت
لکھی ہے انکے بعد انکے بیٹے شاہ عباس اعظم تخت پر متمکن ہوئے۔ یہ ایسے شاہ عباس اعظم
صاحب اقبال نکلے کہ علاوہ پورے ایران کو زیر نگیں کر لینے کے آرمینیہ و عراق کو
بھی مسخر کرلیا۔ ملک کی آبادی و سرسبزی کے لئے یہ خدمت ملک میں یادگار ہے۔ اکثر
معاصر بادشاہ اس زمانے میں "اعظم" کا لقب بالاستحقاق پا گئے تھے۔ ایلی زبتھ
انگلستان میں اور اکبر ہندوستان میں جو کچھ رعایا کی بہبودی کے لئے کر رہے تھے
وہ تمام باتیں تاریخ میں آجتک سنہرے حرفوں سے لکھی ہوئی ہیں۔ شاہ عباس بھی
کسی سے کم نہ نکلے۔ معابد و مدارس آباد کئے۔ صنعت و حرفت کو ایسی ترقی دی کہ
ایران کے قالین وغیرہ آجتک سلاطین عالم کی بارگاہوں کو زینت دینے کے
لئے جاتے ہیں۔ کاروانسرائیں اس شان کی کھولیں کہ مسافروں کی مہمانداری
بڑے کروفر کے ساتھ سلطنت کی طرف سے ہوا کرتی تھی مختصر یہ کہ تاریخ ایران میں
اس سے زیادہ زرخیز اور خوشحال دور کوئی نہیں ملتا۔ ٤٢ سال کی سلطنت کے
بعد شاہ عباس نے ١٠٣٨ھ میں انتقال کیا اور شاہ صفی بادشاہ ہوئے شاہ صفی ثانی
پھر شاہ عباس ثانی۔ غرض تقریباً ڈہائی سو برس اس خاندان کی حکومت و شاہ عباس ثانی
نہایت اطمینان سے رہی۔ آخری فرمانروا اس سلسلے کا سلطان حسین صفوی سلطان حسین
ہے جس کا جلوس اسکے باپ شاہ سلیمان کے بعد ١١٠٦ھ میں ہوا تھا اس سلطنت مرزا صفوی
میں بڑے بڑے علمائے شیعہ علمی خدمتیں کر رہے تھے لیکن یہ عہد علمی اعتبار سے
جتنا زبردست ہے پولیٹکل حیثیت سے اتنا ہی پست ہے۔ ایک شخص میرویس نام

قلعۂ قندھار کا کوتوال تھا۔ اس نے اپنے بیٹے محمود خاں کو ایک لشکر دیکے معین کیا کہ جب بلاؤں چلے آنا۔ ایک دن گرگین خاں قلعہ دار شکار پر گیا اور میرویس نے محمود خاں کی فوج بلا کے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ گرگین خاں جب واپس آیا تو اُسے بھی قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ ۱۱۱۹ھ کا ہے۔ شاہ حسین صفوی نے میرویس کی سرکوبی کرنی چاہی مگر جسے بھیجا وہی قتل ہوا۔ اور میرویس مستقل وارث بن گیا۔ اسکے بعد محمود خاں والئی قندھار ہوا۔ اس نے اتنی قوت پیدا کرلی کہ اصفہان پر ۱۱۳۴ھ میں ایک زبردست حملہ کردیا اور شاہ حسین اور اُنکے اعوان و انصار کو (محرم ۱۱۳۵ھ میں) قتل کر ڈالا۔ شاہ طہماسپ

شاہ طہماسپ آخر

پسر شاہ حسین اس غدر کے عالم میں اصفہان کے باہر نکل گیا اور قزوین میں بادشاہ ہوگیا۔ اس کے ملازموں میں سے ایک شخص نادر قلی نہایت جوانمرد تھا۔ اس نے بڑے بڑے کارنمایاں کرنے شروع کئے اور رفتہ رفتہ خراسان فتح کرکے سلطنت قائم کی اور اپنا نام طہماسپ قلی رکھا۔ اُدھر اشرف شاہ والئی اصفہان (محمود خاں کا بیٹا) بھی قتل ہوا اور شاہ طہماسپ پھر اصفہان میں فرمانروائے ایران کی حیثیت سے تخت نشین ہوگیا۔ طہماسپ قلی نے اپنی قوت روزانہ بڑھانا شروع کی آخر ۱۱۴۴ھ میں شاہ طہماسپ کو مقید کرکے اُس کے پسر چار ماہہ شاہ عباس کو تخت پر

شاہ عباس آخر

بٹھایا اور خود مہمات سلطنت سرانجام دینے لگا۔ چار برس کے بعد یہ پردہ بھی ہٹا دیا اور ۱۱۴۸ھ میں اپنی بادشاہی کا اعلان کردیا اور نادر شاہ افشار

نادر شاہ افشار

لقب اختیار کیا۔ سکّے کے ایک رُخ پر تاریخ جلوس الخیر فیما وقع بخط طغرا کندہ کی گئی اور دوسری طرف لکھا گیا ہے۔

سکّہ بر زر کرد نام سلطنت را در جہاں نادر ایراں زمین و خسرو گیتی ستاں

مگر کسی دل جلے نے "لاخیر فیما وقع" کو مادہ تاریخ قرار دیا اور نادر نے طغرائی عبارت موقوف کرادی۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ یہ شعر کندہ کرلیا تھا:۔

نادرہم در ملک ایراں قادرہم بر ہر دیار ‏ لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار

نادر شاہ کے فتوحات و فترات کا ذکر طول محض ہے۔ عراق سے ہندوستان تک اسکی سطوت کا ڈنکا بجتا تھا اور ہر شخص قہرمانِ نادری سے کانپتا تھا آخر

بیک گردشِ چرخ نیلوفری ‏ نہ نادر بجا ماند و نے نادری

امرائے دربار اسکے ظلم وستم سے عاجز آگئے اور پانچ سردار ایک شب کو اس کے خوابگاہ میں دَرّانہ چلے گئے اور (سنہ ۱۱۶۰ھ میں) قتل کر ڈالا۔ اسکے بعد علی قلی خاں تخت نشین اور عادل شاہ لقب اختیار کیا اور اپنے چھوٹے بھائی ابراہیم میرزا کو نصف سلطنت دیکے اصفہان کا بادشاہ بنایا مگر دراندازوں نے دونوں بھائیوں میں لڑائی کرادی ابراہیم شاہ غالب ہوا اور عادل کی آنکھوں میں سلائی پھروادی۔ امرائے خراسان نے سلطان حسین صفوی کے نواسے اور نادر شاہ کے پوتے شاہرخ میرزا ابن رضا قلی خاں کو سنہ ۱۱۶۵ھ میں قلعہ قلات سے لاکے خراسان کا بادشاہ بنایا۔ اُدھر اعیان دولتِ اصفہان ابراہیم میرزا سے ناراض ہوگئے۔ شاہرخ کو موقع مل گیا اور ابراہیم کو معزول کرکے خود وہاں کا بھی بادشاہ ہوگیا۔ اسکے بعد تاریخ ایران کشت وخون سے بھری ہوئی ہے اور تمام علمی مشاغل یکقلم موقوف نظر آتے ہیں۔ اطمینانی حالت دوبارہ چند سال کے بعد سنہ ۱۲۰۰ھ میں پیدا ہوئی جب محمد شاہ نے سلطنت قاچاریہ کی بنیاد ڈالی اور ایران نظم ونسق ترتیبی حالت میں قائم کیا۔

عادل شاہ

ابراہیم شاہ

شاہرخ میرزا

تاریخ ادب کے لئے عہد صفویہ[1] کو کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ یہ ایک مذہبی دور تھا جس میں بیشتر تصانیف فقہ واصول اور علم کلام وغیرہ میں ہوئے۔

---

[1] سلاطین صفویہ خود بھی شاعر تھے۔ شاہ اسمٰعیل۔ شاہ طہماسپ اور شاہ عباس وغیرہ کا کلام مجمع الفصحا میں دیا ہوا ہے۔

اکثر کتابیں تاریخ و تفسیر میں بھی لکھی گئیں مگر فنون لطیفہ خصوصاً فن شعر کی کساد بازاری رہی اور بہترین شعرا ہندوستان چلے گئے جہاں دربار تیموریہ (مغلیہ) میں انکی بڑی وقعت ہوئی۔ بہرکیف چند مصنفین جن کا تعلق دربار صفویہ سے رہا ہے ذکر کرتے چلتے ہیں :-

شفائی — **شفائی** حکیم شرف الدین حسن نام۔ انکا عروج **شاہ اسمٰعیل** کے زمانے میں ہوا بلکہ بادشاہ خود ملنے کے لئے انکے گھر پر گیا۔ جناب **میر باقر داماد** بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ اصفہان ان کا وطن تھا اور وہیں فن طبابت میں مشغول رہتے تھے۔ مثنوی نمکدان حقیقت کو حدیقۂ سنائی کی بحر میں نظم کی ہے جس میں بقول مولانا شبلی تصوف کے معرکہ آرا مسائل بیان کئے ہیں۔ ایک دیوان غزلوں کا بھی چھوڑا ہے جو بقول صاحب مجمع الفصحا "شیرین" ہیں اور اکثر **فغانی** کی بحروں میں کہی ہیں۔ رنگ طبیعت ملاحظہ ہو :-

یدوستی تو خصمند عالمے یا من — ہزار دشمن و یکدوست مشکل افتاد ست
زگرد باد دلیل ہمرہی نمی آید — غبار کیست کہ دنبال محمل افتاد ست

یہ شعر خوب کہا ہے :-

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را — چندان اماں نداد کہ شب را سحر کند

ایک حالت نظم کی ہے :-

شفائی را تکاپو ہمرہ راہ تو می بینم — بکوئے نامرادیہا از سر کوے تو می آید

نمکدان حقیقت سے بھی چند اشعار منتخب کئے جاتے ہیں جن میں انسان کو بحیثیت اشرف المخلوقات مخاطب کیا ہے :-

ای تو آئینۂ تجلی ذات — نسخۂ جامع جمیع صفات
در نمود تو ذات مستور است — ذات مخفی صفات مذکور است

جز تو کس قابل امانت نیست | ویں امانت بجز خلافت نیست
تو از ملک ماہ تا ماہی | نامزد شد خلیفۃ اللّٰہی
ہر چہ در آسمان گردان است | در تو چیزے مقابل آنست
آنکہ چون پیش آشکار و نہفت | خویشتن را بہ پردۂ تو نہفت
اندریں پردہ باید ش نگری | کہ خوش آیندہ نیست پردہ دری
ہم متاعی و ہم خریداری | با خودت ہست طرفہ بازاری

شرف جہاں قزوینی۔ ان کے باپ قاضی جہان نہایت بادقار شخص تھے قاضی جہان کے نانا سید سیف الدین کا سلطان الجائتو کے زمانے میں بڑا عروج تھا۔ ریاست، حکمرانی سب کچھ نصیب تھی۔ شرف جہاں خود نہایت قابل شخص تھے اور معقولات میں میر غیاث الدین منصور کے شاگرد تھے۔ رفتہ رفتہ شاہ طہماسپ کے دربار میں رسائی ہوئی اور گویا سیاہ و سفید کے مالک ہو گئے۔ کربلائے معلی میں ان کی بنوائی ہوئی نہر آبستک موجود ہے۔ غزل گوئی میں انھیں خاص کمال تھا اور واقعات و واردات عشق کی صاف اور دلکش الفاظ میں تصویر کھینچ دیتے تھے:۔ شرف جہان

بھر جا میروم اول حدیث نیکوان پرسم
کہ حرف آن مہ نامہربان را در میان پرسم
ز مدہوشی نفہمم ہر چہ گوید آن پری با من
چو از بزمش روم مضمون آن از دیگران پرسم

ایک اور واقعہ کہتے ہیں:۔

زحمت چہ میکشی پئے درمان ما طبیب! | ما بہ نمیشویم و تو بدنام میشوی

ایک مسلسل غزل میں اس کیفیت قلب اور پریشانی کا اظہار کیا ہے جو معشوق کے سفر کرتے وقت پیش آسکتی ہے:۔

از تو نماند تاب جدائی دگر مرا — بہر خدا مرو بسفر یا ببر مرا

نادیدہ کرد تا نکنم عزم همرهی — آن مہ چو دید وقت سفر در گذر مرا
(معشوق نظر بچا گیا) (راہ ۱۲)

گر قصد آن نداشت کہ گردم ز غم ہلاک — بہر چہ کرد از سفر خود خبر مرا

عزم سفر نمودہ و ترسم کہ در دو روز — سازد بعشق شہرۂ شہر دگر مرا

قاصد ابا چو شرف از خویشتن بردم — آگہ کن از آمدنش پیشتر مرا

ایران میں انکی طرز سے زیادہ مشہور و مقبول ہوئی۔ اسی وجہ سے تخیلی رنگ رفتہ رفتہ مٹنے لگی۔

وحشی

وحشی دورۂ صفویہ کے غزل گویوں کا سرتاج ہے۔ کرمانشاہ کے قریۂ بافق کا رہنے والا۔ اکثر یزد میں زندگی بسر کرتا تھا اسی سے یزدی مشہور ہوگیا۔ زندگی شاہدان بازاری کے عشق میں کاٹی اور دم بھی نکلا تو شراب پیتے پیتے (آتشکدہ)۔ مرتے وقت یہ شعر نظم کئے :-

ز شبہائے دگر دارم تب غم بیشتر امشب — وصیت می کنم باشید از من باخبر امشب"

مگر در من نشان مرگ ظاہر شد کہ می بینم — رفیقان راہنائی آستیں بہ چشم تر امشب

صاحب آتشکدہ لکھتے ہیں کہ تین مثنویاں نظم کیں مخزن اسرار کی بحر میں خلد بریں، شیریں و خسرو کے مقابل ناظر و منظور۔ اور ایک مثنوی اسی بحر میں فرہاد و شیریں نظم کی جو ناتمام رہ گئی۔ غزلیں نہایت رنگین کہی ہیں اور واردات عشق کے نظم کرنے میں استاد ہے۔ قصائد شاہ طہماسپ اول کی مدح میں نظم کئے ہیں اور ائمۂ اہلبیت کا بھی مداح ہے۔ اکثر قدما کی بحروں میں خامہ فرسائی کی ہے مگر چونکہ واقعہ گوئی کا عادی ہے اور قصیدے میں قوت تخیل کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے لہذا پھیکا پڑ جاتا ہے۔ بعض تخیلی اشعار یہاں پر نقل کئے جاتے ہیں جو محاکات سے عاری ہونے کی وجہ سے بدرنگ ہو گئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں :-

تازہ آئینۂ ایّام بروزنگ ملال — آرد از قوس قزح ابر بہاری صیقل
دو زدوان شستۂ باران بسبر سوزن برق — ابر برقامت اشجار بصد گونہ حلل
پنجۂ تاک ز نم ہائے سحر می لرزد — لالہ از بہر ہمیں کردہ فروزاں منقل

غزلیں البتہ بیحد رنگین ہیں اور گذری ہوئی سناتے ہیں :-

امروز یار عذر جفا ہائے رفتہ خواست — عذرے کہ او نخواست تبسم نہفتہ خواست
من بندہ نگہ کہ بصد شرح و بسط گفت — حرف عنایتے کہ تبسم نگفتہ خواست

معشوق سفر پر تیار ہے۔ وحشی اپنے دل کی داستان سناتا ہے۔ ذرا شرف جہاں کی غزل سے بھی مقابلہ کر لینا :-

یاران خدا کرا بسوے او گذر کنید — باشد کشش ایں خیال ز خاطر بدر کنید
از حال ما چنانکہ در او کار گر شود — آن بے تحمل سفر کن ما را خبر کنید
منعش کنید از سفر و در میان منع — اغراق در صعوبت رنج سفر کنید
گر خود شنید جان زمن و غزدہ از شما — در تشنود مباد کہ اینجا گذر کنید
وحشی گر ایں خبر شنود وای بر شما — از آتش نہیب کشش او عذر کنید

دیکھا کیا بیقراری ہے اور کتنا سوز و گداز۔ مجازی عشق کے حالات اس سے زیادہ پرتاثیر نہیں ہو سکتے۔ چاند دیکھنے کے لئے لوگ کس شوق میں جمع ہوتے ہیں وحشی کی وارفتگی استہلال کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ وہ اپنے عالم میں ہے اور اسی عالم کے مہینے کی آخری تاریخ اور پہلی تاریخ کے حساب لگا رہا ہے :-

بازم از قوس خم ابروئے کسے در نظر ست — سلخ ماہ دگر و غرۂ ماہ دگر ست

ہجر کی حالت سنو :-

مارا دو روزہ دوری دلدار میکشد — زہر ست ایں کہ اندک و بسیار میکشد

یہی وارفتگی تھی جس نے واسوخت نظم کرادی ورنہ اس صنف کو دنیا میں کوئی بھی

نہ جانتا۔ غزل کے چند مصرعے دردِ دل بیان کرنے کو جب کافی نہ ہوئے تو بند کے بند کہہ ڈالے اور بعد کو کوئی شاعر تقلید تک بھی پوری طور سے نہ کر سکا:۔

دوستان حالِ پریشانیٔ من گوش کنید   داستانِ غمِ پنہانیٔ من گوش کنید
قصۂ بے سروسامانیٔ من گوش کنید   گفتگوئے من و حیرانیٔ من گوش کنید

شرح ایں قصۂ جانسوز نگفتن تا کے
سوختم سوختم ایں راز نہفتن تا کے

روزگارے من و دل ساکنِ کوئے بودیم   ساکنِ کوئے بتِ عربدہ جوئے بودیم
دین و دل باختہ دیوانۂ روئے بودیم   بستۂ سلسلۂ سلسلہ موئے بودیم

کس دراں سلسلہ غیر از من و دل بند نبود
یک گرفتار ازیں جملہ کہ ہستند نبود

نرگسِ غمزہ زنش ایں ہمہ بیمار نداشت   سنبلِ پرشکنش ہیچ گرفتار نداشت
ایں ہمہ مشتری و گرمیِ بازار نداشت   یوسفے بود ولے ہیچ خریدار نداشت

اول آنکس کہ خریدار شدش من بودم
باعثِ گرمیِ بازار شدش من بودم

عشقِ من شد سببِ خوبی و رعنائیٔ او   داد رسوائیٔ من شہرتِ زیبائیٔ او
بسکہ کردم ہمہ جا شرحِ دل آرائیٔ او   شہر پُر گشت ز غوغائے تماشائیٔ او

ایں زماں عاشقِ سرگشتہ فراواں دارد
کے سرِ برگِ من بے سروساماں دارد الخ

وحشت بیاضی — ولی دشتِ بیاضی[۱] بھی وحشی کا معاصرہ اور انہی کے رنگ میں کہتا ہے۔

---

[۱] قائن ایک صوبہ ایران کا ہے۔ اسکے مضافات میں ایک قریہ ہے جہاں کی مٹی سفید ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے دشت بیاضی کہلاتا ہے۔

وہی شاہدان بازار کا عشق ہے جس کی کیفیتیں دکھائی گئی ہیں:۔

تا چند ز من رمیدہ باشی | با غیر من آرمیدہ باشی
بہر تو شنیدہ ام سخنہا | شاید کہ تو ہم شنیدہ باشی

یہ شعر نہایت پر تاثیر اور کیفیت میں ڈوبے ہوئے ہیں:۔

خوش آنکہ با تو دہم شرح مشکل خود را | مگر بہ آفتم و خالی کنم دل خود را
بدرد رسے تو کہ یا رب نصیب دشمن باد | بدان رسیدہ کہ راضی کنم دل خود را
رسیدہ ام

دو شعر اور سنو:۔

چون بد و نیک من سوختہ خرمن پرسند | آہ اگر آنچہ بدل کردہ ام از من پرسند
سبب نالہ چہ پرسی ز دلی لائق نیست | کہ ز ماتم زدگاں باعث شیون پرسند

ملا محتشم کاشی کا نام تذکروں میں نہایت اعزاز سے لیا گیا ہے آذر بیگ | ملا محتشم کاشی
کا خیال ہے کہ طنطنۂ شاعریش از قاف تا قاف رسیدہ بود و صاحب آتشکدہ
بھی "سر آمد شعرائے فصاحت شعار ان روزگار" لکھتے ہیں۔ شاہ طہماسپ کے
دربار میں ان کا بڑا عروج تھا اور وحشی وغیرہ کے ہمعصر تھے۔ ابتدائی زندگی انکی
بھی عشق بازی میں گذری ہے۔ اور جلالیہ و نقل عشاق میں اپنے حالات عشق
نظماً اور نثراً لکھے ہیں (آتشکدہ) شعر گوئی کا شوق بھی ابتدائے عمر سے معلوم
ہوتا ہے اسی لئے دیوان کے دو جزو کر دئے ہیں۔ صبائیہ اور شبابیہ۔ رنگ طبیعت کا
اندازہ ان اشعار سے ہو جائیگا:۔

ہزار نالۂ جانسوز کردہ ام امشب | عجب شبے بغمت روز کردہ ام امشب
شب مرا تو سیہ کردۂ و من تا روز | دعائے بد بہ بد آموز کردہ ام امشب

برائے خاطر غیرم بصد جفا کشتی | بمیں برائے کہ اے بیوفا کرا کشتی
چو من ہلاک شوم از طبیب شہر پرس | کہ در وکشت مرا یا تو بیوفا کشتی

حقیقت یہ ہے کہ محتشم کی غزلوں کا رنگ تو بیشتر وہی ہے جو دور صفویہ میں رائج تھا یعنے واردات عشق بیان کرنا مگر بیان میں نہ جوش ہے نہ سوز و گداز اسی وجہ سے کسی قدر کلام پھیکا رہتا ہے۔ البتہ قصیدہ گوئی میں ان کا پایہ کسی قدر بلند نظر آتا ہے مگر وہ بھی ایران کے اندر ورنہ عرفی وغیرہ کے مقابلے میں لانا ہی بیکار معلوم ہوتا ہے کیونکہ نہ تو شوکت الفاظ ہے اور نہ طبیعت زوردار۔ ہاں اِتمہید میں نئی نئی ایجاد کی ہیں مثلاً :۔

دہندۂ کہ بہ گل نکہت و بہ گل جان داد | بہر کہ ہر چہ سزا بود حکمتش آن داد
بعرش رتبۂ عالی بفرش پایۂ پست | زروی مصلحت و رای مصلحت دان داد
(خدا)
دو کشتی متساوی اساس را در بحر | یکے رسانند بہ ساحل دگر بطوفان داد
دو سالک متشابہ سلوک را در عشق | یکے نوید بوصل و دگر بہ ہجران داد[۱]

اسی طرح گنواتے جاتے ہیں اور آخر میں کہتے ہیں :۔

چو پادشاہی اقلیم صورت و معنی | زیادہ دید زشاہاں بہ میرمیراں داد
(ممدوح)

اصل کمال ان کا مرثیہ گوئی میں ہے۔ واقعات کربلا ایک خاص طرز میں نظم کئے ہیں بعض بند نقل کئے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ واقعی اس سانحۂ ہوشربا سے ان کے دل پر چوٹ لگی ہے جبھی دل ہلانیوالے شعر نکل رہے ہیں :۔

باز ایں چہ شورش است کہ در خلق عالم است | باز ایں چہ نوحہ و چہ عزا و چہ ماتم است
باز ایں چہ رستخیز عظیم است کز زمیں | بے نفخ صور خاستہ تا عرش اعظم است
گویا طلوع میکند از مغرب آفتاب | کاشوب در تمامی ذرات عالم است
گر خوانمش قیامت دنیا بعید نیست | ایں رستخیز عام کہ نامش محرم است
در بارگاہ قدس کہ جائے ملال نیست | سرہائے قدسیاں ہمہ بر زانوی غم است

---

[۱] یہ شعر اوپر کے شعر کا تقابل بہت اچھا ظاہر کرتا ہے۔

جنّ و ملک بر آدمیان نوحہ میکنند گویا عزائے اشرفِ اولادِ آدم است

خورشید آسمان و زمین نورِ مشرقین

پروردہ کنارِ رسولِ خدا حسینؑ

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا اثر کائنات پر ایک اور ہندی نے یوں نظم کیا ہے:۔

چوں خونِ حلقِ تشنہ او بر زمین رسید جوش از زمین بذروہ عرش بریں رسید
(بلندی)

نخلِ بلند او چہ خساں بر زمین زدند طوفان بآسمان زغبارِ زمین رسید
(یعنی لوگوں نے)

بادِ آں غبار چوں بمزارِ نبیؐ رسانند گرد از مدینہ بر فلکِ ہفتمین رسید
(ہوا نے) (پہونچایا)

یکبارہ جامہ در خمِ گردوں بہ نیل زد چون این خبر بہ عیسیٰ گردوں نشین رسید

پُر شد فلک زغلغلہ چون نوبت خروش از انبیا بحضرتِ روح الامیں رسید
(جبرئیل)

کرد این خیال وہم غلط کار کان غبار تا دامنِ جلالِ جہان آفرین رسید

ہست از ملال گرچہ بری ذات ذوالجلال

او در دلست و ہیچ دلے نیست بے ملال

حقیقت یہ ہے کہ واقعۂ کربلا کی عظمت ان خیالات سے بحد بلند ہے اور کسی شاعر کے امکان میں نہیں کہ اس حزن و ملال کا پورا اندازہ کر سکے جو اس سانحۂ جانکاہ کی وجہ سے کائنات پر طاری ہوئے۔ صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مکی میں لکھا ہے کہ قتل حسینؑ کی وجہ سے آسمان سرخ ہو گیا تھا اور آفتاب کو ایسا شدید گہن لگا تھا کہ تارے دکھائی دیتے تھے۔ بلکہ لوگوں کو خیال ہوا کہ قیامت برپا ہونیوالی ہے۔ علامہ ابن جوزی نے اسی آسمان کی سرخی کے بارے میں لکھا ہے کہ غضب کی حالت میں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور ذات اقدس الٰہی چونکہ جسمیت سے منزہ ہے قتل حسینؑ پر اسکے غضب کی تاثیر سرخیِ افق کی صورت میں ظاہر

ہوئی۔ علاوہ بریں یہ بھی نقل کیا ہے کہ ملک شام میں جو پتھر اٹھایا جاتا تھا خون تازہ جوش مارتا ہوا نکلتا تھا۔ اور ایسے ہی بکثرت روایات شاعر کے پیش نظر ہیں جن پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے اعتقاد رکھتا ہے اور اسی جوش مذہبی میں مرثیہ کہتا ہے۔ ہم پیشتر لکھ چکے ہیں کہ مرثیہ کے خصوصیات میں سے یہ ہے کہ اپنے جوش قلب کی سچی تصویر کھینچے۔ مرنے والے کی عظمت اور خصوصیات ایسے الفاظ میں ظاہر کرے کہ دوسرے بھی متاثر ہوجائیں۔ صحن عالم میں جو چیز ہو اسے شریک غم کرلے۔ اور سارے عالم کو مرنے والے کا سوگوار بنالے یہ سب امور اس واقعہ ہائلہ میں علی وجہ الکمال موجود ہیں۔ کیونکہ اہل اسلام[1] کی نظروں میں خود یہ دن ہولناک اور اندوہناک معلوم ہوتا ہے۔ مقتول کی عظمت ایسی ہے کہ سب کے قلوب متاثر ہیں۔ عالم بحیثیت حقیقت میں سوگوار ہے۔ ایسی حالت میں مرثیہ ضرور پر تاثیر ہوجائیگا بشرطیکہ شاعر سلیقۂ نظم درست رکھتا ہو اور فصاحت و بلاغت کے مقامات کی پوری رعایت کرتا ہو۔ کسی شاعر نے داب نظم اور نتیجۂ مرثیہ کو خوب ایک شعر میں ادا کر دیا ہے :۔

دبدبہ بھی ہو فصاحت بھی ہو توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

سحابی استرآبادی۔ جو جائی الاصل شوستر میں پیدا ہوا اور نجف اشرف میں متوطن ہو گیا۔ شاہ عباس اعظم کا ہمعصر ہے اور فن شعر میں خیام ثانی ۱۰۱۲ھ اس کی تاریخ وفات لکھی ہے (مجمع الفصحا)۔ اسکی رباعیاں اس دور کی بہترین یادگار ہیں۔ خیام کے وقت سے یہ صنعت شعر محض تفنن طبع کے کام میں آتی تھی سحابی نے سحابی

[1] دیکھو صحیح ترمذی۔ روایت ابن عباسؓ و ام المومنین ام سلمہؓ وغیرہ اور صواعق ابن حجر متعلق احادیث فضائل عاشورہ۔

اسے پھر معراج کمال تک پہونچا دیا۔ علاوہ غزلوں کے سترہ ہزار رباعیاں اسکی تصنیف سے بتائی جاتی ہیں۔ مولانا شبلی نے بھی کئی ہزار رباعیاں اسکی دیکھی ہیں بعض مقامات پر خیام سے بھی سبقت لے گیا ہے۔ مثلاً خیام سراسر جبر کا قائل ہے حالانکہ اسلام نے اعتدالی حالت پر اعتقاد رکھا ہے۔ لا جبر و لا تفویض بل الامر بین الامرین۔ نہ بالکل مجبوری ہے نہ مطلق العنانی۔ شعرا کے لئے یہ مقام نہایت نازک ہے۔ مؤلف نے یہ مسئلہ یوں سمجھا ہے:۔

یہ دل کے ولولے ہیں جو مجبور کرتے ہیں   ہاں اجبر اگر کریں تو بڑا اختیار ہے

سحابی ذات واجب تعالیٰ کو خیر و شر اور جبر و اختیار دونوں سے بلند سمجھتا ہے۔ وہاں سے جو چیز آتی ہے عالت اطلاق میں آتی ہے۔ یہ ہمارے تعلقات ہیں جو اسے لذت یا الم قرار دے لیتے ہیں۔ کہتا ہے:۔

عالم بخروش لا الٰہ الا ہو ست   غافل بگماں کہ دشمن است او یا دوست

دریا بوجود خویش موجے دارد   خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

اخلاقی تعلیم بھی بہت بلند دیتا ہے۔ نیکوں سے ملنا تو ضرور ہے مگر بدوں سے دور رہنا ناگوار ہے وہ شلیگل وغیرہ کی طرح چاہتا ہے کہ بدکاروں سے ارتباط بڑھا کے انھیں ہدایت کا راستہ دکھایا جائے:۔

نے با ہر کس نکو ست میباید بود   بد را ہم مغز و پوست میبایاید بود

کارے سہل است دوست بودن با دوست   با دشمن نیز دوست میباید بود

حقیقت کی جستجو میں بھی معمولی عارفوں سے اتنا بلند جاتا ہے کہ تصوف کو بھی ایک قسم کی رسم پرستی سمجھتا ہے۔ چاہتا ہے کہ اس سے بھی آزاد ہو کے رہے۔ اس کا عالم وصال اور ہی کیفیت کا ہے:۔

از ہر دو جہاں زیادہ میخواہم   از پردہ برون فتادہ می خواہم

صوفی تو بکارِ خویش رہ کاین رہ را   یا بر سرِ خود نہادہ می خواہم

اسکی جویائی نہ مرشد کی محتاج ہے۔ نہ راہبر کی۔ یہ اپنے ہی وجود کو راہبر بھی سمجھتا ہے اور مطلوب بھی۔ اسکو مطلوب کی تلاش میں کہیں جانا ہی نہیں:۔

آنم کہ ندارم بدو عالم کامے   نایافتہ جز پیکِ وجود آرامے
گر خلقِ جہان جملہ چو من بودندے   لازم نشدے رسولے و پیغامے

اس کا جوش اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ ایک تو گمراہ ہونے کا کھٹکا ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو مطلوب ہی سے کہتا ہے کہ اگر میں کھو جاؤں تو تو خود ڈھونڈ نکال تاکہ ہر رنگ میں تیرا ہی نظر آؤں۔ ہاں! اگر تو نے جستجو نہ کی تو پھر کھو جاؤں گا:۔

گم گردم اگر تو جستجو یم نکنی   آئینہ صفت روی بروئیم نکنی
در حقِ خود از لطفِ تو گفتم بسیار   یارب یارب دروغ گویم نکنی

شیخ بہائی ۔ حضرت بہاء الدین عاملی شاہانِ دولت صفویہ کے زمانے میں عالم جلیل القدر تھے اور پایۂ تخت میں شیخ الاسلام کا مرتبہ رکھتے تھے۔ درویشی اور سیاحت کی طرف رغبت ہوئی تو تیس برس اسی میں صرف کر دئے اور حج و زیارت عتبات عالیات سے بار بار مشرف ہوئے۔ انھیں سفروں میں ایک بار ایک روز جہاز پر رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس دن ایک مختصر مثنوی مولانا روم کی بحر میں نظم کر ڈالی۔ اور مولانا کو آخر میں یاد بھی کیا:۔ شیخ بہائی

قُم و زمزم لی باشعارِ العجم   کی تروح اللہ روح من ہم و غم
وابتدأ منہا ببیتِ المثنوی   للحکیمِ المولویِ المعنوی
بشنو از نے چون حکایت میکند   وز جدائیہا شکایت میکند

اس مثنوی کا نام نان و حلوا ہے اس میں دنیوی لذات کا روحانی لذات سے مقابلہ کیا ہے اور اچھا کیا ہے۔ اشعار عربی میں بھی ہیں اور فارسی میں بھی۔ معشوق

کے تخییل میں چند شعر نقل کئے جاتے ہیں :-

از درم ناگہ درآمد بے حجاب ... لب گزاں و رخ براگندہ نقاب

کاکل مشکیں بدوش انداختہ ... وز نگاہے کار عالم ساختہ

یکدست بنشست بربالین من ... رفت و با خود برد عقل و دین من

گفتمش کے بینمت اے خوشخرام ... قال نصف اللیل لاکن فی المنام

مولانا روم کے مقابلے میں ان چند اوراق کا ذکر نہیں کیا گیا۔ البتہ یہ اقتباسات اس امر کو ثابت کرنے کے لئے ہیں کہ اس زمانے کے علما بالکل خشک نہ تھے بلکہ شاعری کا پورا ذوق رکھتے تھے۔ جناب شیخ کا ۱۰۳۰ھ میں انتقال ہوا اور مشہد مقدس میں مدفون ہوئے فارسی شعر میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں سے جامع عباسی پنج بابی فقہ میں بہت مشہور رہے۔ عربی تصانیف بہت ہیں اور نہایت عمدہ۔

ملا حسن کاشی ... ملاحسن کاشی کا ہفت بند منقبت امیر المومنین علیہ السلام میں بہت مشہور ہے یہ بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ تخییل کے ساتھ اعتقادات شامل ہیں اور احادیث مناقب کی تلمیحیں نہایت خوشگوار ہیں مثلاً :-

ساقی کوثر نہ چنداں مدح باشد مر ترا ... اے ز تو دریاے فطرت کان گوہر یافتہ

با خدا و مصطفےٰ اراے تو یکرو داشتہ ... وز خدا و مصطفےٰ شمشیر و دختر یافتہ

با صفائے گوہر پاک تو رضواں سالہا ... خاکِ خجلت بر جبینِ آبِ کوثر یافتہ

یہ ہفت بند ایران اور ہندوستان میں بیحد مقبول ہے اور تبرکاً لوگ روزانہ پڑھتے ہیں۔ زبان اسکی نہایت شیریں اور سلیس ہے اور استعارات وغیرہ اتنے پیچیدا نہیں کہ کلام کو بدمزہ کر دیں۔

شانی تکلو ... شانی تکلو کا عروج شاہ عباس اعظم کے دربار میں ہوا۔ اُسنے ایکبار یہ مطلع پڑھا۔

اگر دشمن کشد ساغر و گر دوست ... بطاق ابروے مستانۂ اوست

بادشاہ نے اُسے سونے میں تُلوادیا۔ آخر عمر میں مشہد مقدس کا مجاور ہوگیا اور ۱۰۲۳ھ میں رحلت کی۔ غزل گوئی میں زمانے کا رنگ غالب ہے وہی واقعات عشق مجازی کا نظم کرنا اور شیریں ادائی سے زبان کو دلکش بنا لیتا ہے:۔

دیگراں را در گرفتاری شریکِ ما مکن

مدعا گر شہرتِ حُسن است یک رسوا بس است

غرض دورۂ صفویہ میں جتنے اقسام کی شاعری ظہور میں آئی اُن سب کے نمونے ہم اس باب میں ذکر کرچکے ہیں لیکن سرزمین ایران کے نازک خیال ایران میں اس زمانے میں قیام نہ کرسکے اور ہندوستان چلے گئے۔ ان کے یہاں نازک خیالی فلسفہ طرازی۔ سوز و گداز اور تصوّف کی بہترین مثالیں ہیں مگر چونکہ نشو و نما ہندوستان میں ہوئی اور وہیں یہ اسالیب کامیاب ہوئے لہذا ان سب کا ذکر آئندہ باب میں کیا جائیگا۔ صفویہ خاندان کے سلاطین اور شہزادے بھی شاعر اور مصنّف تھے خصوصاً شہزادہ سام میرزا کا تذکرۂ سامی نہایت معتبر ہے اور اکثر مصنّفاتِ حال میں اُس سے استناد کیا گیا ہے۔ اشعار بھی نہایت صاف کہے ہیں چنانچہ بعض بہت مشہور رہیں مثلاً:۔ سام میرزا

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم　　　شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

اسی طرح القاص میرزا پسر شاہ اسمٰعیل اول مصطفےٰ میرزا پسر زادۂ شاہ طہماسپ اول۔ بہرام میرزا برادر شاہ طہماسپ وغیرہ بھی شاعر تھے۔ شاہ اسمٰعیل بانئے دولت صفویہ خود بھی نہایت خوشگو تھے اور خطائی تخلص کرتے تھے طبیعت کا اندازہ اس شعر سے ہوجائیگا:۔

بے ستوں نالۂ زارم چو شنید از جا شد　　　کرد فریاد کہ فرہاد دگر پیدا شد

شاہ عباس اعظم کے اشعار بھی مشہور ہیں۔ شاہ طہماسپ انکے باپ عادل تخلص

کرتے تھے۔ آخری سلاطین صفویہ کا ذوق بھی شعر و شاعری کی طرف تھا۔ مگر عرفی، نظیری و صائب وغیرہ کا ہندوستان چلا آنا یا تو اس سبب سے تھا کہ اکبر و جہانگیر وغیرہ کے درباروں میں قدر دانی زیادہ ہوتی تھی یا اختلاف مذاق شعری تھا جس نے ایسے کاملوں کو وطن سے ہٹا دیا کیونکہ ایران نازک خیالی میں کمال پیدا کئے بغیر سادگی کی طرف مائل ہو چکا تھا اور ہندوستان میں اس رنگ کو حد کمال تک پہونچنا تھا اگرچہ نتیجہ یہاں بھی بالآخر یہی ہونے والا تھا کہ سادگی ادا کو ان ترکیبوں پر ترجیح دیجائے مگر اس کے اسباب دوسرے تھے نہ یہ کہ پہلے ہی سے ایک رنگ لطیف و دلکش کو خیرباد کہہ دیتا۔

نثر میں ہم کہہ چکے ہیں کہ مذہبی کتابیں بکثرت لکھی گئیں اور سلاطین علمائے شیعہ کی محنتیں ٹھکانے لگیں۔ علامہ محمد باقر مجلسی کے (المتوفی ۱۱۱۱ھ) فارسی تصانیف علامہ مجلسی (علاوہ بحارالانوار وغیرہ کے) حیات القلوب (حالات انبیا میں)۔ جلاء العیون (حالات ائمہ اثنا عشر میں) عین الحیات (مواعظ میں)۔ حق الیقین (علم کلام میں) مذہبی معلومات کے نشر کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ میر باقر داماد فلسفہ وغیرہ میں اپنے میر باقر داماد وقت کے بوعلی سینا تھے اور ثالث العلمین[1] کہلاتے تھے۔ انکے والد ماجد امیر شمس الدین محمد الحسینی کا عقد شیخ علی بن عبد العالی کرکی موسس اساس شیعہ کی صاحب زادی سے ہوا تھا اسوجہ سے داماد کہلاتے تھے۔ میر محمد باقر کا بھی یہی لقب رہا۔ ملا صدرا مشہور فلسفی انھیں کے شاگرد تھے۔ شاعری میں اشراق تخلص تھا۔ ایک رباعی نعتیہ نقل کی جاتی ہے تاکہ ان کا مذاق سخن معلوم ہو جائے:۔

اے ختم رسل دو کون پیرایۂ تست
افلاک یکے منبرۂ پایۂ تست
گر جسم ترا سایہ نیفتد چہ عجب
تو نوری و آفتاب خود سایۂ تست

---

[1] معلم اول ارسطو ہے اور معلم ثانی ابو نصر فارابی۔

سنہ ۱۰۵۰ھ میں انتقال فرمایا اور عربی میں افق المبین وغیرہ نادر کتابیں چھوڑیں۔ فارسی میں ایک رسالہ جذوات اس وقت پیش نظر ہے جس میں حقائق حکمت و معرفت بیان فرماتے ہیں۔ عبارت دقیق ہے اور عربیت سے لبریز۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"اول مرتبۂ عقول محض کہ انوار عقلیۂ قاہرہ اند و در عرض ایں مرتبہ اشرف و اتم و اعلیٰ و اقدم عقل نخستین کہ صادر اول و اسبق اشعۂ تنزلات نور الانوار است و باصطلاح اوراعقل کل گویند"

میرزا محمد رفیع واعظ قزوینی گیارھویں صدی کے آخر میں گذرے ہیں۔ انکی کتاب ابواب الجنان مواعظ میں بے نظیر ہے۔ انشا پردازی شیریں ہے۔ قافیہ و وزن کا حسب دستور زمانہ التزام ہے اور استعارات و تخیل سے ہر بیان وابستہ ہے لیکن مضامین کی بنیاد سراسر قرآن و حدیث پر ہے اور حکایات بھی مذہبی روایات ہیں۔ اس کا نمونہ بھی دیکھو۔ اہل قبور کے حال میں لکھتے ہیں :۔ میرزا محمد رفیع واعظ

"در زیر پائے ما یک دو ذرع فاصلہ چہ خبر و چہ صحبت۔ و در ین شکافہائے زہرہ شکاف چہ ہول و چہ وحشت است۔ ابنائے جنس ما بیند کہ با خاک تیرہ یکساں گشتہ اند۔ اقران و امثال ما بیند کہ نالۂ پر حسرت شان بزبان حال از فلک گذشتہ۔ گردن کشانند سر بگریبان مذلت کشیدہ و سخت مردانند بہ سنگ صعوبت اجل نرم گردیدہ"

منشی سکندر نے تاریخ عالم آرائے عباسی دولت صفویہ کے حال میں شاہ عباس اعظم تک سنہ ۱۰۲۵ء تا ۱۰۲۹ء کے زمانہ میں لکھی اور انشا پردازی کا نشان بلند کیا۔ منشی سکندر
ظاہر ہوتا ہے سے عبارت شاہانہ ہے۔ فقرے اُلجھے بھی ہیں سلجھے بھی ہیں۔ استعارات کا رنگ کہیں گہرا ہے کہیں ہلکا۔ ترکی الفاظ ضرورت سے زائد داخل کر کے غرابت پیدا کر دی ہے۔ بالکل سادگی کہیں نہیں۔ آفتاب برج حمل میں داخل ہوتا ہے

تو یوں کہتے ہیں۔ "آفتاب عالمتاب، کہ نیر اعظم و منور ساز صفحۂ عالم است باکوکبۂ نور واشوۂ جہان آرائے بہجت و سرور قدم بر بساط شرف نہاد"۔ بادشاہ گھوڑے پر سوار ہو کے چلا تو کہتے ہیں "عنان اشہب صبا پیوند بعزم سیر و شکار سواحل رود پیرمند و انتظام مہمات ضروری خراسان بدانصوب انعطاف دادہ"۔

مرزا مہدی خاں نے آخر دور میں نادر شاہ کی تاریخ جہانکشائے نادری کے نام سے تصنیف کی اور عالم آرائے عباسی کا چربہ اتارا مگر زبان زیادہ سلیس ہے اور الجھاؤ بھی بہت نہیں ہے البتہ انکی دوسری تصنیف دُرّۂ نادرہ جو نادر کے واقعات میں ہے غیر مانوس عربی الفاظ اور طویل فقروں سے مملو ہے۔ الفاظ کا انبار ہے اور معانی ندارد۔ اور لفظیں بھی پتھر۔ زبان کی نزاکت کو چکنا چور کر دینے والی۔ غرض کتاب کی ہیبت نادر کی ہیبت سے کم نہیں غنیمت ہے کہ یہ طرز مقبول نہ ہوئی ورنہ خدا جانے کیا ہو جاتا۔ مرزا مہدی

مختصر یہ کہ عہد صفویہ ہر قسم کی نثر و نظم کے لئے یادگار ہے۔ اگرچہ تیموری عہد کے سے کامل اس عہد میں کم ملتے ہیں اور مذہبی لٹریچر سے قطع نظر کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور بہت ہلکا ہے۔ لیکن تعداد کے اعتبار سے بہت آگے ہے کیونکہ مدت بھی طویل ہے۔ نادر شاہ کے بعد قتل و غارت کا بازار گرم رہا اور علوم و فنون کی ترویج رک گئی لہذا آخری باب قاچاریوں کے عال سے شروع کیا جائے گا۔ خاتمۃ الکلام میں چند مصنفین کا اور ذکر کیا جاتا ہے جن سے تاریخ انشائے عجم کو تعلق ہے۔

حاجی لطف علی بیگ آذر۔ خاندان شاملو کے شرفا میں سے تھا۔ عادل شاہ افشار کے زمانے سے شعر کہنا شروع کیا اور کریم خاں زند وغیرہ کی تعریف میں بھی اشعار کہے ہیں ۱۱۲۳ھ میں پیدا ہوا اور ۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا۔ فترت، آذر و آتشکدہ

نادرشاہی اور بعد کے ہنگامے اسے وطن آوارہ کئے رہے۔ اسی دوران میں حج و زیارات وغیرہ سے فراغت کی۔ فن شعر میں میر سید علی مشتاق کا شاگرد ہے۔ قصیدہ گوئی میں کریم خاں زند وغیرہ کا مداح ہے۔ غزلیں اچھی کہتا ہے۔ ایک مثنوی یوسف زلیخا بھی نظم کی ہے جو آتشکدہ کے آخر میں نقل ہے۔ نثر میں اس کا آتشکدہ تذکرہ شعرائے فارسی میں یادگار ہے۔ صاف اور سلیس زبان میں حالات شعرا بالخصوص اپنے ہم عصروں کے حال اچھے لکھے ہیں۔ انتخاب کلام بیشک بہت اچھا نہیں ہے اور اُن شعرائے ایران سے کم درست معلوم ہوتی ہے جو ہندوستان چلے آئے حالانکہ حسب تصریح مجمع الفصحا آتشکدہ خود ہندوستان میں تصنیف ہوا۔ مثنوی یوسف زلیخا میں سے اس مقام سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جہاں زنان مصر نے حسن یوسف سے مبہوت ہو کے انگلیاں کاٹ ڈالیں :-

زنان را دست چون از تیغ شد ریش | زلیخا این سخن بگفت با خویش
چه بودے یا رب این گنج تمنا | بجاے کف بریدندے زبانہا
کسے را کاتش عشقے نہان است | زکس تا بیستش رشکے نہان است
چو آید پاے غیرے در میانہ | کشد آن آتش پنہان زبانہ

یہ نمونہ اس مثنوی کے بہترین اشعار کا ہے۔ چند اچھے شعر غزلوں سے بھی منتخب کئے جاتے ہیں :-

دم مُردن شدی دمساز چون من ناتوانے را
مرا گر زندہ کردی کشتی از رشکم جہانے را

باں درخت زیاں یا رب از خزان مرساد
کہ زیر سایۂ خود مرغ بے پرے دارد

مطرب، امشب نالہ سر کردہ است نائے میزند
در میانِ نالہ حرفِ آشنائے میزند

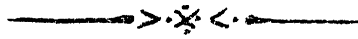
خدمتِ دیرین ما بیں ورنہ در آغازِ عشق

ہر کرا بینی دم از مہر و وفا ے میزند

تذکرۂ حیرت اور تذکرہ طاہر

اسی زمانے میں قیام الدین حیرت نے تذکرۂ مقالات الشعرا اور محمد طاہر نصیرآبادی نے تذکرۃ الشعرا تصنیف کئے افسوس کہ یہ موجود نہیں ورنہ کچھ انکے متعلق بھی لکھا جاتا۔

اسی طرح خواجہ زین العابدین (المتوفی سنہ ۱۵۰۸ء) کی مشہور کتاب جام جمشید اور محمد قاسم کاشانی کی مشہور لغت مجمع الفرس بھی ذکر کے قابل ہیں مگر بخوف طول یہ باب ختم کیا جاتا ہے۔



باب یازدہم

ہندیہ

فارسی کی وسعت

اس وقت تک جو کچھ بیان ہوا ہے وہ زبان کی اُن خفیف لطافتوں تک محدود ہے جنکی نشو و نما سرزمین عجم میں ہوئی۔ اکثر نازک محاورے اور شیریں فقرے اور جملے ایرانی آب و ہوا میں پرورش پا کے فارسی کا جزو بنے۔ کبھی اسم و فعل ملا کے محاورات پیدا کیئے گئے جیسے تن زدن (خاموش ہوجانا)۔ دراز کشیدن (پاؤں پھیلا کے لیٹنا)۔ تر آمدن (شرمانا)۔ سر کردن (شروع کرنا)۔ کبھی حرف و فعل کی ترکیب سے جیسے در افتادن (لڑنا)۔ بر افتادن (شکست کھانا)۔ در گرفتن چراغ (چراغ کا بھڑکنا)۔ اسی طرح اور متعدد ترکیبیں پیدا کی گئیں اور دلکش و دل نشین محاورات ترتیب دیئے گئے۔ مثلاً دل تنگی (غمگینی)۔ پا داری (استقلال)۔ یہ بھی بے ترتیبی وغیرہ وغیرہ لیکن یہ وسعت زبان بیشتر قوت تخیل کے ذریعے سے ہوئی ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ فارسی زبان کی وسعت کا بیشتر حصہ وہی ہے جو دامن شاعری کے سایہ میں پلا ہے محاکات نے بھی محاورات بنانے میں اچھی خاصی مدد دی۔ تم دیکھتے ہو کہ جب کوئی شخص خاموش ہوجاتا ہے اور ہزار کہو مگر نہیں بولتا۔ اس وقت جھنجھلا کے انگلی اُسکے ہونٹ پر مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بولتا کیوں نہیں۔ ایرانی نے اسکی تصویر کھینچ کے محاورہ بنالیا۔ ”ہر چند انگشت بر لبش زدم۔ حرفے از زبانش بر نیامد“ اسیطرح جہاں ہم بولتے ہیں کہ جان پر آبنی۔ ایرانی کہتا ہے ”کار بہ استخوان رسید“ سہل بات کو ”پیش پا افتادہ“ کہدیتا ہے۔ بھرم کھل جانے کے مقام پر کہتا ہے ”بخیہ از روے کارش افتاد“۔ غرض تخیل و محاکات کی قوتوں سے بہت بڑا ذخیرہ کنایوں

اور استعاروں کا تیار ہوا جو کثرت استعمال سے محاورہ کہلانے لگا اور جزو زبان بن گیا۔ علاوہ بریں عربوں اور ترکوں کے اثر سے ان کی زبان کے الفاظ بھی فارسی میں شامل ہوئے جس سے اور بھی وسعت ہو گئی بلکہ عربی الفاظ نے فارسی کا جامہ پہن کے کبھی کبھی ایسا رنگ بدلا کہ عرب کو اپنا مال پہچاننا دشوار ہو گیا مثلاً شاہد عربی میں گواہ ہے۔ فارسی میں معشوق۔ یا ارتفاع (بلندی) سالانہ آمدنی ہے یا طامات (مصائب) طامات۔ مقالات نامشروع ہیں بعض الفاظ کی صورت تک بدل گئی۔ عربی میں محفّہ تھا فارسی میں محافہ ہو گیا۔ یا حاجّ (حج کرنے والا) حاجی کہلانے لگا بعض کے لفظی ترجمے فارسی میں کئے گئے اور رفتہ رفتہ محاورہ بن گئے مثلاً بالراس والعین (بسر و چشم)۔ بنت العنب (دختر رز) رطب اللسان (تر زبان) وغیرہ وغیرہ۔

ہندوستانی فارسی

یہ زبان جب فاتحوں اور درویشوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی تو اپنے توسع کے اصول و قوانین ساتھ لیتی ہوئی آئی۔ پہلے ہندی الفاظ پر بقاعدہ تفریس قبضہ کرنا شروع کیا۔ کسی نے کہا:۔

سر آں دو چشم گردم کہ چو ہندوانِ رہزن ۔۔۔ ہمہ را بنوک مژگاں زدہ برجگر کٹارہ[1]

شوخ سوسن را بگو دل میبرباید غنچہ است ۔۔۔ ذات رنجیوت است تا ہم دست بر جمدھر کند

اسی طرح متھرا ہندوستان کا مشہور شہر متورہ[2] ہو گیا جھگڑا جکڑہ[3]۔ جھروکہ۔ جروکہ۔ کھچڑی[4] کچڑی۔ چوکھنڈی[5] (بالاخانہ) چوکندی جیسلمیر کا پہاڑ جیسر میر۔ کہار کہّارہ[6] وغیرہ وغیرہ۔

---

[1] فرہنگ رشیدی میں اسے کتارہ سے مشتق سمجھا ہے حالانکہ کٹارہ خاص ہندی لفظ ہے ۱۲

[2] چوں زند سبز متورہ حرفے از پاژند حسن ۔ بہر زیب نطق مصحف خوانِ گل از بر کند

[3] عرفی کہتا ہے:۔ ور حاشتگہ از شبنم گل عرق فشانست ۔ آں باد کہ ور ہند گر آید جکڑہ آید

[4] سیر گشتم ز کچڑی ایام ۔ ہوس سیم و زر نمیدارم

[5] چوکندی شکوہش اگر سایہ افگند ۔ پیل سپہر شانہ بدزدد بزیر آں

[6] چوں کردہ رو بہ پالکی گردیدہ خاور پالکی ۔ بنشست تا در پالکی نہ چرخ کہّارہ آمدہ

جب مدت کے بچھڑے ہوئے ملتے ہیں تو تپاک بڑھ جاتا ہے۔ فارسی زبان جب آرین قوم کے پاس واپس آئی تو ایک صورت کبھتی کی اور نکل آئی یعنے بعض چیزوں کے ہندی نام ترک کر کے فارسی نام وضع کئے گئے اگرچہ ایران میں بھی انکے نام موجود تھے مگر آریا ورت اپنی فارسی چاہتا تھا مثلاً چمٹا دست پناہ کہلایا۔ اگرچہ آتشگیر ایران میں نام موجود تھا (اور بے تکلفی اتنی بڑھی کہ دسپنارہ گیا یعنے ہندی لباس پہن لیا)۔ ہاتھوں کی حفاظت کے لئے میدان جنگ میں جو چیز پہنتے تھے ہندوستان میں اس کا فارسی نام "دستانہ" رائج ہوا اور ایرانی اپنی زبان چھوڑ کے ترکی لفظ "قلچاق" بولنے لگے۔ کپڑوں کے نام تن زیب۔ جامدانی۔ کامدانی وغیرہ۔ یا عہدوں کے نام برق انداز۔ جمعدار۔ رسالدار وغیرہ ہندوستان میں رائج ہوئے۔ اسی طرح سندِ قبض الوصول ہمارے ملک میں رسید کہلانے لگی اور مرکّب کا نام روشنائی ہوگیا۔ تخییل و محاکات کے زبردست قانون تو موجود ہی تھے۔ لہذا یہاں بھی ہر روز نئے نئے استعارات و تشبیہات پیدا ہونے لگے جن کی ایرانیوں کو خبر بھی نہ ہوئی اور رفتہ رفتہ جزوِ زبان ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی فارسی ایران کی فارسی سے جدا ہوگئی۔

دورۂ غزنویہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسعود سعد سلمان کا مستقل قیام پنجاب میں ہوا اور انکی نظم و نثر فارسی بیشتر یہیں مرتب ہوئی۔ فاتحان اسلام کے ساتھ ہر عہد اور ہر دور میں علما و فضلا، شعرا، مورخ، اہل صنعت و حرفت وغیرہ یہاں آتے جاتے رہے اور انکی فارسی پہ ہندوستانی رنگ بھی چڑھتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے فارسی لٹریچر کا ارتقاے فطری یہاں کے مذاہب و رواسم۔ آب و ہوا اور تمدن سے متاثر ہوکے ہوا اور فطرۃً ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ کا انگریزی لٹریچر بالکل انگلستان کے لٹریچر سے جدا ہے بلکہ انگلینڈ۔ اسکاٹلینڈ

اور آئرلینڈ کے لٹریچر تو یکساں نہیں مگر فنِ تنقید ہر ایک کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔
ہمارے ملک کی فارسی کے لئے بہت بڑی بدنصیبی تھی کہ جب کسی نے تنقید کی تو یہاں کے لٹریچر کو ایران کی فارسی کا جزو سمجھ کے کی اور اعتراضات رکیکہ کا انبار لگا دیا۔ حالانکہ یہ رویہ اختیار کرنا تنقید کی منقصت اور نقاد کی کوتاہ نظری کا ثبوت دیتا ہے۔ ہم نے یہ باب اسی لئے جدا کر دیا کہ ایک دورۂ ہندیہ قائم کرکے یہاں کی فارسی کا تدریجی ارتقا دکھا سکیں اور جن ایرانی شاعروں کو ایرانیوں نے ہندی کہہ کے حقیر کر دیا ہے انھیں بھی شامل کر لیں کیونکہ انکی نشو و نما یہاں کے ماحول میں ہوئی اور جو کچھ انھوں نے تصنیف کیا وہ ہندوستانی فارسی کی ارتقائی تدریج کا ایک جزوِ مستقل ہے۔

منہاج السراج — اگرچہ ہندوستان میں شاعری کا سلسلہ غوریوں ہی کے وقت سے شروع ہو گیا اور نثر میں منہاج السراج[1] نے تاریخ **طبقات ناصری** تصنیف کر کے ناصر الدین محمود کو غالباً ۶۵۸ھ میں نذر دی لیکن مسلسل تاریخ شعر خلجیوں کے وقت سے شروع ہوتی ہے اور امیر خسرو دہلوی پہلے ہندی نژاد ہیں جنھوں نے فارسی میں نظم و نثر لکھنے کو قلم اٹھایا۔

امیر خسرو — امیر صاحب ۶۵۱ھ میں پٹیالی (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہوئے۔ انکے والد سیف الدین ترکوں کے مشہور قبیلۂ لاچین سے منسوب تھے اور فتنۂ چنگیز خانی میں ہندوستان چلے آئے تھے۔ جب خسرو نے ہوش سنبھالا تو درسیات پڑھنے کیلئے بٹھائے گئے۔

---

[1] منہاج کی ولادت ۵۸۹ھ میں بمقام جوزجان متصل بلخ واقع ہوئی اور ابتدائی عمر شاہان غور کی ملازمت میں باپ دادا کی طرح گذری ۶۲۴ھ میں ہندوستان آیا اور سلطان ناصر الدین قباچہ کی ملازمت کی شمس الدین التمش کا غلبہ ہو جانے پر اُسکی سرکار سے متوسل ہوا اور اُسی کے فرزند کو طبقات ناصری نذر دی۔ اس کتاب میں چنگیز خاں و ہلاکو خاں کے حملوں کے حال بالتفصیل دئے ہیں اور بعض واقعات ایسے بھی نقل کئے ہیں جو دوسری کتابوں میں نہایت مشکل سے ملینگے ۱۲

موزونی طبع کے آثار بچپن ہی میں ظاہر ہونے لگے اور کچھ نہ کچھ نظم کرنا شروع کر دیا۔ درسیات عربی و فارسی ختم کرنے کے بعد کشلو خاں (معروف بہ چھجو خاں) کا تقرب حاصل ہوا (یہ زمانہ غیاث الدین بلبن کا تھا) ایک دن اتفاق سے بغرا خاں (پسر بلبن) کے دربار میں بیٹھے تھے اور شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ امیر خسرو نے جو اشعار اپنی خاص دھن میں پڑھے تو شہزادہ نے خوش ہو کے ایک لگن بھر کے روپے عطا کئے۔ چھجو خاں کو یہ عطیہ لینا ناگوار ہوا اور امیر صاحب مجبوراً بغرا خاں کے ساتھ ہو گئے۔ پھر سلطان محمد قاآن (بلبن کے بڑے بیٹے) نے انھیں اپنے شعرائے خاص میں داخل کیا۔ اسی زمانے میں ارغون خاں (نبیرۂ ہلاکو خاں) کی طرف سے تیمور خاں نے لاہور پر حملہ کیا اور فتح و غارت کرتا ہوا ملتان تک آ گیا۔ یہاں سلطان محمد قاآن نے نہایت جوانمردی سے مقابلہ کیا مگر اتفاق سے ایک تیر ایسا کاری لگا کہ جاں بحق تسلیم ہو گیا۔ امیر خسرو اور حسن دہلوی بھی اس معرکے میں شریک تھے۔ تاتاری ان دونوں کو قید کر کے بلخ لے گئے جہاں انھوں نے ایک پُر درد مرثیہ میں یہ واقعات نظم کئے۔ دو برس کے بعد دہلی واپس آئے اور بلبن کے دربار میں مرثیہ پڑھا تو کہرام مچ گیا اور بادشاہ کو روتے روتے بخار آ گیا جس سے جانبر نہ ہوا۔ بلبن کے انتقال کے بعد خلاف وصیت کیقباد پسر بغرا خاں کو امرائے دولت نے تخت پر بٹھا دیا۔ یہ عیاشی میں مصروف ہو گیا۔ بغرا خاں نے جو سنا تو بنگال سے دہلی کی طرف چلا۔ کیقباد نے باپ کا مقابلہ کیا۔ آخر صلح ہوئی اور کیقباد دہلی واپس آیا۔ امیر خسرو نے کیقباد کے کہنے سے یہ واقعات ایک مثنوی میں نظم کئے جس کا نام قرآن السعدین ہے۔ یہ تصنیف ۳۶ برس کی عمر کی ہے اور سال اختتام ۶۸۸ھ۔ کیقباد کے بعد اس کا کمسن بچہ شمس الدین کیکاؤس (۶۸۹ھ میں) بادشاہ ہوا مگر اُسے قید کر دیا گیا اور جب خاندان میں کوئی دعویدار نہ رہا تو ملک فیروز شائستہ خاں نے جلال الدین خلجی لقب اختیار کر کے سلطنت پر قبضہ کیا۔ اس کا جاہ و جلال

علم دوستی کے ساتھ ساتھ تھا اور بڑے بڑے کملا ئے روزگار ایران سے آکر جمع ہو گئے تھے بلکہ ہر فن کا کامل دربار میں موجود تھا۔ اس چہل پہل میں امیر خسرو بھی داخل کئے گئے جنھیں امیر کا خطاب عطا ہوا اور امرائے دولت کا لباس خلعت میں ملا۔ امیر صاحب نے جلال الدین کے فتوحات پر ایک مثنوی نظم کی جسکا نام تاج الفتوح ہے۔ آخر جلال الدین کو اُسکے بھتیجے علاءالدین نے قتل کراکے سلطنت حاصل کی مگر باوجود اس بے رحمی اور بدعنوانی کے کاملین فن کی پرورش نہایت سیرچشمی سے کرتا رہا۔ علاوہ علما و حکما کے شعرا بھی کثرت سے تھے مگر امیر صاحب کے سامنے سب گرد تھے۔ **خمسہ نظامی کا جواب** اسی عہد میں نظم کیا اور آخری کتاب **ہشت بہشت** ۷۰۱ھ میں ختم ہوئی۔ غرض خلجیوں نے امیر صاحب کی بڑی قدردانی کی یہانتک کہ قطب الدین مبارک کے نام پر جب مثنوی نہ سپہر ۷۱۸ھ میں معنون کی تو اُس نے ہاتھی کے برابر روپئے تول کے انعام میں دیئے۔ خلجیوں کے بعد غیاث الدین تغلق کا زمانہ آیا تو وہ امیر صاحب کا سب سے زیادہ قدردان نکلا اور ایسا خوش کیا کہ اپنے نام پر **تغلق نامہ** لکھوالیا جس میں اُس کی سلطنت کے تفصیلی واقعات درج ہیں۔ تغلق جب بنگال گیا تو خسرو ہمراہ گئے اور وہیں رہ گئے۔ قضائے کار انکے مرشد خواجہ نظام الدین اولیا کا انتقال ہو گیا۔ یہ سن کے بیقرار ہو گئے اور روتے ہوئے دہلی واپس آئے۔ یہاں آکے سیاہ کپڑے سوگ میں پہن لئے اور چھ مہینے قبر کی مجاوری کر کے ۷۲۵ھ میں رحلت کر گئے اور پائین پا دفن ہوئے۔

امیر صاحب کا اگرچہ سلاطین و امرا کے درباروں سے تعلق رہا مگر طبیعت ہمیشہ فقر و تصوف کی طرف مائل رہی۔ **خواجہ نظام الدین** کہا کرتے تھے کہ امید ہست کہ خدا در روز جزا مرا بسینۂ سوزانِ ایں تُرک بخشد“۔ ایک دفعہ خواجہ صاحب لبِ دریا ہندوؤں کی عبادت اور اشنان کا تماشا

دیکھ رہے تھے کہ زبان سے نکلا:-

ہر قوم راست دینے راہے وقبلہ گاہے

خواجہ صاحب ٹوپی ذرا ٹیڑھی دیئے ہوئے تھے۔ خسرو نے برجستہ کہا:-

من قبلہ راست کردم بر طرفِ کج کلاہے

حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو سے زیادہ جامع شاعر شائد ہی کوئی ہوا ہو مثنوی (رزمیہ وصوفیہ دونوں) قصیدہ۔ غزل۔ قطعہ۔ رباعی۔ مستزاد۔ مرثیہ۔ غرض ہر صنعت کو نظم کیا ہے اور نہایت خوب نظم کیا ہے۔ ہندوستان کا ذکر تو کیا۔ ایرانی شعرا بھی عزت سے یاد کرتے ہیں شیخ سعدی کے دل پر انکے کلام کا اچھا اثر تھا (اگرچہ ملاقات کے لئے شیراز سے دہلی یا بنگال آنا ثابت نہیں) ملا جامی کہتے ہیں کہ خمسہ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں کہا۔ خود کہتے ہیں کہ مثنوی میں نظامی۔ غزل میں سعدی۔ مواعظ و حکمیات میں سنائی و خاقانی۔ قصائد میں کمال اسمٰعیل و رضی نیشاپوری کی تقلید کرتا ہوں۔ انکی شاعری کے خصوصیات مجملاً یہ ہیں کہ جس صنعت کا دعویٰ کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے مگر تشبیہات و استعارات جدیدہ اکثر پیدا کئے ہیں اور قدما کی طرز سے جدائی اختیار کی ہے۔ غزلگوئی میں نازک خیالی۔ واقعہ نگاری۔ واردات عشق کا ذکر سب کچھ موجود ہے بلکہ فن موسیقی میں کمال[1] ہونے کی وجہ سے تحریریں اس قدر مناسب اختیار کی ہیں کہ کلام کا اثر دو چند ہو جاتا ہے خصوصاً واقعہ نگاری تو بیحد موثر ہوتی ہے۔ اب ہم ہر صنعت کے نمونے نقل کرتے ہیں:-

قصیدے میں قوت تخیل زائد درکار ہوتی ہے اور مطالع و مخالص بالخصوص

---

[1] ایک مثنوی میں خسرو نے شہاب سے اصلاح لینے کا اقرار کیا ہے مگر یہ استاد صاحب بالکل غیر معروف ہیں اور انکے حالات کہیں نہیں مل سکے۔ [2] موسیقی میں اسقدر کمال تھا کہ ایرانی و ہندوستانی سُروں کو ملا کے متعدد دلکش راگ ایجاد کئے اور اپنے زمانے کے کمال کلاونت گوپال کو اپنے کمال کا قائل کرا دیا (دیکھو شعر العجم جلد دوم)۔

جدت ادا دیکھی جاتی ہے۔ پو پھٹنا، نسیم سحری کا چلنا فارسی میں دمیدن صبح کہلاتا ہے۔ کھلے مقامات پر اس وقت بھینی بھینی خوشبو بھی آتی ہے۔ ابھی آفتاب نکلا نہیں ہے۔ ممدوح بھی سیر دیکھ رہا ہے۔ خسرو کہتے ہیں:۔

بود پنہاں آفتاب آندم کہ صبح | ہمدمی با باد عنبر بو نمود
صبح را گفتم کہ خورشیدت کجاست | آسماں روے ملک بمن نمود

مرثیہ محمد قاآن کا نظم کیا تھا جس کا اثر بیان ہو چکا ہے۔ دیکھو اس صنعت کے خصوصیات کو کیونکر نبھا رہا ہے:۔

واقعہ است این یا بلا از آسماں آمد پدید | آفتے است این یا قیامت در جہاں آمد پدید
راہ در بنیادِ عالم داد سیلِ فتنہ را | رخنۂ کاسماں در ہندوستاں آمد پدید
مجلسِ یاراں پریشاں شد چو برگ گل ز باد | برگ ریزی گوئی اندر بوستاں آمد پدید
بسکہ آبِ چشمِ خلقے شد رواں در چار سو | پنج آبے[2] دیگر اندر مولتاں[3] آمد پدید
جمع شد سیارہ در چشم مگر طوفاں شود | چوں بہ برجِ آبی انجم را قراں[4] آمد پدید

من نخواہم جز جہاں جمعیت[5] و این کے شود
خود محال است این بنات النعش پروین کے شود

دیکھو آخری مصرع کتنا نیا ہے۔ خیال یہ ہے کہ جو گھر ماتم خانہ بن گیا وہاں محفل سرور کی امید ناممکن ہے جیسے بنات النعش کا پروین بننا محال ہے۔ بنات النعش کے سات ستارے پریشان ہیں چار نعش کی شکل میں اور تین رونے والوں کے قائمقام۔ پروین کے سات ستارے یکجا مجتمع ہیں اور خوشۂ انگور سے مشابہ ہیں۔

---

[1] خزاں۔ پت جھڑ کا موسم۔ [2] اس صوبہ میں پانچ دریا بہتے ہیں اسی سے پنجاب کہلاتا ہے۔ [3] ملتان شہر کا نام۔ [4] علم نجوم کا مسئلہ۔
[5] یعنے سلطان محمد شہید کے وقت کی چہل پہل۔

مثنویاں جن مضامین میں لکھی ہیں نہایت خوب ہیں البتہ ایک بات ہے کہ اصل واقعہ سے ہٹ کے دوسری باتیں بیان کرنے لگتے ہیں اور ان میں ذرا طول دیدیتے ہیں اس کمزوری کا خود بھی اعتراف کرتے ہیں :۔

وصف بر آنگونہ فرو راندہ ام — کز غرضِ قصہ فرو ماندہ ام

لیکن یہ بات زیادہ تر قرآن السعدین میں ہے اور مثنوی کا مضمون بھی باپ بیٹے کی لڑائی کو سراہنا جو خود لغو ہے۔ یہ بھی خسرو کا کمال تھا کہ ایسی بے سرو پا بات اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں لطف سے نظم کردی۔ دیکھو بیٹے کی زبان سے استحقاق سلطنت باپ کے مقابلے میں ثابت کرتے ہیں :۔

گر بہ گہر تاج ستانِ توام — عیب مکن گوہرِ کانِ توام

ور ہوسِ تاج ترا در سرست — من گہرم تاج مرا درخورست

اس کے بعد اُس نے اپنی شجاعت دسطوت کا ذکر کیا ہے۔ باپ کی طرف سے جواب محبت پدری میں ڈوبا ہوا جاتا ہے :۔

اے ز نسب گشتہ سزائے سریر[1] — در پسری ہیچو پدر بے نظیر

گرچہ[2] غبار ست ز کارِ توام — سرمۂ چشم است غبارِ توام

گرچہ توانم ز تو ایں پایہ بُرد — از تو ستانم بہ کہ خواہم سپرد

شکر کہ شد زندہ در ایّام تو — من ز تو و نام من از نامِ تو

پھر محبت پدری کا اظہار کیا ہے کہ جس کو پڑھ کے بیٹے کا دل بھی تڑپ گیا ہے اور دونوں باہم آکے ملے ہیں۔ مولانا شبلی کی رائے ہے کہ نظامی کے مقابلے میں مطلع الانوار میں صاف خامی نظر آتی ہے اور آئینہ اسکندری بالکل پھیکی اور

---

[1] لائق۔ [2] اگرچہ تیرے مقابلے سے میرے دل پر غبار آگیا ہے مگر چونکہ تو میرا ہی لخت جگر ہے لہذا یہ غبار بھی میرے لئے سرمۂ چشم ہے۔

کمزور ہے۔ ایک رزمیہ نظم بطور نمونہ نقل کی جاتی ہے :۔

بہ گردون شد از نای زرین خروش — بہ دریائے لشکر درافتاد جوش
ہزاہز در آمد بہ ہر دو سپاہ — ردا رو بر آمد بخورشید و ماہ
علم سر زعیوق[1] بر تر کشید — سنان چشم سیارہ بر سر کشید
غبار زمین کلہ برماہ بست — نفس را درون گلو راہ بست
چنان گشت روئے ہوا گرد ناک — کہ سیارہ گم کرد خود را بخاک

لیلیٰ مجنوں میں البتہ زور طبیعت دکھایا ہے اور بعض مقامات خوب کہے ہیں کیونکہ خود بھی عاشق مزاج ہیں اور واردات عشق کو خوب سمجھتے ہیں۔ ایک خوبی ان کی مثنویوں میں یہ بھی ہے کہ خاص چیزوں پر بھی نظمیں تیار کی ہیں مثلاً کاغذ کی تعریف۔ میوؤں کا حال۔ شراب۔ دریا۔ کشتی۔ شمع وغیرہ کا مستقل ذکر کیا ہے حالانکہ اب یہ رنگ یوروپ کے لئے مخصوص ہو گیا ہے اور ایشیا میں تقلید محض کی صورت میں جاری ہے۔

غزل کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اپنے معاصرین میں سب سے بہتر کہتے ہیں اور اسلاف کے لئے لطیف راہیں کھول گئے ہیں خصوصاً سوز و گداز تو اس قدر ہے کہ شاید و باید۔ بقول مولانا شبلی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگ سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ اس میں کبھی معشوق سے اپنا حال کہتے ہیں کبھی اپنی تصویر کھینچتے ہیں کبھی خود اپنے حال پر رحم آجاتا ہے :۔

ماجرا اے دوست پرسیدی کہ چون بگذشت حال — ای سرت گردم چہ می پرسی بدشواری گذشت
خسروا ست و شبے افسانۂ یار و ہر بار — قدرے گرید و بس بر سر افسانہ رود

---

[1] آٹھویں آسمان کے ایک ستارے کا نام ہے۔

بحر کا انتخاب کتنا اثر پیدا کر رہا ہے:-

دادمش آں بت طراز نداد | پاسخے نیز دلنواز نداد
خواب ما را ببست و باز نکرد | دل ما را ببرد و باز نداد
تو چہ دانی نیاز مندی چیست | چوں خدایت بکس نیاز نداد

جدت اسلوب اتنی شوخ ہے کہ اسکی مثال سعدی کے یہاں بھی دشواری سے ملے گی۔ خیال یہ ہے کہ معشوق کی طرف سے ظلم وستم ہوتے ہیں اور پھر بھی پیارا ہے۔ خصوصاً اگر تصوف کے رنگ میں دیکھا جائے تو بات کہاں سے کہاں جاتی ہے۔ اب ذرا تغزل کی طرز ادا کو دیکھو:-

جاں ز تن بردی و در جانی ہنوز | درد ہا دادی و درمانی ہنوز
ہر دو عالم قیمت خود گفتہ | نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

یا یہ خیال دیکھو کہ لوگ کہتے ہیں کہ تم عاشق کیوں ہوئے۔ معشوق سے کوئی نہیں کہتا کہ دلربا کیوں ہوا۔ سعدی نے یہ حالت خوب نظم کردی ہے:-

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم | باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

اگر بحر مناسب ہوتی تو اس سے بہتر شعر نظم کرنا دشوار تھا۔ خسرو کی جدت پسند طبیعت خود معشوق کو معترض قرار دیکے مناسب بحر میں اور جدید الفاظ میں اس خیال کا اعادہ کرتی ہے۔

جراحت جگر خستگاں چہ می پرسی | ز غمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

عشق مجازی کے واردات بھی بکثرت نظم کئے ہیں:-

تو شبینہ می نمائی بہ بر کہ بودی امشب | کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

محاورات بھی نہایت برجستہ نظم ہوتے ہیں:-

گفتم اے دل مرو آنجا کہ گرفتار شوی | عاقبت رفت و ہماں گفتۂ من پیش آمد

نازک خیالی اور مضمون آفرینی جو ہندوستان کے حصے میں آنے والی ہے انکے
کلام میں بخوبی موجود ہے :-

بہ خانۂ تو ہمہ روز یا مداد بود — کہ آفتاب نیارد شدن بلند آنجا
میروی و گریہ می آید مرا — ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

صنائع و بدائع کے استعمال کا بیحد شوق ہے اور جہاں سادگی کے ساتھ
آجاتے ہیں اچھے بھی ہیں مثلاً تضاد کی مثال :-

خرد سالے ببین کند بیداد — اے بزرگان شہر داد دہید
من درویش را کشتی بغمزہ — کرم کردی الٰہی زندہ باشی

لیکن تعجب ہے کہ اس فن میں کمال دکھانے کے لئے ایسے صاحب ذوق
نے اعجاز خسروی کی ایسی بیہودہ کتاب لکھ ڈالی جس میں تمام صنائع
میں طویل عبارتیں اور بکثرت اشعار ہیں اور بعض صنعتیں تو ایسی ہیں جنکا
فارسی میں آنا ہی ممکن نہیں کاش اتنا وقت کسی دوسرے کام میں صرف کیا جاتا جو
سب کے کام آتا۔ اب ہم بغرض اختصار بیان ختم کرتے ہیں۔ کامل اور پر مغز تفصیل
شعر العجم جلد دوم میں موجود ہے محض ایک امر اور لکھنا لازمی ہے کہ امیر صاحب نے
بعض محاورات ایسے بھی نظم کئے ہیں مثلاً "از گریہ تو چیزی روید" یا "آواز کردن" (پکارنا)
یا "گفتار گفتن" (یوں ہی ایک بات کہہ دینا) یا "لا کلام کردن" (ساکت کر دینا)
جن پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اہل زبان کے یہاں موجود نہیں۔ اگر یہ اعتراض
صحیح ہے تو ہمارا مدعا ثابت ہے یعنے ہندوستان کا مخصوص فارسی لٹریچر تیار
ہونا شروع ہو گیا اور علاوہ جدید تشبیہات و استعارات و عنادین و اسالیب
کے محاورات و فقرات و کنایات بھی رنگ بدل لئے گئے۔ اور جس طرح اردو شاعری
کی ابتدا میں خسرو کا نام لیا جاتا ہے۔ اس مخصوص فارسی کے لٹریچر کا آغاز بھی

انھیں کے ذات سے بکمال فخر وابستہ کرتے ہیں۔ اب ہم تصانیف کی فہرست لکھتے ہیں۔ ایک ضخیم دیوان پانچ حصوں میں ہے (۱) تحفۃ الصغر (۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس کی عمر تک کا کلام) (۲) وسط الحیات (۲۰ برس کی عمر سے ۲۴ برس کی عمر تک کی شاعری)۔ (۳) غرۃ الکمال (۳۴ برس سے ۴۳ برس تک کا کلام)۔ (۴) بقیۂ نقیہ (غالباً ۷۱۵ھ تک کا کلام) (۵) نہایۃ الکمال (۷۲۵ھ تک کے واقعات کا ذکر ہے اور یہی خسرو کا سنِ وفات ہے)۔ علاوہ اسکے قران السعدین (بغرا دکیقباد کے حال میں۔ سال تصنیف ۶۸۸ھ) مطلع الانوار (تصنیف ۶۹۸ھ بجواب مخزن الاسرار ۳۳۱۰ شعر) شیریں خسرو (تصنیف ۶۹۸ھ ۴۱۲۴ شعر)۔ ہشت بہشت (ہفت پیکر نظامی کا جواب تصنیف ۷۰۱ھ ۳۳۸۲ شعر) یہ پانچوں مثنویاں پنج گنج خسرو کہلاتی ہیں۔ علاوہ بریں تاج الفتوح (تصنیف ۶۹۰ھ جلال الدین خلجی کے حال میں)۔ نہ سپہر (تصنیف ۷۱۸ھ قطب الدین خلجی کے نام پر)۔ دول رانی و خضر خاں (دونوں کے عشق کا قصہ تصنیف ۷۱۵ھ اس میں ۲۴ شعر خود خضر خاں کے ہیں)۔ تغلق نامہ (غیاث الدین تغلق کے حالات میں)۔ افضل الفوائد (خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات)۔ اعجاز خسروی (صنائع و بدائع میں)۔ اور دولت شاہ نے دو اور کتابیں ذکر کی ہیں (۱) مناقب ہند اور (۲) تاریخ دہلی۔ انکے علاوہ ہزاروں اشعار برج بھاشا میں کہے جو نایاب ہیں اور عربی اشعار و عبارت بھی نہایت قابل قدر ہیں۔ پھر فن حساب و موسیقی پر بھی کتابیں لکھنے کا پتہ چلتا ہے۔ واقعی جامع ہو تو ایسا ہو۔

حسن دہلوی

حسن دہلوی۔ نان بائی کا پیشہ کرتے تھے۔ امیر خسرو کو پسند آگئے اور بے حد دوستی ہوگئی اور دونوں یکجان دو قالب معلوم ہونے لگے سلطان محمد قاآن

(معروف بہ خاں شہید) کے دربار میں دونوں ہمراہ تھے۔ صنف غزل پر ان کا بھی
احسان ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :۔

خلق گویند دل از صبر بجا آور باز   اے دل از صبر نشانے دہ اگر جائے ہست
ایکہ نظارۂ دیوانہ نکر دی ہر گز   قدمے رنجہ کن ایں سوئے کہ رسوائے ہست

شوخیٔ طبیعت کا انداز دیکھو :۔

دو سہ بار با تو گفتم کہ مرا ببیچ بستاں   نہ شد اتفاق شاید کہ بایں بہا گرانم

عراقی کی مشہور غزل کے جواب میں ایک شعر ملا ہے :۔

بتقوی نام نیکو بردہ بودم   نکورویاں مرا بدنام کردند

مولانا شبلی کی رائے ہے کہ "جو سوز و گداز اور جذبہ و اثر ان کے کلام میں
موجود ہے .... امیر خسرو میں بھی نہیں"

جمال الدین دہلوی بن حسام الدین نے ایک قصیدہ محمد بن تغلق شاہ
کے سامنے پڑھنا چاہا جس کا مطلع یہ تھا :۔

الٰہی تا جہاں باشد نگہدار ایں جہانباں را   محمد شاہ تغلق شاہ سلطاں بن سلطاں را

مطلع سنتے ہی بادشاہ نے قصیدہ پڑھنے سے روک دیا اور کہا کہ میں پورے
قصیدے کا صلہ نہ دے سکوں گا۔ یہ کھڑے ہوئے تھے۔ انکے گرد روپئے کے توڑے
تلے اوپر رکھے گئے۔ جب سر کے برابر پہونچ گئے تو انھیں عطا کر دئے گئے۔ افسوس ان کا
اور کلام نہ مل سکا ورنہ لکھا جاتا اور تنقید کی جاتی۔

بدر چاچ   **بدر چاچ**۔ بدر الدین نام۔ ترکستان کے مشہور شہر چاچ کا رہنے والا
جہاں کی کمانیں مشہور ہیں۔ ہندوستان میں **محمد تغلق** شاہ اور دیگر سلاطین کی مدح
میں عمر بسر کی۔ طرز شاعری بالکل نرالی ہے۔ استعارات غریبہ سے کلام کو اتنا موحش
بنا دیتا ہے کہ بعض وقت سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ تخیل بھی بالکل عجیب ہے۔

غرابے کز دہن انداخت دوش آن بیضہا از زر — ربودش از قضا ناگہ عقابِ آتشیں پیکر
رات — تارے — آفتاب

اسی طرح زہدیات میں کہتا ہے :۔

زریں نقاب شاہد پیروزہ پیرہن — برداشت تار زلف سیہ از رخ سمن
بے مہر شاہدیکہ روان شد بہ گرد خاک — شمشیر تیز در کف و بر فرق سر لگن
گر صادقی تو عشوۂ ایں قرصِ خور مخور — در مرورہ روی دم ایں ن گر مزن

خور کے لئے مخور اور زن کے لئے مزن محض لفاظی ہے ۔ یہ مذاق نہ کبھی مقبول ہوا۔ نہ ہو سکتا ہے ۔ بعض شعر بالکل چیستان ہیں مثلاً :۔

برگیر یکے را بدو در چار دو یکے کن — کز نہ نود ش جانب دو چل گذرا قند[1]

---

[1] معنی یہ ہیں کہ مے کو جام میں ڈال تاکہ پانچوں انگلیاں دونوں لبوں تک پہونچیں ۔ حل یوں ہو سکتا ہے کہ لفظ یکے کے عدد (۴۰) ہیں اور حرف م کے عدد بھی (۴۰) ہیں لہذا یکے سے مراد حرف م ہے۔ اسی طرح لفظ "دو" کے عدد (۱۰) ہیں اور حرف ی کے عدد بھی (۱۰) ہیں لہذا دو سے مراد ہے حرف ی (یکے + دو = م + ی = مے) لہذا یکے را بدو کے معنی ہیں "مے"۔ دوسرے جزو کا حل یہ ہے کہ چار (۴) عدد ہیں لفظ جا کے اور یکے سے مراد ہے حرف م حسب صراحت بالا۔ لہذا چار دو یکے سے مراد ہے "جام" اور "در چار دو یکے کن" کے معنی ہیں "در جام کن"۔ دوسرا مصرعہ یوں حل ہوگا کہ لفظ "نہ" کے عدد ہیں (۵۵) اور لفظ "پنج" کے عدد بھی (۵۵) ہیں لہذا "نہ" سے مراد ہے "پنج" اور لفظ "نود" کے عدد ہیں (۶۰) اور لفظ "پنجہ" کے عدد بھی (۶۰) ہیں لہذا "نود" سے مراد "پنجہ" ہے اور "پنجہ" کے معنی ہیں پچاس جو حرف ن کے عدد ہیں لہذا نود سے مراد حرف "ن" ہے جس کا تلفظ "نون" ہے اور نون عربی میں مچھلی کو کہتے ہیں جو انگلی سے مشابہ ہے لہذا "نود" سے مراد انگلی ہے اور "نہ نود" سے مراد پانچ انگلیاں ۔ لفظ "لب" میں ل کے عدد (۳۰) ہیں اور "ب" کے (۲) اور لفظ "دو" کے عدد (۱۰) ہیں لہذا "ب" قائم مقام (۱۰) کے ہے لہذا "لب" قائم مقام (۴۰) کے یعنی چہل یا چل لہذا "دو چل" سے مراد "دو لب" ہے ۔ فتدبر۔

مظہر گجراتی کو صاحب مجمع الفصحا شیریں زبان اور نیکو بیان سمجھتے ہیں۔ واقعی کلام نہایت صاف ہے اور آجکل کے ایرانی مذاق سے ملتا جلتا ہے:۔ مظہر گجراتی

اگر بہار بدلیست وگر بہشت بکار — بہار من رخ تست و بہشت من دیدار
مرا چو بوے تو یابم بہار نبود دوست — مرا چو روے تو بینم بہشت ناید کار
اگر بہار گل و سرو و یاسمن دارد — تو یاسمن بری و سرو قد و گل رخسار
خنک کسیکہ نہد بخت نیک در برِ او — ز روے و موے تو ماہِ منیر و مشک تتار

ان شاعروں کے عروج کی خاص وجہ یہ ہے کہ سلاطین و امرا بھی سخنگو اور سخن سنج ہوتے تھے چنانچہ دورۂ مغلیہ قائم ہونے سے پیشتر ہندوستان کے اس طبقے میں نظم و نثر کا چرچا کافی طور سے تھا۔ محمد تغلق۔ فیروز شاہ بہمنی۔ یوسف عادل شاہ۔ سلاطین شرقیہ جونپور وغیرہ شعر کہتے تھے اور بعض نے کتابیں بھی لکھی تھیں۔ چنانچہ بعض سلاطین کے اشعار لکھے جاتے ہیں:۔

فیروز شاہ بہمنی (المتوفی ۸۲۵ھ):۔ فیروز شاہ بہمنی

در آتشِ مردہ فکر زائل نکنی — اندیشہ بہر خیال ہائل نکنی
ایں نقد خزینۂ دماغ است بگوش — تا صرف بجنسہاے باطل نکنی

ہولناک ۱۲

یوسف عادل شاہ عثمانی خاندان کا ترک تھا سلطان مراد کے بعد بلادِ روم سے بھاگ کے ہندوستان آیا اور بہمنیوں کا اثر مٹا کے سلطنت عادل شاہی بیجاپور میں قائم کی اور وہیں ۹۱۶ھ میں انتقال کیا۔ ایک شعر اسکا اسوقت یاد ہے:۔ یوسف عادل شاہ

مرا ز بادہ بجائے فراغ یعنے چہ — سبو سبو دہ و خم خم۔ ایاغ یعنے چہ

اسمٰعیل عادل شاہ کا تخلص وفائی تھا اور یوسف عادل شاہ کی طرح یہ بھی شاعر تھا۔ سال وفات ۹۴۱ھ۔ اسمٰعیل عادل شاہ

نظام شاہ بانی نظام شاہیۂ دکن بحری تخلص کرتا تھا۔ رنگ طبیعت نظام شاہ

ملاحظہ ہو:۔

غالت خلیل و چہرہ گلستان آتش است — خطت سیاہ ئی کہ بدامان آتش است
پیش رخ تو دیدہ پسیھری بہم نزد — آتش پرست ہیں کہ چہ حیران آتش است

بابر بادشاہ — بابر نے سلطنت مغلیہ (تیموریہ ہند) کا بنیادی پتھر ہندوستان میں رکھا اور شعر و شاعری کا مذاق ساتھ لایا۔ علاوہ بابر نامہ کے جو ترکی میں لکھا تھا بعض اشعار بھی مشہور ہیں۔ ایک شعر یاد ہے:۔

نوروز و نو بہار و می و دلبرے خوش است — بابر بعیش کوش کہ دنیا دوبارہ نیست

ہمایوں — ہمایوں کی مصیبت کی داستان صفحات تاریخ کو آجتک حسرت ناک بنائے ہے۔ جب شیر شاہ سے شکست کھا کے بھاگا تو شاہ طہماسپ صفوی کو یہ شعر لکھ کے بھیجے:۔

خسروا عمر یست تا عنقائے عالی ہمتم — قلۂ قاف قناعت را نشیمن کردہ است
روزگار سفلہ گندم نمائے جو فروش — طوطئی طبع مرا قانع بارزن کردہ است
دشمنم شیر است دعمرے پشت برمن کردہ بود — حالیا از روئے خصمی روئے برمن کردہ است[1]
دارہم از شہ التماس اکنوں کہ نا امن کند — آنچہ با سلمان علیؑ در دشت ارزن کردہ است

ایک رباعی اور یاد ہے جو اسی شاہ طہماسپ کو لکھی تھی:۔

گشتیم بجاں بندۂ اولاد علیؑ — ہستیم ہمیشہ شاد با یادِ علیؑ
چوں سرِّ ولایت از علیؑ ظاہر شد — کردیم ہمیشہ وردِ خود نادِ علیؑ[2]

---

[1] مشہور ہے کہ سلمان فارسی پر دشت ارزن میں ایک شیر نے حملہ کیا تھا اور امیر المؤمنین علیہ السلام نے انکو بچایا تھا اور شیر کو قتل کیا تھا۔ صفویہ چونکہ سادات تھے اور ہمایوں تاتاری تھا لہذا یہ التماس نہایت پرلطف ہے۔

[2] لفظی معنی ہیں "پکار علیؑ کو"۔ کتب معتبرہ میں ہے کہ رسول مقبولؐ کو حکم الٰہی ایک جنگ میں ہوا تھا کہ علیؑ کو مدد کے لئے پکارو اور الفاظ روایت یہ ہیں "نادِ علیاً مظہر العجائب تجدہ عوناً لک فی النوائب کل ہم و غم سینجلی بولایتک یا علی یا علی یا علی"۔ ارباب عقیدت اسے آجتک مصیبت میں پڑھتے ہیں اور خدا سے کشائش طلب کرتے ہیں۔

اکبر اعظم کا عہد عروج انشائے عجم کا زمانہ تھا۔ دربار اہل کمال سے مملو تھا اور عربی۔ فارسی۔ سنسکرت۔ برج بھاشا۔ لاطینی۔ یونانی وغیرہ کے بہترین علما اقطار عالم سے سمٹ کے آگئے تھے۔ خود بھی اگرچہ جاہل تھا لیکن شعر سے مناسبت رکھتا تھا۔ ایک رباعی اسکی بھی درج کی جاتی ہے:۔ اکبر اعظم

دوشینہ بکوے میفروشاں — پیمانۂ مے بہ زر خریدم

اکنوں ز خمار سر گرانم — زر دادم و دردِ سر خریدم

دیکھو مشہور محاورہ کتنا بے تکلف اور خوبصورت نظم ہو گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع کے لئے ایجاد ہوا تھا۔ اُدھر ایران میں شاہ عباس تربیت اہل علم کر رہا تھا اِدھر اکبر اور مقابلے میں اکبر ہی غالب آتا تھا۔ آپس میں نوک جھونک بھی رہتی تھی۔ کسی شاعر نے شاہ عباس کی تعریف میں کہا:۔

زنگی بسنان و تیر و خنجر نازد — رومی بسپاہ و خیل و لشکر نازد

اکبر بخزینۂ پُر از زر نازد — عباس بہ ذوالفقار حیدرؑ نازد

فیضی نے اکبر کی طرف سے جواب دیا:۔

فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد — دریا بہ گہر۔ فلک بہ اختر نازد

عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد — کونین بذات پاک اکبر نازد

اکبر پر آفتاب پرستی کا الزام لگایا گیا کیونکہ دین الٰہی میں آفتاب کی خاص عظمت ملحوظ تھی۔ کسی شاعر نے اسکی تخیلی وجہ بھی خوب نظم کی:۔

قسمت نگر کہ در تو ہر جو ہرے علامت — آئینہ با سکندر و با اکبر آفتاب

او میکند معائنۂ خود در آئینہ — ایں میکند مشاہدۂ حق در آفتاب

بیرم خان خانخاناں اسی دربار کا درۃ التاج تھا اور تربیت اہل کمال کا دل دادہ۔ اس کے قصائد و غزلیات کا دیوان مشہور ہے۔ ایک مطلع امیر المومنین بیرم خاں

علیہ السلام کی تعریف اس وقت یاد ہے جس سے قوت شاعری کا کسی قدر اندازہ ہوجاتا ہے :۔

شہے کہ بگذرد از نہ سپہر افسر او | اگر غلام علیؑ نیست خاک بر سر او

عبدالرحیم خانخاناں — رحیمی عبدالرحیم خانخاناں کا تخلص تھا جس کا دور بیرم خاں کی معزولی کے بعد شروع ہوا۔ یہ شاعری سے مناسبت فطری لئے آیا تھا اور قدردانی اہل کمال میں سلاطین وقت سے بڑھا ہوا تھا۔ بہار تر کمالوں کا یادگار ہندوستان میں آکے ممدوح[1] شعرا اور محسود امرا ہو جائے تفضل خدا انہیں تو کیا ہے۔ احمد آباد میں ایک عظیم الشان کتبخانہ اور لٹریچر میں بیش بہا اضافے آجتک یادگار ہیں۔ چند منتخب اشعار غزلوں کے لکھے جاتے ہیں۔ دیکھو کلام میں کتنا مزا ہے :۔

بحرم عشق توام میکشند و غوغا ئیست | تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

غمت مباد اچہ می پرسی از حکایت من | دل تو طاقت ایں گفتگو کجا دارد

"غمت مباد" اخدا تجھے کوئی غم نہ دے! کتنی محبت بھری دعا ہے۔ اس کی لذت اہل ذوق سمجھ سکتے ہیں۔ ایک اور تصویر دیکھو۔ معشوق کی نظر تڑپتے ہوئے عاشق پر پڑ جانا مآل زندگی ہے بلکہ کل محنتیں سوارت ہیں :۔

بہائے خون من و صد ہزار بچہ من است | کہ من بخون طپیم و قاتلم نظارہ کند

اور "صد ہزار ہمچو من است" کا لطف تو بیان ہی نہیں ہو سکتا۔ اللہ رے محبوب کی عظمت اور شان بے نیازی!

حکیم ابوالفتح — حکیم ابوالفتح گیلانی (المتوفی ۹۹۷ھ) بھی خانخاناں کی طرح شعرا کا گروہ قائم کئے ہوئے تھا اور علما و فضلا کی تربیت میں مصروف تھا۔ عرفی اور حیاتی گویا اسی کے ساختہ و پرداختہ تھے اور جدید رنگ جو ہندوستان میں فارسی شعرا

---

[1] از مجمع الفصحا۔

کے لئے مخصوص ہوگیا اسی کا پھیلایا ہوا ہے ۔ نثر میں سادگی کو ترجیح اسی نے دی اور رقعات چار باغ مصنفین عصر میں اس رنگ کے پھیلانے کا باعث ہوئے ۔

خان زماں — **خان زماں** بھی امرائے دربار اکبری سے تھا اور تربیت اہل علم میں کسی سے پایہ کی کا نہ رکھتا تھا خود بھی شعر کہتا تھا اور سلطان تخلص تھا ۔ غزالی کو دکن سے یہ رباعی لکھ کے اور ہزار روپیہ زاد راہ بھجوا کے اسی نے بلایا تھا :۔

اے غزالی بحق شاہ نجف ‏ ‏ ‏ ‏ کہ سوے بندگان بیچوں آئے
چونکہ بے قدر گشتۂ آنجا ‏ ‏ ‏ ‏ سر خود را بگیر و بیروں آئے

"سر خود را بگیر" کے معنے ہیں کہ "فوراً چلا آ" نیز ہزار روپیہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اسے لے لے کیونکہ غزالی کا سر یعنے پہلا حرف "غ" ہے جس کے عدد ہزار ہیں ۔ غزالی نے یہاں آ کے مثنوی نقش بدیع نظم کی اور فی شعر ایک اشرفی صلہ میں لی ۔ الفتی یزدی بھی اسی کا ملازم تھا اور انعام و اکرام پاتا رہتا تھا ۔

خان اعظم — **خان اعظم** عزیز مرزا کو کلتاش ہفت ہزاری اکبر کا برادر رضاعی تھا اور فن تاریخ اور سخن سنجی میں ید طولے رکھتا تھا ۔ ایک مطلع اس کا بھی یادگار ہے :۔

گشت بیمار دل از رنج غم تنہائی ‏ ‏ ‏ ‏ اے طبیب دل بیمار چہ می فرمائی

یہاں بھی نکتہ سنجوں کا مجمع رہتا تھا ۔ بدخشی و تقیمی وغیرہ اسی دربار کے متوسلین میں سے ہیں بلکہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ فیضی اور ابوالفضل اسی کی سفارش سے داخل دربار ہوئے ۔

اب ہم دربار اکبری کے مخصوص اہل کمال کا حال درج کرتے ہیں ۔ تفصیل انشاء اللہ آئندہ علیحدہ کتاب میں دیکھائیگی کیونکہ ہندوستان میں جو کچھ فارسی لٹریچر میں شائع ہوا ہے اُس کی مستقل تاریخ لکھنے کا ارادہ ہے ۔

فیضی

فیضی فیاضی یمن الاصل تھا۔ اسکے دادا ناگور میں آئے اور ایک عربی النسل خاندان میں شادی کی جس سے شیخ مبارک پیدا ہوئے۔ فیضی ان کا بڑا بیٹا ہے (ولادت سنہ ۹۵۴ھ) باپ خود صاحب کمال تھے اور چار جلدیں تفسیر قرآن کی تفسیر کبیر کے انداز پر لکھی تھیں جس کا نام منبع العیون ہے۔ بیٹا بھی کمالات میں باپ سے کم نہ نکلا اور علوم متداولہ میں دستگاہ کامل پیدا کی۔ فن شعر بظاہر خواجہ حسین مروی[1] سے سیکھا تھا۔ ابتدائی زمانہ اپنے والد اور دونوں بھائیوں ابوالفضل اور ابوالخیر کے ساتھ نہایت صعوبت میں گذرا۔ ان لوگوں پر کبھی مہدوی ہونے کا الزام تھا کبھی شیعہ ہونے کا۔ عبدالنبی اور مخدوم الملک اپنے تعصب مذہبی کی وجہ سے انھیں بےحد ستاتے رہے[2]۔ آخر شیخ مبارک کا کمال باثر ہوا اور چند امرائے دولت اس خاندان کے طرفدار ہو گئے۔ بادشاہ سے سفارش کی اور سنہ ۹۷۴ھ میں بڑے احترام سے شیخ مبارک اور فیضی کو ہمراہ دربار بلایا۔ جس سے اور رفتہ رفتہ اتنا رسوخ ہو گیا کہ دونوں متعصب دشمنوں کو پست کر دیا۔ فیضی کو طبابت اور شاعری کا شوق تھا اور علمی مشاغل کی وجہ سے کوئی سرکاری کام لینا نہیں چاہتا تھا مگر پھر بھی بچ نہ سکا۔ شہزادہ دانیال کا معلم ہوا۔ پھر آگرہ۔ کالنجر، کالپی کا صدر رہا۔ سنہ ۹۹۶ھ میں ملک الشعرا کا خطاب پایا۔ عجب اتفاق تھا کہ خطاب ملنے سے دو چار دن پیشتر کہہ چکا تھا:-

آں روز کہ فیض عام کردند ما را ملک الکلام کردند
از بہر صحیفۂ سپید سخن آرایش ہفت بام کردند
ما را بتمام در ربودند تا کار سخن تمام کردند

---

[1] علاء الدین سمنانی کے خاندان سے تھے۔ معقولات مولانا عصام سے اور منقولات علامہ ابن حجر مکی سے پڑھے تھے۔ اکبر کے حکم سے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ نظم کرنا شروع کیا تھا۔ سنہ ۹۷۹ھ میں انتقال ہو گیا۔ [2] تفصیل کے لئے شعر العجم جلد سوم دیکھو۔

ایک سال بعد بادشاہ کے ہمراہ کشمیر گیا اور قصیدۂ کشمیر نظم کیا جسکا مطلع یہ ہے :-

ہزار قافلۂ شوق میکند شبگیر — کہ بار عیش کشاید بخطۂ کشمیر

۹۹۹ھ میں ممالک دکن کی طرف بطور سفارت گیا اور اپنے خدمات نہایت قابلیت سے انجام دیئے۔ ۱۰۰۱ھ میں واپس آیا اور بادشاہ کے اصرار سے خمسۂ نظامی کا جواب نظم کرنا شروع کیا چنانچہ خود کہتا ہے :-

"اسامی کتب خمسہ این است اول مرکز ادوار کہ اکثرے در فتحپور گفتہ شد۔ دوم سلیمان و بلقیس کہ پیش ازیں ہفت سال در لاہور بنیاد کردہ بود۔ سوم نل دمن کہ تمام شد۔ چہارم ہفت کشور کہ در احوال ہفت اقلیم گفتہ خواہد شد۔ پنجم اکبر نامہ کہ آں ہم جستہ جستہ وقتے گفتہ بود"۔

ان میں سے دو کتابیں نل دمن اور مرکز ادوار تمام ہو گئیں اور ابوالفضل کا دعویٰ ہے کہ سب پوری ہو گئیں۔ علاوہ بریں عربی میں سواطع الالہام قرآن مجید کی بے نقط تفسیر لکھی۔ انشائے فیضی کو اسکے بھانجے نورالدین محمد عبداللہ نے جمع کیا اور لطیفۂ فیضی نام رکھا۔ ایک دیوان غزلیات وغیرہ کا طباشیر الصبح نام چھوڑا اور ایک دیوان غیر مکمل۔ مقاصد الشعراء تذکرۂ شعراء میں لکھنا شروع کیا تھا معلوم نہیں کہ کیا انجام ہوا۔ مہابھارت[1] کے دو فن فارسی میں ترجمہ کئے لیلاوتی حساب میں ہے۔ اس کا ترجمہ بھی فارسی میں کیا۔ اسکے علاوہ اور کتابیں بھی تصنیف کی ہیں جن کی تفصیل نہیں معلوم۔ صاحب مآثر الامراء نے تعداد تصنیفات ایک سو ایک لکھی ہے۔

---

[1] رامائن کا ترجمہ جو فیضی کی طرف منسوب ہے مولانا شبلی کے نزدیک بدایونی نے نثر میں ترجمہ کیا اور مسیحائی پانی پتی نے بعد کو اسے نظم کر ڈالا تھا

غرض یہ صاحب کمال ضیق النفس میں مبتلا ہوا جیسا کہ خود کہتا ہے :۔

دیدی کہ فلک بمن چہ نیرنگی کرد — مرغ دلم از قفس شب آہنگی کرد
آں سینہ کہ عالمے در و می گنجید — تا نیم نفس بر آورم تنگی کرد

بیماری روزانہ بڑھنے لگی اور فیضی کو زندگی سے مایوسی ہو گئی۔ کہا کرتا تھا :۔

گر ہمہ عالم بہم آید بتنگ — لنگ نشود پائے یکے مور لنگ

آخر صفر ۱۰۰۴ھ میں انتقال کر گیا۔ تخلص اس کا فیضی بھی تھا اور فیاضی بھی چنانچہ خود کہہ گیا ہے :۔

زیں پیش کہ سکہ ام سخن بود — **فیضی** رقم نگیں من بود

اکنوں کہ شدم بعشق مرتاض — **فیاضی** ام از محیط فیاض

فیضی ایک عالم آدمی تھا اور عالمانہ زندگی بھی بسر کرتا تھا۔ عبدالقادر بدایونی کو اس سے بیحد عداوت تھی مگر فضل و کمال کا قائل تھا۔ لکھتا ہے کہ فیضی

"در فنون جزئیہ از شعر و معما و عروض و قافیہ و تاریخ و لغت و طب و انشا عدیل در روزگار نداشت"

نثر میں سادہ نویسی مرغوب تھی اور مطالب کو تکلفات و تصنیفات کے پھندے میں نہیں پھنساتا تھا۔ نظم میں قوت خداداد تھی خصوصاً غزلیں اور مثنویاں جواب تصنیف کی ہیں نل دمن کے بارے میں بدایونی کی رائے باوجود مخالفت و عصبیت کے یہ ہے :۔

"[illegible] مثنوی است کہ دریں سہ صد سال مثل آں بعد از امیر خسرو شاید در ہند کسے دیگر نگفتہ باشد"

فخریہ عشقیہ اور فلسفیہ مضامین جس جوش میں نظم کرتا ہے وہ اُسی کے لئے مخصوص ہے۔[1]
نل دمن میں جس شان کا فخریہ لکھا ہے۔ مشکل سے وہ انداز بیان اور شکوہ و دبدبہ
دوسرے مقام پر ملے گا۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں :۔

امروز نہ شاعرم حکیمم — دانندۂ حادث و قدیمم
ہر موی زمن تمام گوش است — خاموشی من بصد خروش است
تا تازہ و تر زنم رقم را — در بادہ کشیدہ ام قلم را
ایں شیشہ نہادہ ام برآں طاق — کانجا نرسیدہ دست عشاق
ایں بادہ کہ جوش شد ازو یاغم — تو نیست چکیدہ از دماغم
صد دیدہ بورطۂ دل افتاد — کین موج گہر بہ ساحل افتاد

اسی زور میں پورے چار ہزار شعر کی مثنوی کہی ہے اور ہر مقام پر ایک ہی جوش اور
سرشاری ہے۔ عشق کی بیماری کا علاج کرنے ایک شخص آیا ہے۔ مریض کہتا ہے :۔

نشتر چہ زنی رگ جنون را — آگاہ نۂ تپ درون را

یہ معلوم ہوتا ہے کہ طبیب کی تشخیص اگر باطل کر سکتا ہے تو مریض عشق اور وہ بھی بدلیل۔
عشق کے وادی میں دورۂ صفویہ کے شعراسے اس کا رنگ بالکل جدا ہے۔ یہاں
پاکبازی کے جوہر ہیں اور حُسنِ ازل کے ساتھ روابط۔ یہ تغزل درحقیقت تصوف

---

[1] خسرو اور فیضی دو ہی شخص ہندوستانی ایسے نظر آتے ہیں جن کے کمال کا اعتراف
ایرانیوں نے بھی کیا ہے۔ صائب کہتا ہے ؎

ایں آں غزل کہ فیضی شیریں کلام گفت — در دیدہ ام خلیدہ و دردل نشستہ است

علی نقی کمرہ کہتا ہے :۔

مرا افگند بر نظم اسورم پرتو فیضی — ابو الفیض آں گزین اکبر و شیخ کبیر من
اگر ہستم مجیر اندر سخن او ہست خاقانی — و گر من مجیر آستانش او مجیر من
کی ام باد ارسد در شاعری دعوے ہم چشمی — کہ در ایں خانقاہم من مرید و اوست پیر من

اور فلسفہ کا مجموعہ ہے اور ہر دور کلام متقدمین سے زائد۔ مثلاً منزل تسلیم میں آکے شکوہ و شکایت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور مصائب یہ سمجھ کے جھیلے جاتے ہیں کہ ہماری ترقی مدارج کا انحصار امتحانات پر منحصر ہے مصیبت اور رحمت وہ آگ ہے جو نفس انسانی کو تپا کے طلائے خالص بنا دے گی۔ یہ مصائب خود خدا کے پاک نے ہمارے استغنا کے لئے نازل کئے ہیں۔ یہ مصیبت نہیں بلکہ عین رحمت ہے۔ دیکھو کس شان سے کہتا ہے:-

رحمت شاہ دو جہاں ... | ... ید اللہ ...
خدا کے ہاتھ سے ...

ایک اور غزل میں کہتا ہے:-

عشق ... | ... رگ و ریشۂ ما
از ... | ... نیستۂ ما

دیکھو دنیا ... کی کیفیت کا انجام کیا ہے کہ تمام نفس اتفاقی ہے شکوہ نظم اور سلاست زبان ... آپ کو اپنے آغوش ... لئے ہوئے ہے کہ شاید دوسری حیثیت ... بدل جائے ... ملاحظہ ہو:-

عجب تر از دل ... ندیدہ ایم ... | کہ ہم ... ہم خود اصل

مصائب عشق کا فلسفہ بیان کرتا ہے کہ یہ درد خود مصیبت نہیں ہے اور اسی کے توسط سے جو بلائیں آتی ہیں وہ ... عاشق پر ... ہوتی ہیں اور دوسری ... انکا تعلق پست ہو جاتا ہے لہذا عاشق صادق کا ادھر خیال ہی نہ جانا چاہیے:-

... | ... است این کہ ہم ز تو خیزد بلائے تو

پابند ... کا تصفیہ کرتا ہے تو خود عشق سے مدد کا جویا ہوتا ہے اور اسی کی برکات روحانی ... سے فیض پاتا ہے:-

اے عشق ... | ... تسلیم کبریا ...

چند شعراء مختلف مضامین کے سنو اور غور کرو کہ اس کی طبیعت کتنی جدت آفرین ہے۔ دوسرے بھی عشق از دل بر دلِ معشوق پیدا میشود کہہ چکے ہیں اور رسم پرستی کو منع کر چکے ہیں:-

گر نہ لیلی ہوس ہمرہی مجنوں داشت ناقہ را بہر چہ در راہ گرانبار چہ کرد
آنکہ می کرد مرا منع پرستیدن بت در حرم رفتہ طواف در و دیوار چہ کرد
عشق صبر و خرد و ہوش ز فیضی بربود تو ندیدی کہ بآں قافلہ سالار چہ کرد

ہوس پرستی کا رنگ اسکے یہاں ڈھونڈھنا۔ یہ عالم حقیقت میں سراسیمہ پھر رہا ہے اور مجازات سے کوسوں دور پہونچ گیا ہے۔ یاں کیفیات عالم فانی بھی کبھی بیان کر دیتا ہے اور لطافت ادا کو باقی رکھتا ہے بلکہ نیچرل مضامین کو خوش سلیقگی کی وجہ سے وہی جامہ پہناتا ہے جو نیچر کے موافق ہے۔ احمد آباد کے حالات نظم کئے ہیں:-

منم کہ کشتہ گجراتیان بیدادم خراب شیوہ خوبان احمد آبادم
سہی قدیست نہ نازِ جلوہ نمود کہ چشم سایہ پرستان آن نہادم
بہر طرف کہ نہ امید سرو آزادے غلام او شدم و خط بندگی دادم
چو رشک گلشن فردوس احمد آباد است ازو مباد برون گشتہ چون آدم

مرثیہ کا رنگ بھی مذاق سلیم کے موافق ہے۔ اپنے تین برس کے بچے پر بین کرتا ہے:-

اے روشنی دیدہ روشن نگہ تو من بے تو تیرہ روز تو بے من چگونہ
ماتم سرا است خانہ من در فراق تو تو در مغاک ساختہ مسکن چگونہ
بر خار و خس کہ بستر و بالین تو است اے یاسمین عذار و سمن تن چگونہ

فیضی کے کلام میں خسرو کی طرح سے مخصوص محاورات و خیالات پائے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی لٹریچر ہندوستان کے ماحول میں اپنے ارتقا کے راستے پیدا کر کے دوسری صورت حاصل کرنے والا ہے۔

عرفی جمال الدین سید محمد بن زید بن الدین علوی۔ شیراز سے سیدھا **فیضی** کے
پاس آیا اور رہنے سہنے لگا۔ پھر کچھ ناراض ہوگیا اور حکیم **ابوالفتح گیلانی** سے دوستی پیدا کی
اور علمی مباحثات کا یہ اثر ہوا کہ خوش گوئی اور خوش فکری میں روز بروز ترقی کرنے لگا۔ **ابوالفتح**
کے انتقال کے بعد **خانخاناں** کی صحبت میں داخل ہوا اور بڑے بڑے انعام حاصل کئے
مگر طبیعت میں خودداری اس قدر تھی کہ بیجا خوشامد اور چاپلوسی سے کراہت کرتا تھا۔
صاحب **مآثر رحیمی** لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کے درباروں میں تسلیم و کورنش وغیرہ کا طریقہ
جاری ہے اور ہر شخص پر اُس کی پابندی لازم ہے مگر عرفی نے کبھی اس کا خیال نہ کیا۔
جس طرح جی چاہا محفل امرا میں گیا اور سب نے اُس کی خاطر کی"۔ شہزادہ **سلیم** سے
بیحد محبت تھی مگر جب کوئی قصیدہ اُسکی بلکہ **اکبر** کی تعریف میں نظم کیا تو اپنی تعریف
کے اشعار بھی شامل کردئے تاکہ فی الجملہ مساوات قائم رہے۔ اگر کبھی کچھ **ابوالفتح** یا
خانخاناں سے طلب کیا تو یہ کہہ کے کہ صلۂ دوستی طلب کرتا ہوں نہ کہ صلۂ شعر۔ یہی وجہ
ہے کہ سوائے ان دو ممدوحوں کے یا چند قصائد جہانگیر و اکبر کی تعریف میں نظم کئے ہیں
یا بزرگانِ دین کی تعریف میں۔ **جہانگیر** سے محبت کا شہرہ اس قدر ہوا کہ سنہ ۹۹۹ھ
میں حاسدوں نے زہر دیکے اس کی زندگی کا خاتمہ کردیا اور زیادہ سے زیادہ ۳۶ برس
کی عمر پاکے لاہور میں پیوندِ خاک ہوگیا۔ چند روز بعد ایک فقیر قبرستان میں آکے اسکی
ہڈیاں اپنے بھائی کے دھوکے میں نکال لے گیا اور نجف میں دفن کردیا۔ عرفی نے
ایک قصیدے میں امیر المومنین علیہ السلام سے عرض کیا تھا :۔

بکاوشِ مژہ از گور تا نجف بروم — اگر بہند ہلاکم کنی وگر بہ تتار

عجب اتفاق ہے کہ ہند میں انتقال ہوا اور قبر سے ہڈیاں نکل کے نجف گئیں۔
اسی خلوص اور حُسن اعتقاد پر نظر رکھ کے مُلّا **رونقی ہمدانی** نے اس واقعے
کی تاریخ نظم کی جس میں اس شعر کی طرف بھی اشارہ ہے :۔

یگانہ گوہر دریاے معرفت عرفی — کہ آسماں پئے پرورِ دنش صدف آمد
بکاوشِ مژہ از گور تا نجف بروم — زدہ است تیرِ دعائے کہ بر ہدف آمد
رقم زدا زپئے تاریخ روئقی کلکم — بکاوشِ مژہ از گور تا نجف آمد
۹۹۹ھ

فن شعر کے متعلق عرفی کے حاسدوں کی کوئی انتہا نہیں۔ صاحبِ آتشکدہ اگرچہ ناراض ہیں مگر اتنا ضرور کہتے ہیں کہ

"الحق در مراتب کمالات گوے سبقت از معاصرین ربودہ . . .
در قصیدہ ہر چند طریقۂ تازہ کہ خارج از طریقۂ شعراے سابق بودہ
اختیار کردہ واقعاً بسیار خیالات خوب وعبارات مطلوب دارد"

ایک اور صاحب مثنوی اور قصیدے میں گرائے دیتے ہیں اور غزل میں استاد مانتے ہیں :-

عرفی مادر غزل استاد بود — خانہ خراب ودہ اش آباد بود
(قصیدہ / غزل)
مثنویش رنگ فصاحت نداشت — کاں نمک بود و ملاحت نداشت

صاحبِ مجمع الفصحا نے بالکل متروک کردیا کہ "سیاقِ اشعارش پسند ایں عہد نیست"
لیکن قبول عام ایسی چیز ہے کہ بدایونی ایسے دشمن نے بھی اعتراف کیا ہے کہ
"اس کا کلام گلی گلی اور کوچے کوچے میں کتب فروش بیچتے پھرتے
ہیں اور اہل عراق وہند تبرکاً لیتے ہیں"

مخالفین میں ابوالفضل کی تنقید پر مغز ہے اور ہر فقرہ غور کے قابل ہے :-
"شائستگی از ناصیۂ گفتار او می تابد و فیض پذیری از سخن او ہویدا۔
از کوتاہ بینی در خود نگریست۔ بر باستانیاں زبانِ طنز کشود۔ غنچۂ
استعداد او نشگفتہ پژمرد"

ممکن ہے کہ عرفی کی جوانا مرگی ۔۔۔ نے اُس حد تک کامل الاستعداد ہونے دیا ہو

جو ابوالفضل کو مطلوب ہے۔ اور بعض مخالفین کے خیال کے موافق "استعارہ خنک"
کا عیب بھی باقی رہ گیا ہے لیکن ذوقِ فطری اور قوتِ خداداد نے جو معراج اس
دور کے شعرا میں اسکے کلام کو دی ہے شاید دوسرے کو نصیب نہ ہو سکی۔
استعارات و تشبیہات جدید بکثرت پیدا کیے جن سے زبان کو وسعت ہوئی
اور اسکے مخصوص فلسفیانہ خیالات کے ادا کرنے کے قابل ہوئی۔ مثلاً ایک قصیدہ
نعتیہ میں نعمتوں کو خضر کہا ہے۔ یہ تشبیہ "خنک" سمجھی گئی ہے اور ہو بھی سکتی
ہے لیکن تدبر کیجئے تو یہ خطا [illegible] کے لئے اظہار کافی نہیں ہے۔ رسول اللہ صلعم سے
مخاطب ہو کے کہتا ہے۔

[illegible] است کہ بہ ظلمات نگشتایم   اے آب حیات از لب تو خضر انعم را

مطلب یہ ہے کہ خضر کو گناہ بخشنا چاہیں اور گناہ "ہلاکت معنوی" ہے۔ یہ جتانا ہے
کہ رسول اللہ صلعم کی برکت سے حیات ابدی ملجائے مگر گناہوں کی زیادتی دیکھ
کر [illegible] شرمندہ ہونا چاہئے کہ [illegible] سے بھی تدبیر نہیں ہو سکتا [illegible] فقیر کا
[illegible] کہ ممدوح تیری بارگاہ ایسی جانبخش ہے کہ
نعمتوں سے ہدایت و رسالت حیات ابدی حاصل کرنے کے لئے تیرے لبوں
تک آتی ہیں اور یہ ادعا صحیح بھی ہے کیونکہ آپ خاتم الانبیاء تھے اور آپکی شریعت
ابدالآباد تک رہنے والی ہے۔ اب اس سے بہتر تشبیہ کیا ہو سکتی ہے کہ خضر نے
باوجود قوت نبوت و ولایت آب حیات کو پیا اور حیات جاوید حاصل کی مگر
شریعت کی حیات جاوید وہاں بھی نہ ملی۔ یہ اسوقت نصیب ہوئی جب تیرے
لبوں سے احکام الٰہی جاری ہوئے۔ لہٰذا ان نعمتوں کو اس زمانے کا خضر کہنا چاہئے۔
اب عرفی [illegible] ممدوح کے خاموش ہو جاتا ہے۔ کریم خود سمجھ سکتا ہے کہ سائل
حیات ابدی مانگتا ہے اگرچہ ہلاکت معنوی میں گرفتار ہے ممکن ہے لبوں کو

جنبش دیدے اور آبِ حیات عرفی کو بھی مل جائے۔

اسی سلسلے میں ایک امر اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے کہ **عرفی** امراء و سلاطین کی مدح کے موقع پر خودداری بہت برتا کرتا ہے لیکن بزرگانِ دین کے مقابلے میں منتہائے لجاجت اور ادب کا لحاظ رکھتا ہے۔ یہاں الفاظ بھی دوسرے ہو جاتے ہیں۔ خیالات بھی دوسرے۔ غاشیاں اور ابوالفتح سے ہر موقع پہ برابری کا دعویٰ ہے۔ مگر بزرگانِ دین کے سامنے بے ادبی سے کوسوں دور ہے۔ اسی قصیدے میں کہتا ہے :۔

عرفی مشتاب این رہِ نعت است نہ صحراست ‏ ‏ ‏ آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را

عرفی! دوڑ کے نہ چل! یہ نعت کا راستہ ہے صحرا نہیں (اہلِ دنیا کی مدح اس کے نزدیک صحرا نوردی ہے جنگل کی سیر کرتا۔ جی بہلاتا ہوا چلتا ہے) اور یہاں سنبھل جا! کہ قدم تلوار کی دھار پر پڑ رہے ہیں! کیونکہ انکے فضائل و محامد فہم انسانی سے باہر ہیں معلوم نہیں کہ واقعی مدح کا حق ادا ہو رہا ہے یا معاذ اللہ! میری تعریف منقصت کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ کہتا ہے :۔

ہشدار! کہ نتوان بیک آہنگ سرودن ‏ ‏ ‏ نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کی و جم را

آگے بڑھ کے کہتا ہے :۔

ہر گاہ کہ در مدحِ بنغرم تو بخشا ‏ ‏ ‏ کز مدح ندامت حیران شدہ قدم را

شوکتِ الفاظ اور بلندیِ مضامین میں سلاست و عذوبت کا لحاظ رکھتا ہے اور متقدمین سے بلند نظر آتا ہے بلکہ آسمان کے تارے توڑ لاتا ہے۔ **خاقانی** کے جواب کا مشہور قصیدہ دیکھو اور موازنہ کرو کہ **عرفی** کس عالم کی سیر کر رہا ہے :۔

دل من باغبانِ عشق و حیرانی گلستانش ‏ ‏ ‏ ازل دروازہ باغ و ابد سرحد خیابانش

اسی وجہ سے **فیضی** کو اسکے بارے میں کہنا پڑا کہ وہ بلندیِ فکر و قدرت و ایجاد معانی

وحاشیۂ الفاظ و سرعت فکر و دقتِ نظر کسے را چوں او ندیدہ و نشنیدہ"۔ بعض تشبیہیں خاص طور سے ایک مضمون پر مسلسل نظم ہوئی ہیں اور اُن میں حقائق و معارف کے دریا بہا دئے ہیں۔ مثلاً یہ مسئلہ نظم کرتا ہے کہ مسرتِ خداداد جب آتی ہے تو امیر و غریب، سب کے لئے یکساں ہوتی ہے بلکہ شاید صاحبِ عسرت کو زیادہ حظ آتا ہے۔ تمثیل واقعاتِ عالم میں ڈھونڈھتا ہے اور "عید" کا دن اس خیال کے ادا کرنے کے لئے موزوں نظر آتا ہے۔ شب عید بادشاہ اپنے بسترِ مکلّف و نرم پہ سوتا ہے اور فقیر اپنے ہاتھ تکیہ کی جگہ رکھے ہوئے فرشِ خاک پر یا کنکروں پر گہری نیند سوتا ہے اور دونوں اپنے بستر کو "تکیہ گاہ ناز و نعیم" پاتے ہیں۔ صبح اٹھ کے بادشاہ بھی آرائش و زیبایش کرتا ہے اور فقیر بھی ذرا اپنی ٹوپی جھاڑ کے ترچھی پہن لیتا ہے اور دونوں اپنے اپنے حال میں مطمئن اور مسرور نظر آتے ہیں۔ دیکھو کس لطف سے یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ کہتا ہے :-

صباحِ عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم گدا کلاہ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

اسی طرح اور قصائد بھی مسلسل نظم کئے ہیں اور بڑے بڑے دقیق مسائل حل کئے ہیں۔ یہ طرز ادا مقبول بھی ہوئی اور مطلوب بھی۔ عبد الباقی اس کے معاصر کی رائے ہے :-

"مخترع طرز تازہ ایست، کہ الحال درمیانۂ مستعدان و اہل زمان معروف است و سخن سنجان تتبع او می نمایند"

زورِ تخیل اسے نئے نئے محاورے ایجاد کرنے پر مجبور کرتا ہے کبھی "یوسف زار" کہتا ہے کبھی "نشتر خیز"۔ کہیں "حسن آباد" نظم کرتا ہے۔ کہیں "رمز فروش"۔ مجبور ہے کیا کرے اور کیونکر قوت کلام میں پیدا کرکے اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ استعارے، تشبیہیں، بندشیں عجیب اور غیر مانوس بھی ہو جاتی ہیں مگر شیرینی کلام

سب کو سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ سب کمالات سہی مگر عرفیؔ کو خود قصیدے سے دلچسپی نہیں۔ کہتا ہے :۔

قصیدہ کار ہوس پیشگاں بود عرفی · تو از قبیلۂ عشقی وظیفہ ات غزل است

غالباً اس سے امراء و سلاطین کی مدح سرائی مقصود ہو کیونکہ "ہوس پیشگی" سے بزرگانِ دین کی مدح اور وعظیات مستثنےٰ ہیں اور یہیں عرفیؔ کی عظمت مخصوص نظر آتی ہے۔ ایک قصیدہ کہتا ہے :۔

گر مروۃ ہمتی ز مروت نشاں مخواہ · صد جا شہید شو و ہیت از دشمناں مخواہ

اس قصیدے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کامل الاخلاق انسان ہونے کے لئے اس کا فلسفۂ اخلاق کتنا بلند ہے اور کتنی فلسفیانہ طبیعت پائی ہے۔ اسی طرح ایک اور قصیدہ ہے جس کا مطلع یہ ہے :۔

عادت عشاق چیست مجلس غم داشتن · حلقۂ شیون زدن ماتم ہم داشتن

اسکے پڑھنے سے اور خاقانیؔ کا قصیدہ "سنت عشاق چیست رگ عدم ساختن" کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسفۂ تصوف میں کس کی تحقیق زیادہ ہے اور کس کی طبیعت ہمہ گیر ہے۔ صلح کل کا مشرب اس عالم میں آکے عرفیؔ کو اتنا پسند ہے کہ کہتا ہے :۔

ہم ز غبار کنشت عطر کفن ساختن · ہم بہ تراز و سے دیر سنگ حرم داشتن

خامہ تراشی ستم نامہ تراشی گناہ · ساده دلی ہائے ما خم بہ لوح و قلم داشتن

اب ہم قصائد کی تفصیلیں ترک کر کے غزل کی طرف آتے ہیں۔ یہاں بھی جدت پسند طبیعت علیحدہ راستے پیدا کرتی ہے۔ ذوق عرفان کے مزے لینے والا حقیقت و مجاز دونوں رنگوں میں یکتائی کا دم بھر رہا ہے۔ دیکھو کیا کہتا ہے :۔

در دلِ ما غم دنیا غم معشوق شود · بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

عالم مجاز کی سیر کا انداز ذیل کے چند اشعار سے معلوم ہو جائے گا کہ صوفیہ دور

کے رنگ سے کتنا بلند ہو گیا ہے:۔

یارب تو نگہ دار دلِ خلوتیان را || کان مغبچہ مست ست و در صومعہ باز است
چو بردپیام قاصد کنم ایں خیال و گریم || کہ برش حکایت من؟ بکجا رسیدہ باشد
آں چناں مست جمال است کہ شب تا بسحر || می کشد جام و ز کیفیت مے آگہ نیست

حقائقِ معرفت میں تو وہ امتیازی جگہ حاصل کرلی ہے کہ ہمعصروں میں نظر ہی نہیں آتی۔ چند اشعار اس رنگ کے بھی سنو:۔

دو عالم سوختن نیرنگِ عشق است || شہادت ابتدائے جنگِ عشق است
دماغ آشفتۂ داریم دل نام || کہ سرتاپائے صلح و جنگِ عشق است
اے اجل اجاں ندہند اہلِ وفا سعی مکن || یا برو۔ رخصت آں غمزۂ خونخوار بیار
تا چند بزنجیر خرد بند تواں بود || بے مستی و آشوب جنوں چند تواں بود
طغیان نازبیں کہ جگر گوشۂ خلیل || در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

حقائق کا علم نہ ہونا اہلِ تصوف کے یہاں کا مشہور مضمون ہے اور ہر شخص نے اپنے اپنے رنگ میں یہ مشکل پیش کی ہے۔ عرفی کی طرز ادا دیکھو:۔

حدیکہ تو بادراک نشاید دانست || وین سخن تیز باندازۂ ادراکِ من است

حق الحقائق تک فلسفہ و منطق نہیں پہونچا سکتے اور نہ رسم پرستی اُن حدود کے نزدیک جاتی ہے۔ ہاں! عارف کا دل کچھ دیکھتا ہے:۔

فقیہاں دفترے را می پرستند || حرم جویاں درے را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد || کہ یاراں دیگرے را می پرستند

ساکنِ کعبہ کجا دولت دیدار کجا || اینقدر ہست کہ در سایۂ دیوارے ہست
مدہ عنانِ تعلق بدست ہر ذرہ || برآ و ستے و بر دوشِ آفتاب انداز

عشق اگر مرد ست مروے تاب دیدار آورد | ورنہ چوں موسیٰ بسے آورد و بسیار آورد
دلم بقبلۂ اسلام مائل افتادست | صنم تراشِ من از کفر غافل افتادست

دیکھو! اس آخری شعر کو اور غور کرو کہ کس شان کی تصویر ہے۔ اہلِ معرفت کو رسم پرست اسلام سے منحرف کہتے ہیں۔ عرفی کہتا ہے کہ منزلِ مقصود "حق الحقائق" ہے اسلام بھی اسی کو قبلہ بنائے ہے اور میرا دل بھی۔ دونوں دو مقاموں سے متحرک ہو کے بخطِ مستقیم یا غیر مستقیم مرکز کی طرف جا رہے ہیں۔ "راستے اگرچہ جدا ہیں حسرتِ دل ایک ہے"۔ اب ایک جانب سارا اسلام ہے اور اس کے رواسم و جزئیات اور ایک طرف تنہا عاشق کا دل مگر وہی دل جو پہلے رسم پرستی کی طرف مائل تھا اور اب یہ سمجھا کہ سارے رسم و رواج میرے ہی ساختۂ و پرداختہ ہیں پھر ان کی پرستش کے معنی یہ ہیں دل ہی صنم پرست ہے اور دل ہی صنم تراش۔ لہذا رسم پرستی کفر ہے اب میرا صنم تراش کفر کو ترک کر کے اسلام کے مقابل آگیا ہے۔

مثنوی کے متعلق اتنا کہنا ہے کہ معمولی ہے مطلع یہ ہے :۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | موج نخست است ز بحر قدیم

آزاد بلگرامی کہتے ہیں کہ بجائے "موج" کے "مد" کہتا تو خوب تھا۔ سبحان اللہ۔ پھر فرماتے ہیں کہ "فقیر ہم مصراعے برائے بسم اللہ بہم رسانندہ ام ؎

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | تیغ سیہ تاب رسول کریمؐ

فیصلہ اہلِ ذوق پر چھوڑا جاتا ہے۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

نثر میں ایک رسالہ **نفسیہ** لکھا تھا جو دستیاب نہیں ہوتا۔

غزالی | **غزالی** مشہدی کا مختصر حال خان زماں کے سلسلے میں ہو چکا ہے۔ اکبر کے دربار میں ملک الشعراء ہوا اور ۹۸۰ھ میں انتقال کر گیا۔ **فیضی** نے صوری و معنوی تاریخ کہی ہے :۔

قدوهٔ نظم غزالی که سخن ‏ همه از طبع خداداد نوشت

عقل تاریخ وفاتش به دو طور ‏ سنہ نهصد و هشتاد نوشت

۹۸۰ھ

ابوالفضل کی رائے ہے کہ بہ بلند فہمی و شیوا بیانی طراز یکتائی داشت و از دلآویز گفتار صوفیہ بہرہ مند تھے۔ ایک شعر اس وقت یاد ہے جس میں دنیا کی چند روزہ زندگی کی بے مثل تمثیل دی ہے :-

شد رستخیز و از خواب عدم دیده گشودیم ‏ دیدیم که باقیست شب فتنه غنودیم

ایک رباعی بھی ہر تذکرے میں درج کی جاتی ہے :-

سلطان گوید که نقد گنجینهٔ من ‏ صوفی گوید که دلق پشمینهٔ من

عاشق گوید که داغ دیرینهٔ من ‏ من دانم و بس که چیست در سینهٔ من

غزالی کی پایہ ناز تصنیف مثنوی نقش بدیع ہے جس کے انتخاب کے بغیر یہ تذکرہ نامکمل ناقص رہیگا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :-

خاک دل آں روز که می بیختند ‏ شبنمی از عشق برآں ریختند

دل که بدان رشحهٔ غم آلوده شد ‏ اندکی از آن نمک آلوده شد

دیدهٔ عاشق که دهد خون ناب ‏ [illegible]

پیش اثر عشق چه آب و چه گل ‏ پیش فن عشق چه سنگ و چه دل

دل که ز عشق آتش سوزان در اوست ‏ قطرهٔ خونیست که دریا در اوست

دو شعر اسکے اور یاد آگئے۔ ملاحظہ ہوں :-

بستر شده از درد که بے تو شکستم همه شب ‏ یا سوخته از آتش دل تا به سحر همه شب

جان داده و فارغ شده ام [illegible] ‏ یعنی که شبها [illegible] همه شب

ایک مثنوی اسرار المکتوم بھی غزالی کی تصنیف ہے۔ اور اچھی ہے۔

حرفی ‏ حرفی اصفہانی۔ اصفہان کا رہنے والا ہندوستان میں آگیا۔

فنِ شعر اور اشعارِ قدیم سے خوب واقف تھا مگر "دانش پژوہ" اور "حکمت منش"
کہہ کے ابوالفضل نے ٹال دیا ہے۔ معلوم نہیں کیا مصلحت تھی۔ سوز و گداز طبیعت
میں کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا اور کیفیاتِ عشق سے کلام لبریز تھا۔ چند شعر
ملاحظہ ہوں :-

گرچہ در دل گرہِ دیدم کہ در جائے ہست غم۔ معاذ اللہ اگر نیست تمنائے ہست

معاذ اللہ اچھوتی ہے مگر لطف دیکھو۔ غم کے دور ہونے سے عذر کرتا ہے۔ دوسرا پہلو نکلتا ہے
اور پھر تمنا کے ساتھ پائے تنگیری کا لطف کتنا زیادہ ہے۔ آگے کہتا ہے :-

در چمن یوسف زلیخا ز حسرت می گفت یاد ایامے کہ در آغوشِ زلیخائے ہست
نا امید مرو تو با محبت حبیب کنم کہ میانِ من و او ترتیب تقاضائے ہست
ز گریہ ہائے مظلوم دلِ چشم تری سوخت چراغِ دیدہ بہ یاد تو تا سحری سوخت
شدا ز قربتِ حسنِ تو آں زباں خیرم کہ شعلہ دیدہ جگر تا دو صبح خبری سوخت

خواجہ حسین ثنائی مشہدی۔ وطن میں زراعت پیشہ اور زمیندار ثنائی
بھی تھا۔ فنِ شعر کی طرف توجہ ہوئی تو دربارِ اکبری تک پہونچ گیا۔ خوش گوئی میں بھی
فرد تھا۔ ایک شعر میں کہتا ہے کہ عشق دنیا کی روشنی ہے اور اہلِ دنیا کی راحت
کا سبب۔ جدت پسندی نے عجیب تشبیہیں پیدا کر دیں :-

چہ مہرِ تابناک دہر گر دیدہ چو خوابِ آشنا روئے پر دیدہ

چند اشعار اور منتخب کیے جاتے ہیں :-

مرا بہ تنگ دلی چو بگذرید کہ بازگوی زدہ نظم سر بدر نالہ ایست
در توصلہ تہ فلاک از نقش تنجیدہ ہر ذرہ کہ از خاک ثنائی بہوا رفت

مختصر یہ کہ شعرائے دربارِ اکبری ایک سے ایک بہتر تھے۔ اسی جمع شدہ کا نام دل کا حال
بالاجمال لکھتے ہیں۔

ابوالفضل

ابوالفضل علامی تخلص۔ شیخ مبارک ناگوری کے دوسرے بیٹے تھے اور فیضی کے چھوٹے بھائی۔ ۹۵۸ھ میں پیدا ہوئے اور درسیات ختم کرنے کے بعد باپ اور بھائی کے ساتھ مصائب میں گرفتار رہے۔ جب خاندان کا ستارۂ اقبال چمکا تو یہ بھی **اکبر** کے دربار میں پہونچے اور رفتہ رفتہ کل ممالک محروسہ کے وزیر ہو گئے۔ شہزادہ سلیم (جہانگیر) کو آخر میں شدید عداوت ہو گئی اور یہ دکن کی مہم سے واپس ہو رہے تھے کہ جہانگیر کے ایما سے نرسنگھ دیو نے راہ میں قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ غالباً ۱۰۱۱ھ میں واقع ہوا۔ اکبر کو بیحد صدمہ ہوا اور تھوڑے دنوں کے بعد وہ بھی انتقال کر گیا۔

تصانیف علامی میں اکبر نامہ۔ آئین اکبری اور انشاے ابوالفضل مشہور ہیں۔ **اکبر نامہ** تاریخ ہے اور طویل فقروں اور جملوں میں لکھی گئی ہے۔ **انشاے ابوالفضل** خطوط اور تقریظوں کا مجموعہ ہے۔ جملے اتنے طویل ہیں کہ بعض وقت ایک ایک صفحہ کے بعد جملہ ختم ہوتا ہے۔ عربی الفاظ کی بھرمار ہے۔ مرادفات و مکررات کی کوئی حد نہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ مذاق عصر کے موافق لکھی گئی ہے۔ **آئین اکبری** کی عبارت نادر الوجود ہے۔ مضامین کے اعتبار سے تو تینوں کتابیں اکبر کی ملک گیری۔ نظام سلطنت۔ دول خارجہ سے تعلقات۔ اخلاقی اور مذہبی حالات۔ درباریوں کے تراجم۔ غرض تمام تفاصیل پر حاوی ہیں۔ طرز تحریر میں البتہ ہر ایک کتاب سے جدا ہے۔ استواری تراکیب۔ کفایت الفاظ۔ شیرینی اور فصاحت سب کا لحاظ کیا گیا ہے بلکہ خالص فارسی کے محاورات اور الفاظ بکثرت داخل کئے ہیں۔ اکثر جدید اصطلاحیں بھی بنانی پڑی ہیں۔ اگر اس زمانے میں یہ رنگ مقبول ہو جاتا تو آج زبان کو صاف کرنے کی اوّلیت **ناصر الدین شاہ اور قاآنی** وغیرہ کو نہ ملتی۔ زمانے کی بد مذاقی سے پھر وہی ڈھرّا

اختیار کرلیا جس پر آجکل ایران و ہندوستان دونوں ملکوں میں اعتراض ہو رہے ہیں اور مستشرقین یوروپ بھی ناراض ہیں۔ آئین اکبری کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ شعرا کی تعریف میں کہتا ہے :۔

"راہے بہ نہانخانۂ معنی بردہ اند۔ و روشن ضمیرشان تابشگاہ ایزدی فیض۔ لیکن بسیارے گراں مایگی گوہر نشناشند و بہ آرزوے کم خواستہ میفروشند۔ و در ستائش فرومایگاں روزگار بسپرند۔ و بہ نکوہش فرو ہیدہ مردم زبان بر آلایند۔ وگرنہ پیوند الفاظ بس شگرف باشد چہ جاے دریافت والا معانی"

بدایونی — عبدالقادر بدایونی کو آزاد بلگرامی نے شیخ مبارک کا شاگرد لکھا ہے اور فیضی و ابوالفضل سے بھی مستفیض ہونے کا ادعا کیا ہے۔ اکبر کے پیش امام تھے اور شیخ حاتم سنبھلی کے مرید۔ مہابھارت کے کئی اجزا کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ اور بحر الاسما کا بھی سلیس فارسی میں ترجمہ کیا۔ ۱۰۰۴ھ میں انتقال ہوا۔ ان کی منتخب التواریخ جو تاریخ بدایونی بھی کہلاتی ہے آجکل بہت متداول ہے۔ تفصیلی واقعات اکبر کے زمانے کے سلیس فارسی میں لکھے ہیں مگر نہایت تعصب کے ساتھ۔ مولانا شبلی کو انکی عصبیت کی بیحد شکایت ہے اور بجا ہے۔ جس شخص کو اپنے مذاق کے خلاف پایا ہے۔ اُس کی اچھی طرح خبر لی ہے۔ افسوس ہے کہ اس تعصب بیجا نے اُن کی راے کو کسی معاملے میں قابل احترام نہ ہونے دیا۔ ورنہ واقعات کا اچھا مجموعہ ہے۔

جہانگیر بادشاہ — جہانگیر بادشاہ کی خوش مذاقی بچپن ہی سے ظاہر تھی۔ بادشاہ ہونے کے بعد اہل علم کی قدر دانی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ خود بھی عاشق مزاج تھا اور شعر و سخن کی طرف مائل۔ طالب آملی اسی کے دربار کا ملک الشعرا

تھا۔ اس کے کلام کا انتخاب بھی جہانگیر نے کیا ہے جس کے متعلق مولانا شبلی کی رائے ہے کہ شاید طالب اس سے اچھا انتخاب خود نہ کر سکتا۔ ایک مرتبہ خانخاناں نے جامی کی مشہور طرح "ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید" پر غزل کہی۔ مراد صفوی اور شہزادہ مراد نے بھی غزلیں نظم کیں۔ جہانگیر نے مصرعہ لگا کے فی البدیہہ یہ مطلع کہا:۔

ساغر مے بر رخ گلزار می باید کشید ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید

پھر جامی کی غزل منگوائی تو سوائے اس مصرع کے کوئی پسند نہ آیا۔ خود تزک جہانگیری میں لکھتا ہے:۔

"این طرح ظاہر شد کہ از مولانا عبدالرحمن جامی است۔ غزل او تمام بنظر در آمد۔ غیر ازاں مصرع کہ بطریق مثل بر زبانہا جاری گشتہ دیگر ابیات سست ساختہ است۔ سادہ و ہموار گفتہ"

ایک اور واقعہ لکھتا ہے:۔

"بعرض رسید این بیت امیرالامرا خواندہ شد: بکشتگان عشق تو یک زندہ کردن تو بصد خون برابر است۔ چون طبع من موزون است گاہے باختیار و گاہے بے اختیار مصرع و رباعی یا بیتے در خاطر می گذرد۔ این بیت بزبانم گذشت:۔

از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس
یک دل شکستن تو بصد خون برابر است

چون خواندہ شد ہر کس کہ طبعے داشت درین زمین بیتے گفتہ گذرانید۔ ملا علی احمد مہر کن کہ احوال او پیش ازین گذشت بہ گفتہ بود:۔

اے محتسب ز گریۂ پیر مغاں بترس یک خم شکستن تو بصد خون برابر است"

ان اقتباسات سے جہانگیر کے مذاق نظم و نثر کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔ خصوصاً

نثر کی سلاست زمانے کے رنگ سے بالکل جدا ہے۔ تزک جہانگیری اس کی مبسوط تصنیف اپنے حالات میں ہے اور تاریخی ایمانداری اسقدر ہے کہ اپنی کمزوریاں بھی درج کردی ہیں۔ شراب خواری اور عیش پرستی کا بھی اقرار ہے بعض وقت غلط سزائیں دیدینے پر بھی افسوس ہے۔ **ابوالفضل** کے قتل کا ذمہ دار اپنے کو صاف صاف قرار دیدیا ہے۔ غرض یہ خوبیاں اس کتاب کو پایۂ اعتبار تک لے آئی ہیں۔

نورجہاں **نور جہاں بیگم**۔ فی الحقیقت عہد جہانگیر کی فرمانروا تھی اور اہل کمال کی قدردان۔ خود بھی شعر کہتی تھی اور شعرا و مصنّفین کی محنتوں کی داد دیتی تھی۔ تنقیدی ذوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ ایک مرتبہ **طالب آملی** یا **کلیم** کا یہ شعر پڑھا گیا:۔

زشرم آب شدم کاب راشکستے نیست　　بحیرتم کہ مرا روز گار چوں بشکست

فوراً بول اٹھی "یخ بست وشکست"۔

شاہجہاں **شاہجہاں** کی علم دوستی بھی کچھ کم نہ تھی۔ بڑے بڑے کملا اور ماہرین فن اسکے دربار میں حاضر رہتے تھے اور انعامات حاصل کرتے تھے۔ عمارات نفیسہ (روضۂ تاج گنج وغیرہ) اسکی یادگار ہیں اور رفیع قزوینی و دانش مشہدی وغیرہ اسی کے دربار کے فروغ یافتہ۔ ایک مرتبہ سلطان روم نے شاہجہاں کو لکھا کہ آپ ہندوستان کے بادشاہ ہیں۔ شاہجہاں کیوں لقب اختیار کیا ہے۔ **کلیم** نے اسی وقت ایک قصیدہ نظم کرکے پیش کیا جس میں **شاہجہاں** کے لقب کی توجیہ نہایت عمدگی ہے۔

ہندوجہاں زروے عدد ہر دو چوں یکیست

شہ را خطاب **شاہجہانی** مبرہن است

کہتے ہیں کہ **کلیم** کی قدر دانی اسی وقت سے شروع ہوگئی اور مالا مال کردیا گیا۔ **میر یحییٰ کاشی** کی تاریخ بنائے شہر دہلی "شد شاہجہاں آباد از شاہجہاں آباد" بھی اسی عہد کی قدر دانی کی بدولت ہے۔

اورنگ زیب

اورنگ زیب تو خود ہی عالم جیّد اور منشی بے بدل تھا۔ **رقعات عالمگیری** اسکے خطوط کے ایک چھوٹے سے مجموعے کا نام ہے جو مذاق رائج الوقت کا اصلاحی پتھر نصب کرتا ہے۔ رنگ تحریر ابوالفضل کے مکاتیب سے ملتا جاتا ہے مگر پیچیدار استعاروں اور طویل جملوں سے بالکل پاک ہے اور سلاست و روانی میں کلام الملوک ملوک الکلام کا بہترین نمونہ ہے۔ فن شعر کا چراغ بقول علامہ شبلی اس کے زہد خشک نے ضرور گل کر دیا تھا۔

زیب النسا

زیب النسا بیگم مخفی ستارۂ خاندان مغلیہ کی شعرگوئی اور سخن سنجی کے افسانے آجتک مشہور ہیں اور ایک دیوان شعر یادگار ہے اگرچہ نسخہ متداول میں مخفی رشتی وغیرہ کے اشعار بھی شامل ہیں۔

داراشکوہ

داراشکوہ کا نام سلاطین کی فہرست سے اورنگ زیب نے محو کر دیا مگر زمرۂ مصنفین میں ابتک چمک رہا ہے۔ یہ آزاد منش اور صوفی مشرب شاہزادہ اکبرشاہ کے دوش بدوش چلنے کو تیار تھا مگر اقبال نے یاوری نہ کی۔ البتہ اسکی تصانیف کو لٹریچر نے امتیازی جگہ دے دی ہے۔

ظفرخاں اور ابراہیم عادلشاہ

ظفرخاں والئی کشمیر اور **ابراہیم عادل شاہ** والئی بیجاپور کے نام بھی سخنگویوں اور سخن سنجیوں میں پیش پیش ہیں اور صائب و ظہوری وغیرہ انھیں درباروں کے پروردہ یافتہ ہیں۔

افسوس ہے کہ کتاب طویل ہوتی جاتی ہے اور لکھنا بہت ہے لیکن بعض کاملین کے حالات اختصار کے ساتھ لکھ کے یہ باب ختم کیا جاتا ہے۔ ارادہ ہے کہ ایک مستقل جلد دورۂ ہندیہ کی تحقیق کے ساتھ تالیف کیجائے۔ انشاءاللہ اسوقت کچھ حق سخن سنجی ان لوگوں کا ادا ہوسکے گا۔

نظیری

ارباب کمال میں سب سے پہلے نظیری کا نام لینا چاہیئے۔ محمد حسین نام نیشاپور

وطن خراسان وکاشان میں بحیثیت شاعری امتیاز پیدا کیا۔ پھر میرزا عبدالرحیم خانخاناں کے دربار میں (۹۹۲ھ) میں آیا اور رفتہ رفتہ اکبر کے دربار میں پہونچا مگر یہاں کوئی رسوخ خاص حاصل نہ ہوا۔ مجبوراً احمد آباد گجرات میں خانخاناں کی مداحی مستقل طور سے کرنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد خانخاناں سے اجازت لیکے حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہوا اور بعد فراغ پھر ہندوستان واپس آیا اور شاہزادہ مراد کے دربار میں حاضر ہو کے جشن نوروز کے موقع پر ایک قصیدہ نذر کیا اور انعام پایا۔ جہانگیر کی عہد سلطنت میں اسے عروج ہوا اور مختلف مواقع پر گراں بہا انعام ملے۔ آخر عمر میں تارک الدنیا ہوگیا اور علوم دینیہ کے پڑھنے میں وقت صرف کرنے لگا۔ ۱۰۲۳ھ میں وفات پائی اور احمد آباد گجرات کے محلہ تاجپورہ میں ایک مسجد بنوائی تھی اُسی میں دفن ہوا۔ فن شعر میں غزل کو معراج اسی کی برکت سے نصیب ہوئی۔ جدت پسند ہونے کی وجہ سے نئے الفاظ اور نئی ترکیبیں ایجاد کی ہیں مثلاً

از کف نمی دہد دل آساں ربودہ را　　　دیدیم زور بازوے ناآزمودہ را

"آساں ربودہ" اور "ناآزمودہ" نے جن مطالب کو مختصر لفظوں میں ادا کردیا ہے وہ محض اختراع ترکیب کا فیض ہے۔ اسکے علاوہ تخییل میں بھی جدت ہے اور پُرلطف۔ دیکھو معشوق کی دلربائی کس شان سے بیان کرتا ہے:-

زپائے تا بسرش ہر کجا کہ می نگرم　　　کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

جان بھی شیریں ہے اور معشوق بھی عزیز۔ ایک عالمِ خاص کی تصویر کھینچتا ہے جو خسرو کی "من تو شدم تو من شدی" سے کسی قدر علیحدہ ہے اور لطف کے ساتھ:-

نہ چناں گرفتہ جا بمیانِ جان شیریں　　　کہ تواں ترا و جاں را بہم امتیاز کردن

ایک خصوصیت خاص اسکے کلام کی یہ ہے کہ تغزل کا خیال غزل گوئی میں

ہمیشہ رکھا ہے کیونکہ غزل کے معنی ہیں "حکایت از معشوق" یعنے معشوق سے باتیں کرنا یا معشوق کے متعلق باتیں کرنا۔ اس نکتہ پر لحاظ کرکے نظیری چاہے عرفی کے رنگ میں فلسفہ گوئی کرے چاہے صائب کی طرح تمثیلات نظم کرے۔ حقیقت کے عالم میں ہو خواہ دنیائے مجاز کے نظارے کر رہا ہو سلاست زبان اور شیرینیٔ ادا کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اسکا خیال ہے کہ غزل کا عنصر خاص "تغزل" ہے۔ اگر یہ نہیں تو کچھ نہیں۔ تصوف کا رنگ دیکھو:۔

تو مپندار کہ ایں قصہ ز خود می گویم   گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

عالم مجاز کی حسن تخییل پر نظر کرو:۔

نیست لذت ز نظربازیٔ بزمے کہ درو   خندۂ زیر لب و گریۂ پنہانی نیست

تمثیلی شاعری کا اندازہ کرو:۔

شکوہ نقصان داشت فصلے ازمیاں انداختم
نرخ ارزاں بود کالا در دکاں انداختم

آں دہد در گریہ پندِ ما کہ با ما دشمن است
ہر کہ می گیرد شناور را بہ دریا دشمن است

معاملات عشق یوں کہے ہیں:۔

ایں دل کہ در وصال تسلی از و نبود   خرسندش از تغافل و دشنام کردہ ایم

فلسفیت کا انداز:۔

خضر صد منزل بہ پیشم آمد و نشناختم   بازیبا یدز سر گیرم رہ پیمودہ را

ایک مسلسل غزل سنو اور اندازہ کرو کہ معاملات حسن و عشق میں اس کی نظر کہاں تک گئی ہے:۔

چشمش براہے میرود مژگاں تمنا کش نگر
در سینہ دارد آتشے پیراہن چاکش نگر

دامیکہ زلف انداختہ درگردنِ سیمینش ببیں
خونیکہ مژگاں ریختہ بردامنِ پاکش نگر
شرم از میاں برخاستہ مُہر از دہاں برداشتہ
گفتار بے ترسش ببیں رفتار بیباکش نگر

قصائد میں بھی سلاست اور روزمرّہ کافی طور سے موجود ہے اور دقیق خیالات کو بھی صفائے ادا سے آسان کر دیا ہے۔

شیدائے مشہدی ۔ باپ دادا ایرانی تھے۔ خود فتحپور سیکری میں پیدا ہوا اور جہانگیر کی فوج میں سپاہی کے حیثیت سے زندگی کا آغاز ہوا۔ شاہجہاں کے زمانے میں عروج پایا۔ اس زمانے میں ایک قصیدۂ خمریہ نظم کیا جسکا مطلع یہ ہے:۔ شیدائے مشہدی

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے   حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

تعجب یہ ہے کہ اتنے لطیف مطلع پر یہ بیچارہ کافر بنایا گیا اور بادشاہ نے حکم دیدیا کہ ممالک محروسہ سے نکالدیا جائے۔ مگر اُس نے ایک قطعہ معذرت میں نظم کر کے پیش کیا جس میں مولانا جامی کا یہ شعر بطور استشہاد مذکور تھا:۔

از صراحی دو بار قلقل مے   پیش جامی بہ از چہار قُل است

شیدا کی معذرت قبول ہوئی بلکہ انعام بھی ملا۔ بعض تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دیوان میں ایک لاکھ شعر تھے اور کلام مشہور بھی ہو گیا تھا۔ خود کہتا ہے:۔

شعر برجستۂ **شیدا** ہمہ جا مشہور است   نیست حاجت کہ بدیوانِ مرتب نگرید

کلام میں برجستگی ہے اور طبیعت کسی قدر دقت پسند بھی ہے مشکل ردیف اور قافیوں میں غزلیں اور قصیدے خصوصیت کے ساتھ صاف ہوتے ہیں مثلاً کہتا ہے:۔

تازہ سازم ہر سحر چوں صبح داغِ خویش را
تا قیامت زندہ می خواہم چراغ خویش را

لالہ در گلشن سیہ مست است و نرگس در خمار
تا بہ کے از مے تہی بینم ایاغ خویش را
گر ترا تکلیف مے خوردن کنم عیبم مکن
باغباں از آب دارد تازہ باغِ خویش را

سنہ ۱۰۷۰ھ کے بعد اسکی وفات ہوئی اور کشمیر میں دفن ہوا۔

صائب — **صائب** مرزا محمد علی اصفہانی بعد فراغت حج آخر عہد جہانگیر میں وارد ہندوستان ہوا۔ جب کشمیر پہونچا تو ظفر خاں والئی کشمیر سے ملاقات ہوئی اور اسقدر آپس میں لطف بڑھا کہ صائب اسی کا مداح ہو گیا۔ شاہجہاں نے اپنے زمانے میں لشکر خاں کو صوبۂ کشمیر کی ولایت سپرد کی اور ظفر خاں کو دار السلطنت میں طلب کر لیا۔ صائب بھی ساتھ آیا اور سفر دکن میں بھی ظفر خاں اور شاہجہاں کے ہمراہ رہا۔ برہان پور کے زمانۂ اقامت میں صائب کے باپ اصفہان سے آئے اور بیٹے کو وطن لے جانے کے جویا ہوئے۔ میرزا نے اجازت طلب کی مگر اتفاق سے شاہجہاں نے آگرہ کا قصد کر دیا۔ مجبوراً سب کو وہاں جانا پڑا۔ ۱۰۴۲ھ میں ظفر خاں کو پھر کشمیر کی صوبہ داری ملی اور صائب اپنے ممدوح کے ہمراہ واپس گیا۔ وہاں پہونچکے ظفر خاں سے رخصت ہوا اور اصفہان میں سکونت پذیر ہو گیا۔ سلاطین صفویہ نے بھی اسکی قدر دانی کی آخر ۱۰۸۰ھ میں انتقال ہوا اور اصفہان میں مدفون بنا۔ مولانا شبلی کی رائے ہے کہ "ایران میں شاعری رودکی سے شروع ہوئی اور میرزا صائب پر ختم ہو گئی" صرف قاآنی کا استثنا کیا ہے۔ ممکن ہے کہ رائے کسی حد تک مبالغہ آمیز ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ غزل گوئی میں ایک طرز خاص کا موجد ہے اور ذکاوت اور ذہانت میں لاجواب۔ ایک مرتبہ یہ مصرعہ پڑھا گیا:-

دویدن۔ رفتن۔ استادن نشستن خفتن و مردن

چند غیر مربوط الفاظ یکجا ہونے کے سوا اس مصرعہ میں کچھ نہ تھا۔ صائب نے فوراً پیش مصرعہ لگا کے عجیب رنگ پیدا کر دیا:۔

بقدرِ ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را

دویدن رفتن استادن نشستن خفتن و مردن

کلام کا کمال خاص طور سے تمثیل میں ہے۔ سادگی ہو یا مضمون آفرینی۔ فلسفہ ہو یا مدح۔ حقیقت ہو یا مجازنہ۔ ہر رنگ کی جلا ایک تمثیل ہی کر دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فصاحت و سلاست کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا:۔

جذبۂ عاشق اثر در سنگ خارا می کند
کوہکن معشوق خود از سنگ پیدا میکند

صحبتِ ناجنس گرجاں بخشدت صائب مرنج
آب را دیدی کہ ماہی را بدام افگند و رفت

از سعی کارِ عشق شود خام بیشتر
پیچیدہ بہ مرغ بال فشاں دام بیشتر

چشم بر صنع الٰہی باز کن لب را ببند
بہتر از خواندن بود دیدن خطِ استاد را

بعض اشعار اس روش خاص سے جدا بھی ہیں۔ نازک خیالی کا انداز ملاحظہ ہو:۔

گرگذشتست ازیں بادیہ دیگرکا مروز
نبضِ رہ می طپید و سینۂ صحرا گرم است

چشم عاشق زتماشائے تو چوں سیر شود
بر نگہ سلسلہ جنبانِ نگاہ دگر ست

معاملات عشق کا انداز بیان :۔

ہم اینجا صلح کن با من۔ چہ لازم
کہ در محشر زما شرمندہ باشی

سرمستی کا انداز دیکھو:۔

عالمِ بے خبری طرفہ بہشتے بود ست
حیف صد حیف کہ ما دیر خبر دار شدیم

قصائد نہایت صاف اور سلیس ہیں اور بعض قصیدوں میں تخلیص نہایت عمدہ ہے۔ مثلاً ایک قصیدہ امام رضا علیہ السلام کی شان میں کہا ہے جس میں

مذمتِ شراب کے بعد کہتا ہے :-

بگذر ز تاک بد گہر و آب او کہ ہست ۔۔۔ ہر دانہ ریش خوبی فرزند بوتراب[1]

اگرچہ یہی تخلیص نظیری کے یہاں بھی ہے :-

ازاں شراب کنی در قدح کہ باد صبا ۔۔۔ ز فیض نکہت او روح داد عیسیٰ را

ہزار کوہ غم از یکدگر فرو ریزد ۔۔۔ در آں مقام کہ ظاہر کند تجلا را

نہ زاں شراب کہ انگور او شہید کند ۔۔۔ شہ سریر امامت علیؑ موسیٰ را

طالب آملی — **طالب** آملی ابتدائے شباب میں ہندوستان چلا آیا اور تلاشِ معاش میں اِدھر اُدھر پھرا کیا مگر جب کوئی صورت نہ نکلی تو میرزا غازی خاں[2] والئی قندھار کے پاس پہونچا اور مقربانِ خاص میں داخل ہوا۔ رفتہ رفتہ خلوص نے اتنی ترقی کی کہ غازی خاں کو بجائے ممدوح کہنے کے معشوق کہنے لگا :-

تکلف نیست معشوق منست او نیست ممدوحم ۔۔۔ ازاں ایں شعر عشق آمیز در مدحش سرائیدم

غازی خان کے بعد پھر ہندوستان آیا اور عبداللہ فیروز جنگ حاکم گجرات کے نام خواجہ قاسم دیانت خاں کا سفارشی خط لیکے احمد آباد گیا اور بہت عزت حاصل کی پھر اعتماد الدولہ[3] تک رسائی پیدا کی اور آسکے سایہ عاطفت میں زندگی بسر کرنے لگا۔ یہانتک کہ دربار شاہی میں پیش کیا گیا اور سنہ ۱۰۲۸ھ میں ملک الشعرائے دربار ہو گیا اور نہایت عزت و احترام سے بسر کرنے لگا۔ آخر سنہ ۱۰۳۶ھ میں جہانگیر سے ایک سال پیشتر

---

[1] مشہور ہے کہ مامون رشید نے امام علی بن موسی الرضا علیہ السلام کو انگور میں زہر دیکے شہید کیا تھا اگرچہ مامون کا قاتل ہونا مختلف فیہ ہے۔ [2] یہ بڑا سخن شناس تھا اور خود بھی وقاری تخلص کرتا تھا اور شعر کہتا تھا۔ رنگ طبیعت کا اندازہ ان اشعار سے ہو جائیگا :-

در عہد تو ما را ہمہ با غیر خطاب است ۔۔۔ سرپنجۂ مژگاں و گریباں عتاب است

گریہ ام گر سبب خندۂ او شد چہ عجب ۔۔۔ ابر ہر چند کہ گرید ترخ گلشن خندد

غازی خاں کی عمر صرف ۳۵ برس کی تھی کہ ایک غلام کے ہاتھ سے مسموم ہوا۔

[3] نور جہاں بیگم کا چچا۔

انتقال کرگیا۔ **طالب** کی شاعری کا آغاز بارہ تیرہ برس کی عمر سے تھا اور زود گوئی میں اسقدر امتیاز تھا کہ دو تین گھنٹے میں پچاس ساٹھ شعر کا قصیدہ تیار کرلیتا تھا۔ تشبیہات و استعارات میں جدّت و ندرت پیدا کرنا اس کا کام تھا:۔

لبش[1] از گفتن چناں بستم کہ گوئی — دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد
عشق در اوّل و آخر ہمہ جانست و سماع — ایں شرابیست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است
دو لب خواہم یکے در مے پرستی — یکے در عذر خواہیہائے مستی
ز غارتِ چمنت بر بہار منت ہاست — کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

صائب کے رنگ میں بھی بعض اشعار ملتے ہیں:۔

مرد بے برگ و نوا را سبک از جائے بگیر — کوزہ بے دستہ چو بینی بدو دستش بردار
دشنام خلق راند ہم جز دعا جواب — ابرم کہ تلخ گیرم و شیریں عوض دہم

ہندوستانی فارسی کا اثر بھی اسکے کلام میں ملتا ہے۔ **جہانگیر** نے شراب کا نام رام رنگی رکھا تھا۔ کہتا ہے:۔

نہ ایم منکرِ صہبا ولیک می گویم — کہ رام رنگئی ما نشۂ دگر دارد

کلیم **ابو طالب کلیم** ہمداں میں پیدا ہوا اور شیراز میں تحصیل علم کی۔ پھر ہندوستان میں آیا اور شاہنواز خاں کے دربار میں جہانگیر کے زمانے میں باریاب ہوا۔ سنہ ۱۰۲۸ھ میں ایران واپس گیا مگر نہایت افسردہ۔ ہندوستان چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا:۔

بہ ایران میرود نالاں کلیم از شوق ہمراہاں — بپائے دیگراں ہمچوں جرس طے کردہ منزل را

سنہ ۱۰۳۰ھ میں پھر واپس آیا اور میر جملہ کے ذریعے سے **شاہجہاں** کے دربار میں حاضر ہونے لگا یہاں تک کہ سنہ ۱۰۴۲ھ میں **ملک الشعرا** کا خطاب ملا۔ جب شاہجہاں نے سفر کشمیر کیا تو کلیم بھی ہمراہ تھا۔ وہاں ایسا جی لگا کہ بادشاہ سے اجازت لیکے زندگی بھر وہیں رہا۔ آخر سنہ ۱۰۵۵ھ میں

[1] یہ چار شعر جہانگیر نے منتخب کئے اور خوش ہوکے **ملک الشعرا** کا خطاب دیا (دیکھو توزک جہانگیری)

رحلت کی اور محسن کشمیری نے تاریخ کہی "طور معنی بود روشن از کلیم" فن شعر میں کلیم کا کلام ہر صنف میں موجود ہے بلکہ جزئیات پر بھی نظمیں پائی جاتی ہیں مثلاً انگوٹھی۔ قلمدان۔ کشتی۔ بندوق پر اشعار نظم کئے ہیں۔ یہ خصوصیت اسے مذاق حال سے نزدیک لاتی ہے اور ہمعصروں کی نظر میں عجوبۂ روزگار ٹھہراتی ہے۔ مثنویوں میں ہندی الفاظ بکثرت درج لئے ہیں :۔

مدہ بر وعدۂ تنبولیاں دل　　　که جز خون خوردن از وی نیست حاصل

ز حسن شستۂ دھوبی چه گویم　　　ازاں بے پردہ محجوبی چه گویم

درختوں اور پھولوں کا ذکر کرتا ہے :۔

ز عوز و ناں نظر دریوزہ دارم　　　که وصف مولسری را بر نگارم

گل گڑہل نه فہمیدست موسم　　　شگفته چوں رخ یار ست دائم

نہال نیم اش از بس خوش نسیم است　　　دل طوبیٰ ز رشک آں دو نیم است

واقعہ نگاری کا بھی شوق تھا۔ شہزادگی کے زمانے میں عالمگیر کا ایک ہاتھی سے مقابلہ ہوا نہایت صفائی سے یہ واقعہ ایک مثنوی میں تحریر کیا ہے (دیکھو شعر العجم جلد سوم)۔ قصائد میں مشکل بندشوں اور پیچدار ترکیبوں سے احتراز کیا ہے اور مبالغہ و حسن تعلیل کو وسعت دی ہے۔ مولانا شبلی کی رائے ہے کہ قصیدے کی متانت اور بلندی کم ہوگئی ہے اور غزلیت کا رنگ غالب آگیا ہے۔ فی الحقیقت عرفی و فیضی کے بعد سے یہ صنف پست ہوتی گئی اور زمانے کا مذاق اسے اسی پست مقام پر کھینچتا رہا۔ کلیم تشبیہوں میں جب واقعہ نگاری کرتا ہے تو تخیل کے زور سے حقیقت کو دبا دیتا ہے۔ مثلاً ابر و بہار کا حال کہتا ہے :۔

سحاب از تیر باران بہاری　　　به بستاں جمله گلها را نشان کرد

بتوے آتش گل در گرفتست　　　که بلبل رفت و در آب آشیاں کرد

یہی رنگ رفتہ رفتہ مقبول ہوتا گیا اور ہندوستان کی فارسی شاعری کو ایران کی شاعری سے اتنا دور کھینچتا گیا کہ آخر میں جب موازنہ کیا گیا تو ترکیب الفاظ و تخییل مضامین دونوں کے اعتبار سے دو چیزیں ایک زبان میں پیدا ہو گئیں۔ غزل گوئی میں کلیم کو امتیاز خاص ہے۔ تغزل تو بالکل کم ہے مگر وہی ہندوستان کی پرورش یافتہ چیز جس کا نام مضمون آفرینی ہے اسکے غزلوں میں بکثرت موجود ہے :۔

بسکہ ز دیدہ ریختم خونِ دلِ خراب را　　　　گریہ گرفت در حنا پنجۂ آفتاب را

بلکہ یہ جدّت طرازی کبھی کبھی مذاق سلیم سے اشعار کو گرا دیتی ہے۔ مثلاً

شراب کہنہ مینوشم بہ بزمِ او چو بنشینم　　　　ہمین تا نوبت آید دخترِ ز پیر می گردد

صائب کے رنگ میں تمثیلیہ اشعار کہے ہیں اور اچھے کہے ہیں :۔

روشندلاں تو شاہدِ شاہاں نگفتہ اند　　　　آئینہ عیب پوشِ سکندر نمیشود

قطعِ امید کردہ۔ نخواہم نعیم دہر　　　　شاخِ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

اندھیری راتوں سے گھبراتا ہے اور رنگ تخییل بھر کے کیفیت دکھاتا ہے :۔

لیدا زیں تاریکیٔ شبہا بخود خوش کن کلیم　　　　شکوہ کم کن در چراغِ اختران روغن نماند

جنون کا جوش بھی اسی رنگ میں دیکھو :۔

اگر بہ بادیہ گردی نمیرسم چہ عجب　　　　جنونِ من نشناسد ز شہر صحرا را

یہ سب کچھ سہی مگر لطف زبان و محاورہ ہر مقام پر موجود ہے۔ اخلاف اسکو بھی مضمون آفرینی کے پیچھے خیرباد کہدینگے۔

دانش مشہدی ۔ میر رضی نام۔ سلسلۂ نسب امام رضا علیہ السلام سے ملتا ہے۔ **دارا شکوہ** بن شاہجہاں سے خصوصیت خاص ہو گئی تھی بلکہ شاہزادے کو اسکا یہ شعر نہایت پسند تھا :۔　　　　دانش

تاک را سر سبز کن اے ابرِ نیساں در بہار　　　　قطرہ تا مے می تواند شد چرا گوہر شود

شہزادہ شجاع کے ساتھ بھی خصوصیت رہی۔ پھر عبداللہ شاہ کے پاس دکن گیا یہاں اسکے باپ میر ابو تراب کا انتقال ہو گیا۔ اسی رنج میں یہ رباعی کہی:۔

دانش بکن اعتماد بر عمر دراز   کاید بزیان کم بسر عمر دراز
گیرم کہ چو عیسیٰ بفلک بر شدہ   آید بچہ کار بے پدر عمر دراز

آخر ۱۰۴۲ھ میں قطب شاہ کی طرف سے نائب الزیارۃ ہو کے مشہد مقدس چلا گیا اور ۱۰۴۴ھ میں وہیں رحلت کر گیا۔ بعض اشعار درج کئے جاتے ہیں تاکہ رنگ طبیعت کا اندازہ ہو سکے:۔

مرا کہ خندۂ گل سر بدرد می آورد   دماغ گریۂ بلبل دریں بہار کجاست
تو بہار است ہوا مایۂ عشرت دارد   مفت رندی است کہ مے دارد و فرصت دارد
اے ہما از سر ما خاک نشیناں مگذر   سایۂ بال تو بدنامی دولت دارد

تمثیلیہ رنگ ملاحظہ ہو:۔

مرد دانا بہ ہنر زندۂ اقران گردد   میوہ رنگیں چو شد از برگ نمایاں گردد
پس از وفات کہ یاد کند بجز غم خویش   چو خون مردہ سیہ پوش شو براتم خویش

قدسی

قدسی۔ حاجی محمد جان مشہدی ۱۰۴۲ھ میں ہندوستان آیا اور شاہجہان کے دربار میں باریاب ہوا اور وہیں ملازم رہا۔ سال وفات ۱۰۵۶ھ ہے اور مدفن لاہور قصائد میں اسے ید طولیٰ تھا اور بعض نقادوں کا خیال ہے کہ کلیم نے قصیدہ گوئی میں اسی کا رنگ اختیار کیا تھا۔ انداز کلام ملاحظہ ہو۔

زبسکہ کوہ کشید ست نم ز ابر مطیر   توان کشید رگ از سنگ ہمچو موز خمیر
چو خاک پیرہن غنچہ باد پیرایاں   کنند رخنۂ دیوار را ز گل تعمیر
سحاب شست لب غنچہ را بچندیں آب   برائے آنکہ زند بوسہ بر رکاب امیر

جدت تخئیل اسکے کلام میں ضرور ہے لیکن حقیقت کا پردہ پوش ہو جانا کچھ اچھا نہیں۔

اس رنگ کا بانی خواہ کلیم ہو خواہ قدسی ایک ایسے اساس کو قائم کر دیتا ہے جو مذاق سخن پر بڑا اثر ڈالتا ہے۔ قدسی کے بعض قصائد میں ایک بات اور عجیب ہے وہ یہ ہے کہ بغیر تخلص کے مدح شروع کر دیتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اپنے زمانے کا مسلم الثبوت اُستاد ہے اور شاہجہاں کے حال میں مثنوی بادشاہ نامۂ صاحبقران ثانی میں تو اکثر مقامات نہایت دلکش نظم کئے ہیں اگرچہ مبالغہ اور "بنوٹ" کا رنگ غالب ہے۔ کشمیر کی تعریف میں کہتا ہے:۔

نسیمش ز صنعت بہار آفریں	قلمہائے نخلش نگار آفریں
چو گلہائے رعنا دریں لالہ زار	خزاں راپس پشت کردہ بہار
زبس ابر پاشیدہ بر خاکش آب	غبارے ندارد ہوا جز سحاب
چو رخسار ساقی ز جام شراب	چمن در گرفت از گل آفتاب
شد از عکس گل بسکہ خوشبوے آب	بود چشمۂ آب حوض گلاب

جلالائے طباطبائی[1]۔ محمد نام۔ جلال الدین لقب شہزادہ مراد بخش پسر شاہجہاں کے اہل دربار سے تھے اور اسی کے حکم سے نوشیرواں کے اقوال عربی اور فارسی کتابوں سے جمع کر کے مع شرح تالیف کئے جس کا نام توقیعات کسریٰ ہے۔ علاوہ اسکے ایک اور کتاب شش نثر فتح کانگڑہ کے حال میں لکھی ہے۔ طرز تحریر خوشگوار نہیں ہے عربی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت ہیں اور جملے خواہ مخواہ طویل اگرچہ متانت وجزالت بھی موجود ہے۔ جس مقام پر نوشیرواں کے اقوال کی شرح کی ہے وہ متن سے زیادہ مشکل ہو گئی ہے۔

جلالائے طباطبائی اور توقیعات کسریٰ

---

[1] اسمٰعیل بن ابراہیم بن حسن بن علی بن ابیطالب علیہ السلام کا لقب طباطبا ہے اور ان کی اولاد طباطبائی کہلاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اسمٰعیل بچپن میں قاف کا تلفظ طا کرتے تھے۔ عید کے لئے باپ نے پوچھا کہ تمھیں کون چیز پہننے کی بنوا دی جائے۔ کہا۔ "طبا طبا" یعنے "قبا قبا" اس دن سے اُن کا لقب طباطبا ہو گیا۔

ظہوری ترشیزی - ظہور الدین نام - ترشیز وطن - علوم و فنون میں دستگاہ حاصل کرنے کے بعد دکن آیا اور عادلشاہیوں کے دربار میں داخل ہوا - ایک **ساقی نامہ** برہان شاہ والیٔ احمد نگر کو نذر کیا - بادشاہ نے چند ہاتھی نقد و جنس لاد کے انعام میں بھیجے - کہتے ہیں کہ جب انعام پہونچا تو ظہوری قہوہ خانہ میں حقہ پی رہا تھا - کارپردازان سلطنت نے رسید مانگی تو ایک پرچہ پر لکھ دیا کہ "تسلیم کردند تسلیم کردم"۔ ایک مرتبہ عرفی کے پاس ایک شال بھیجی - عرفی نے ہجو میں تین رباعیاں کہہ کے بھیجیں جنمیں سے ایک یہ ہے :- ظہوری

این شال کہ وصفش نہ حد تقریر است | آیات رعونت مرا تفسیر است
نامش نکنی قماش کشمیر کزو | صد رخنہ بکار مردم کشمیر است

ابراہیم عادلشاہ نے ظہوری کی بہت قدردانی کی اور ظہوری کے تصنیفات کی بدولت اُس کا نام بھی آجتک دنیائے ادب میں زندہ ہے - ۱۰۲۵ھ میں ظہوری نے وفات پائی اور دکن میں دفن ہوا اور سہ نثر و ساقی نامہ و کلیات غزل و قصائد یادگار چھوڑے - نظم میں تقریباً ہر صنف میں کمال فن دکھایا ہے - اگرچہ مضمون آفرینی اور استعارہ بندی بکثرت ہے مگر سلاست و فصاحت بدرجۂ کمال موجود ہے خصوصاً مثنوی سے طبیعت کو خاص لگاؤ تھا مثلاً ابراہیم عادلشاہ کی تعریف میں کہتا ہے :-

کعبۂ اہل دل ابراہیم باد | قبلۂ نہ چرخ و ہفت اقلیم باد
از مہ تو پشت دستے بر زمیں | پیش قدرش چرخ در تسلیم[۱] باد

---

[۱] سلطنت مغلیہ میں سلام کرنے کے دو طریقے رائج تھے تسلیم اور کورنش - تسلیم کے لئے زمین پر پشت دست رکھتے تھے اور آہستہ آہستہ اُٹھا کے پیشانی پر رکھتے تھے - کورنش کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک مرتبہ ہمایوں نے اکبر کو کم سنی میں ایک تاج پہننے کو دیا - یہ تاج سر سے کسی قدر بڑا تھا - اکبر جب باپ کے سامنے تسلیم کرنے کو جھکا تو سر سے تاج گرنے لگا - فوراً ہاتھ پیشانی پر رکھ کے جھک گیا اور تاج کو سنبھال لیا - ہمایوں نے بیٹے کی محبت میں یہ طریقہ بھی جاری کر دیا - (آئین اکبری)

ہمتش ترکیب لفظِ کم نخواست　　　کاف سرکش[۵۱] زاختلاطِ میم باد
داستاں شد ختم بستانِ رخش　　　غیرتِ گلزار ابراہیم باد

ساقی نامہ کے اشعار اگرچہ اُسی زمانے کے مذاق میں ہیں اور نیچرل رنگ سے بہت دور ہو گئے ہیں مگر سلاست اور روانی میں بے نظیر ہیں اور شیرینیِ ادا ہر مقام پر موجود ہے اگرچہ صاحب آتشکدہ کی رائے ہے کہ "حسن زیادے ندارد اما بفصاحت مشہور شدہ"۔ نثر لکھنے کا طریقہ البتہ مخصوص ہے طویل اور مکرر جملے تکلفات میں جکڑے ہوئے۔ ہر جملے میں بکثرت صنائع و بدائع اور تشبیہات و استعارات وغیرہ ملیں گے مگر نہایت متقن اور محکم۔ مثلاً کہنا اتنا ہے کہ وہ لوگ جنھیں منقولات کے ساتھ تصوّف کا بھی ذوق ہے۔ ہمیشہ خدا کی حمد ایک کیف خاص میں کرتے ہیں۔ کہتا ہے :۔

"سرود سرایان عشرتکدۂ قال کہ بنورس سرابستان حال کار کام و زبان ساختہ بشہد ثنائے صانعے عذاب البیان اند کہ نغمہائے شکرین در رگ و پئے نے دوایندہ"۔

یہ جملہ دیباچۂ نورس[۵۲] کے ابتدا میں ہے۔ اس میں علاوہ حروف جارہ و روابط وغیرہ کے تقریباً ۲۲ لفظ ہیں اور صنائع بھی بائیس ہیں بلکہ زائد اگر اسکے بعد کے جملے سے متعلق کر دیا جائے۔ (۱) سرود سرا میں براعت استہلال ہے کیونکہ موسیقی کی کتاب کا دیباچہ ہے۔ (۲) سرود اور سرا میں صنعت اشتقاق ہے۔ (۳) سرود اور عشرتکدہ میں مراعات النظیر ہے۔ (۴) و (۵) نورس میں صنعت تحلیل اور ایہام تناسب ہے۔ (۶) و (۷) سرابستان میں اضافت مقلوب ہے اور مراعاۃ النظیر۔ (۸) و (۹) و (۱۰) قال و حال میں تضاد۔ مبادلۃ الراسین اور سجع ہے۔ (۱۱)

۵۱؎ سرکش کاف کے مد کو بھی کہتے ہیں۔ ۵۲؎ ابراہیم عادل شاہ نے ایک کتاب نورس علم موسیقی میں دکنی زبان میں لکھی تھی اور ملک قمی وغیرہ سے اُسکا فارسی میں ترجمہ کرایا تھا اور ظہوری سے دیباچہ لکھوایا تھا جو سہ نثر میں نثر اول ہے۔

کارد کام میں تجنیس لاحق ہے۔(۱۲) کام وزبان میں مراعات النظیر۔ (۱۳) شہد و عذب وشکرین مراعات النظیر۔(۱۴) رگ و پے مراعات النظیر (۱۵) و (۱۶) و (۱۷) پے و نے مبادلۃ الراسین۔ تصحیف۔ سجع۔(۱۸) شکرونی ایہام تناسب وغیرہ وغیرہ۔ غرض ظہوری کی ذات پر ان تمام تکلفات کا اس حیثیت سے خاتمہ سمجھنا چاہیئے کہ اس سے بہتر اس رنگ میں کوئی نثر نہیں لکھ سکا اسی وجہ سے صاحب خزانۂ عامرہ کی رائے ہے کہ "از جواہر زواہر گزرانیدہ"

نعمتخان عالی

عالی۔ میرزا محمد پسر حکیم محمد فتح الدین شیرازی۔ مقام ولادت ہندوستان۔ اورنگ زیب نے نعمتخان خطاب دیکے اپنا مصاحب اور ندیم مقرر کیا کہتے ہیں کہ جب تقرب زیادہ ہوا تو مقرب خان خطاب ملا۔ اسی عہد سلطنت میں انشا پردازی کا بھی موقع ملا۔ خصوصاً ظرافت کا جس کو عالمانہ انداز میں لاکے بہت بلند پایہ کر دیا۔ ایک مرتبہ ایک جیغہ زیب النسا بیگم کے یہاں بیچنے کو بھیجا۔ عرصے تک قیمت نہ ملی۔ یاددہانی کے طور پر لکھا:۔

ای بندگیت سعادتِ اخترِ من   در خدمتِ تو عیاں شدہ جوہرِ من

گر جیغہ خریدنے است پس کو زرِ من   در نیست خرید نی بزن بر سرِ من

زیب النسا ہنس دی اور جیغہ کے ساتھ پانچ ہزار روپیہ انعام دیے۔ بہادر شاہ اول کے زمانے میں اور بھی عزت بڑھی اور دانشمند خاں، خطاب ملا بلکہ شاہ نامہ تحریر کرنے پر مامور رہا مگر ۱۱۲۱ھ میں رحلت کر گیا اور وقائع نعمتخاں عالی۔ جنگ نامہ نعمتخاں عالی۔ مضحکات۔ مجموعہ قصائد و غزلیات وغیرہ یادگار چھوڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ دورِ آخر میں نعمتخاں عالی نظم و نثر دونوں میں ممتاز ہے۔ جنگ نامہ میں معظم و اعظم پسران اورنگ زیب کی خانہ جنگی کا حال لکھا ہے۔ فقرات اکثر اپنے زمانے کے مذاق کے موافق طویل ہیں اور مرادفات کی کثرت مگر پختگی ہر بدمذاقی کو

سنبھال لیتی ہے خصوصاً بے ثباتیِ دنیا اور فلسفیانہ مضامین جہاں ذکر ہوئے ہیں انکی متانت و جزالت بعض وقت قابل تتبع معلوم ہوتی ہے مثلاً ایک مقام پر کہتا ہے:-

"دنیا نمودے است بے بود، و بودے است بے وجود۔ عالم ہمہ اسم
است بل سراسر طلسم"

کاش یہ مذاق اگر اُسی وقت رائج ہو جاتا تو اینک ہندوستان کی فارسی انشا خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچتی۔ وقائع میں اورنگ زیب کے محاربات دکن کا ذکر ہے۔ رنگ سہ نثر ظہوری سے ملتا جلتا ہے مگر صنائع و بدائع میں زیادہ جھگڑا نہیں ہے۔ البتہ استعارات و تشبیہات و تلمیحات وغیرہ سے ایک خاص شوکت پیدا کرلی ہے۔ بعض فقرے طنزیہ بھی ہیں۔ خود شیعہ ہے اور شیعوں کا طرفدار۔ اورنگ زیب کی فوج پر زہر خند مختلف مقامات پر کی ہے جس کا اثر ہر شخص پر اُسکے ذوق کے موافق پڑتا ہے۔ مگر یہ طعن چونکہ صاف صاف نہیں ہیں بلکہ توریہ اور ایہام میں مخفی ہیں اس وجہ سے عبارت کسی قدر دقیق ہوگئی ہے۔ انداز بیان کی مثال ذیل کی عبارت سے واضح ہو جائیگی۔ کہنا اتنا ہے کہ جب صبح ہوئی اور آفتاب نکلا۔ اسکو یوں ادا کرتا ہے:-

"دمیکہ مدرس کشاف[1] صبح در صفۂ[2] صدق و صفا چوں قاضی بیضا[3] تفسیر
والشمس وضحٰہا بخط شعاعی آفتاب بر صفحۂ روزگار نگاشت"

اس کتاب میں جابجا نظمیں بھی ہیں جو نہایت صاف اور شیریں ہیں اور بیشتر مضحک۔ ایک مقام پر بادشاہ کو خبر ملی کہ فتح ہوگئی بعد کو غنیم نے دھاوا کردیا معلوم ہوا کہ خبر جھوٹی تھی اس کا حال نظم کرتا ہے:-

نوید فتح و ظفر چوں بپادشاہ رسید — نوائے عیش و طرب تا بمہر و ماہ رسید

---

[1] قرآن مجید کی ایک تفسیر کا نام ہے جس کے مصنف علامہ زمخشری ہیں۔
[2] خانقاہ میں ذکر کا مقام۔ [3] ایک مفسر کا نام جنکی تفسیر بیضاوی مشہور ہے۔

ز صدمہ گوش ملائک بر آسمان کر شد　　ز بسکہ نعرۂ شاباش و واہ واہ رسید

شگفتگی ز تبسم بخندہ منجر شد　　گذشت باز از آن ہم بہ قاہ قاہ رسید

بصحبتے شدہ مشغول ہر یکے طرفے　　ز کیفیت شادی بشان زود چون نگاہ رسید

یکے بہ بحث کہ فال مست آمدہ راست　　تمام شد غم دل حالت رفاہ رسید

اسکے بعد ہر ایک کے کوچ کا ارادہ مختلف پیرایوں میں دکھایا ہے کہ کوئی اونٹ مانگتا ہے کوئی گھوڑا تیار کراتا ہے:-

یکے گذشت کہ یالان بدوز اے ظالم　　چہ تنگ[1] فہمم انیست چوب و کاہ رسید

غرض ایک عجیب خلفشار ہے کہ ناگہاں

ز قلعہ گولہ افتاد اندرین اثنا　　کشیدہ نالہ اجل کشتہ کرد آہ ارسید

یکے بسان شتر جست و زیر سنگ خزید　　یکے چو شعلہ دوان شد کہ تا پناہ رسید

ہنوز بر لب او بود این سخن کہ دو سہ　　گلولہ دگر آمد بیارگاہ رسید

یکے بہ پشتہ بر آمد کہ من ببینم چیست　　بلند شد دو سہ گامے بقعر چاہ رسید

یکے گریست دگرے ایستاد کہ ہیچ نیابد　　از آن دو قوت گلولہ بقتل گاہ رسید

مدبرے بعقب رفت۔ دو بیت[2] الخلا دید　　بدید و گفت شکستے بہ ایں سپاہ رسید

درین معاملہ بودند تا خبر آمد　　کہ چشم[3] زخم عظیمے بفوج شاہ رسید

مضحکات میں دقت نظر بہت کرنی ہوتی ہے اور اسکے عبارات اور مطالب وقائع سے کہیں زائد دشوار ہیں۔ قصائد میں سلاست اور شیرینی بہت ہے البتہ مضامین عالیہ کی کمی ہو گئی ہے مگر یہ زمانے کا انقلاب ہے۔ عرفی و فیضی کے بعد سے فلسفیت اور مضامین بلند کا گویا خاتمہ ہی ہو گیا اور قصیدہ گوئی کا مذاق ہی بدل گیا۔ یہی غنیمت ہے کہ استادوں کی رنگ آمیزی میں حقیقت کو نہیں چھپاتا اور

۱؎ طنزیہ۔ ۲؎ تعبیر۔ ۳؎ نظر بد کا اثر۔

کیفیات کو شاعرانہ لہجے میں دلکش بنا کے نظم کر دیتا ہے۔ ایک تشبیب ملاحظہ ہو:۔

کشائش گرہ دل بہیچ باب نشد ۔۔۔ ہزار حیف کہ انگور ما شراب نشد
ز بیم طعنہ بہ میخانہ گرچہ شب رفتی ۔۔۔ عجب کہ جام بدست تو آفتاب نشد
شہید عشق ترا خلد جا و داں دادند ۔۔۔ ولے چہ سود کہ اجر یک اضطراب نشد
بہار خواست کہ گل را چو عارض تو کند ۔۔۔ شد انتظار کہ شدا ما بہ آفتاب نشد

ایک اور تشبیب کے اشعار تخئیلیہ رنگ میں نقل کئے جاتے ہیں:۔

بہ خلق احساں نمودن موجب اجر نکو باشد ۔۔۔ حنا از دستگیر بہائے مردم سرخرو باشد
صفائے خاطر آدم نمی باید سنگ و آہن را ۔۔۔ ز فیض پاکی طینت ببیں آئینہ رو باشد

غزل گوئی میں ایک خاص سوز و گداز ہے۔ اپنے زمانے کے مذاق کو لئے ہوئے بعض کیفیتیں نہایت دلکش بیان کر دیتا ہے مثلاً

چگونہ خار دل از سیر لالہ زار کشم ۔۔۔ ز تیغ تو ہست جراحت بہار کشم
بیک نگاہ تو جاں دادن آرزو دارم ۔۔۔ کہ انتقام فراقت ز روزگار کشم
ز بیم خوئے تو تا کے بدل فغاں و رزم ۔۔۔ ز جا نسے اگر دگر نالہ آشکار کشم

ایک غزل میں اپنی بیتی سناتا ہے اور نازک خیالی سے کلام میں ملاحت پیدا کرتا ہے:۔

عکس یارم کہ بیغمائے ندیدن رفتم ۔۔۔ عمر صبحم کہ بیک آہ کشیدن رفتم
تو بہ بودم کہ شکستے ہمہ جا پیش آمد ۔۔۔ مژدہ بودم کہ بتاراج شنیدن رفتم
جلوہ کردکہ از حسرت دل آب شدم ۔۔۔ قطرہ گشتم و آخر بچکیدن رفتم
از سر کوے دلم تا بتماشا گہ جاں ۔۔۔ قدمے بود کہ آنرا بطپیدن رفتم
خاک بودم کہ مگر باز گذارے بکند ۔۔۔ گلشنے گشتم و بیہودہ بچیدن رفتم
عالی افسوس کہ دادو ستد عمر خطا ست ۔۔۔ زر قلبم کہ بہ دشنام خریدن رفتم

ناصر علی سرہندی تخلص علی۔ ابتدا میں سیف خاں بدخشی صوبہ دار الہ آباد ۔۔۔ ناصر علی سرہندی

کی ملازمت میں رہا اور چند سال وہاں بسر کئے پھر سرہند چلا آیا مگر وہاں اطمینان سے رہنے نہ پایا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک دن شیخ محمد معصوم ایک باغ میں گئے دیکھا کہ **ناصر علی** تنہا ہے اور شراب نوشی کا سامان سامنے رکھا ہے پوچھا "یہ کیا" کہا کہ "یہ وہ شراب ہے جسے ملائکہ پیتے ہیں" شیخ غضبناک ہو کے واپس آیا اور صوفیوں اور عالموں نے اسکے واجب القتل ہونے کا محضر تیار کیا۔ **میر محمد زمان راسخ** اپنے رفیقوں کے ساتھ مسلح ہو کے آئے اور **ناصر علی** کو اپنی حفاظت میں دہلی لے گئے ورنہ جان نہ بچتی۔ دہلی میں بھی شغل مے نوشی جاری رہا۔ ایک دن باغ میں بیٹھا ہوا صراحی سے جام بھر رہا تھا اور شراب میں کف پیدا ہو رہا تھا۔ ناصر علی پر کیفیت طاری ہوا اور یہ شعر کہا :-

کدامیں مست را امشب سر جنگ است یا زاہد
کہ مینا ہم ز جوش مے زرہ زیر قبا دارد

کہتے ہیں کہ آخر عمر میں شراب سے توبہ کر لی اور شیخ محمد معصوم کا مرید ہو گیا تھا واللہ اعلم۔ **ذوالفقار خاں** بھی اسکے خاص قدر دانوں میں تھا۔ اول ملاقات میں جو مدحیہ غزل پیش کی اس کا مطلع آج تک مشہور ہے :-

اے شان حیدری ز جبین تو آشکار
نامم تو در نبرد کند کار ذوالفقار

اس غزل پر انعام میں تیس ہزار روپے پائے اور سب تقسیم کر دئے۔ **ذوالفقار خاں** کے ساتھ بیجاپور اور کرناٹک وغیرہ میں رہا اور اسی کے ساتھ پھر دہلی واپس آیا۔ اور قلندرانہ زندگی بسر کرنے لگا آخر ۲۔ رمضان ۱۱۰۸ھ کو رحلت کر گیا اور ایک دیوان اور مثنوی بطور یادگار چھوڑ دی۔ کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ نازک خیالی اور مضمون آفرینی کو حد اعتدال سے بڑھا دیا اور استعارات کی زنجیروں میں آزادی خیال کو جکڑ دیا۔ نزاکت ادا اور سلاست بیان کے خاتمہ کے سامان فراہم ہونے لگے "بھوٹ" ہی "بھوٹ" باقی رہ گئی لیکن استادانہ قوت ان سب باتوں پر جہاں پردہ ڈال دیتی ہے وہاں جدت ادا نقادوں کی نظر کو خیرہ

کرنے لگتی ہے اور شاعر کی عظمت قلوب میں راسخ ہو جاتی ہے۔ انداز کلام ملاحظہ ہو:۔

نیست غیر از عشق دل سوزے من افسردہ را　　شعلہ جنبش می دہد نبضِ چراغ مردہ را

عشق از پردہ بروں آمد و آوازم داد　　مژدہ از ہر دو جہان دور و بیروازم داد

کسیکہ در رہ جدائی کشیدہ می داند　　کہ خار خشک رگِ جان شاخِ عریان است

بعض اشعار کی تخیل اتنی پیچیدا ہوتی ہے کہ چیستان کی حد تک پہونچ جاتی ہے:۔

از بسکہ سنگِ تفرقہ ہا در سراغ ماست　　چوں شیشۂ شکستہ فروغ چراغ ماست

سرت گردم شکایت جوشی دگر دیدنی ہے　　نفس شوخ است مہر تازہ میخواہد زباں اینجا

یہ سب کچھ سہی مگر اپنے رنگ پر ناز ہے۔ مثنوی میں کہا ہے:۔

سخن را آفریدم جاں دمیدم　　باقرارِ خدائی بر گزیدم

الستے سر زد و از من بلیٰ گفت　　ملش یا عبدُہٗ و یا ربنا گفت

صاحب خزانہ عامرہ کا بیان ہے کہ اہل ذوق اس مثنوی کو پڑھتے تھے

اور مزے لیتے تھے:۔

بیدل

بیدل۔ میرزا عبد القادر عظیم آبادی۔ پٹنہ عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور ہندوستان ہی نشو و نما بھی ہوئی۔ آغاز شباب **شہزادہ محمد اعظم** پسر اورنگ زیب کی ملازمت میں گزرا اور منصب بھی پایا۔ ایک دن شاہزادے نے اپنی مدح میں قصیدہ نظم کرنے کی فرمائش کی۔ میرزا نے انکار کیا اور ملازمت ترک کر کے دہلی چلے آئے جہاں گوشہ نشینی میں بسر کر کے ۱۱۳۳ھ میں انتقال کیا اور اپنے گھر کے صحن میں دفن ہوئے۔ ترک دنیا کیوجہ سے انکی آخر عمر نہایت عزت سے گزری۔ بڑے بڑے امرا انکے چوکھٹ پر آتے تھے اور مستفیض ہوتے تھے۔ آصفجاہ دکن نے ایک مرتبہ شہرۂ کمال سنکر بلا بھیجا۔ جواب میں لکھوا دیا:۔

دنیا اگر دہند نخیزم ز جائے خویش　　من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

کلام میں جدید استعارے اور نئے تصرفات بکثرت ہیں بلکہ بعض ایسے ہیں کہ زباندانان عجم اُن پر اعتراض کرتے ہیں جیسے "خرام کاشتن" وغیرہ۔ نظم و نثر دونوں مذاق تصوّف میں زیادہ تر ہیں اور مضامین سے زائد عنوان ادا پیچدار اور دقیق ہوتا ہے۔ لیکن باایںہمہ اگر صاف اشعار علیحدہ کر لئے جائیں تو بلند نظری کی کافی سند ہیں۔ نئی نئی بحروں میں بھی اکثر غزلیں نظم کی ہیں مگر استعارہ اور تخییل در تخییل کا رنگ اسقدر غالب ہے کہ کلام اُلجھ کے رہ گیا ہے اور بعض اوقات بالکل چیستان ہو جاتا ہے۔
اگر خدانخواستہ یہ رنگ اور ترقی کرتا تو ہندوستان کے فارسی شاعر محض معمّا گو ہو کے رہ جاتے۔ اب ہم بعض نمونے انکے کلام کے پیش کرتے ہیں۔ نکات میں کہتے ہیں:۔

"اگر منکر نبوت نۂ باخطرات جز بہ تعظیم پیش میا و اگر بہ تجلی ایمان داری
بہ ہیچ جانب بے ادب چشم مکشا"

دیکھو یہ رنگ بالکل ظہوری سے رنگ سے برعکس ہے۔ مطالب بہت زیادہ ہیں اور الفاظ نہایت کم بلکہ قلّتِ الفاظ کی حد اس قدر قابل گرفت ہے کہ بعض اوقات محض مطالب جلیلہ پر اشارے کر دیتے ہیں۔ نظم میں بھی یہی حالت ہے۔ مثلاً کہنا اتنا ہے کہ اس دنیائے فانی میں ہمارا وجود دو عدموں کے درمیان ہے۔ شاعرانہ تخییل میں کہہ سکتے تھے "یعنے میانۂ دو سراب است ستیم" مگر پیچدار طبیعت استعاروں کی بیڑیاں پہنائے بغیر مضمون کو قید نظم میں لاہی نہیں سکتی کہتے ہیں:۔

بیدار ہئے میانِ دو خواب است ستیم　　　گردِ تخیّلِ دو سراب است ستیم

پہلا مصرعہ غزالی مشہدی کے شعر کا خلاصہ ہے۔ کہتا ہے:۔

شورے شد و از خوابِ عدم دیدہ کشودیم　　　دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ غنودیم

یہ خلاصہ کے مضمون غزالی سے بہت پست ہو گیا اور جو اپنا خیال تھا وہ اسیر زندان استعارات ہو گیا۔ صاف رنگ کے اشعار اسی غزل کے ملاحظہ ہوں:۔

از لطمۂ دو موج حبابے رمیدہ است — یعنے طلسم نقش بر آب است ہستیم
مغلوب آفتاب چو شد سایہ نایست — اندیشۂ کہ در چہ حساب است ہستیم
روشن نشد ز نسخۂ دل جز سواد وہم — مضمون جرم چہ کتاب است ہستیم
سرمایہ وقف غارت و امید محو یاس — یارب چہ جنس خانہ خراب است ہستیم

یہ سب کچھ سہی مگر ایک احسان بیدل کا ہندوستان کی شاعری پر یہ ضرور ہے کہ حقائق و معارف کی طرف قلوب کو متوجہ کر دیا ہے اور "بوس و کنار" وغیرہ سے جو مجازی عشق کے کیفیات ہیں طبیعتوں کو کوسوں دور ہٹا دیا ہے۔ صفویہ اور ہندیہ دور کے مابہ الامتیاز نتائج میں یہ نتیجہ بھولنے والا نہیں اگرچہ امیر خسرو کی سلطنت کے ارکان کو اپنے دربار میں بلایا ہے مگر لطف ادا خسرو ہی کو اولیت کا تاج پہنائے ہوئے ہے بحر متدارک میں کہتے ہیں۔

چہ بود سرو کار غلط سیقان در علم و عمل بفسانہ زدن
زغرور دلائل بیخبری ہمہ تیر خطا بہ نشانہ زدن
اگر بفلک طلبد ز زمیں و گرم بزمیں فگند ز فلک
بقبول طاعت حکم قضا نتواں در عذر و بہانہ زدن

محمد تقی خیال نے محمد شاہ کے زمانے میں اسمعیلیوں کو ہیرو بنا کے ایک افسانہ طویل دلکش فارسی میں تحریر کیا جسمیں بڑے بڑے مسائل علمیہ درج کر دئے ہیں اور ترویج علوم و عقائد کا وہ طریقہ اختیار کیا جسکی تقلید آج یوروپ میں کیجاتی ہے۔ یہ افسانہ نو جلدوں میں ہے اور بوستان خیال نام ہے۔ اکثر باتیں دور از قیاس بھی درج کی ہیں مگر زبان شیریں اور دلکش ہے اور جابجا اشعار درج ہونے سے زینت کلام دوبالا ہو گئی ہے۔ بوستان خیال

حزیں محمد علی بن ابیطالب شیخ زاہد جیلانی کی اولاد میں تھے ۱۱۰۳ھ میں شہر اصفہان میں پیدا ہوئے۔ چار برس کی عمر سے تحصیل علم میں مشغول ہوئے اور حزیں

تھوڑے ہی عرصے میں درجۂ اجتہاد پر فائز ہو گئے۔ فن شعر سے مناسبت خدا داد تھی اور بچپن ہی سے نظم کا شوق ہو گیا تھا۔ باپ چاہتے تھے کہ یہ شوق چھوٹ جائے تاکہ طلب علم میں حرج نہ ہو مگر مقتضیات فطرت کا انفکاک محال ہے۔ آخر فنِ شعر میں بھی کامل ہو گئے جب نادر شاہ کا حملہ ہوا تو ایران سے بھاگ کے ہندوستان میں آئے اور اپنی سوانحعمری یہیں تحریر کی۔ لاہور و دہلی میں کچھ عرصے تک رہے مگر یہ شہر نا پسند ہوئے۔ آخر بنارس آئے اور وہیں کے ہو رہے خود کہتے ہیں :۔

از بنارس نہ روم معبد عام است اینجا ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

۱۱ رجمادی الاولیٰ ۱۱۸۰ھ میں وفات ہوئی اور اپنے روضۂ فاطمان میں دفن کیے گئے قبر پر یہ اشعار انھیں کے خط میں کندہ ہیں :۔

حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم سرِ شوریدہ بر بالینِ آسائش رسید اینجا

روشن شد از وصالِ تو شبہائے تار ما صبحِ قیامت است چراغِ مزار ما

نثر کی تحریر سادہ اور دلکش ہے۔ واقعات کے بیان میں رنگینی یک قلم ترک کر دی ہے ہاں استعارات و تشبیہات مانوس سے کہیں کہیں عبارت کو زینت دیدی ہے۔ نمونہ کے طور پر وہ عبارت سوانحعمری کی نقل کیجاتی ہے جس سے انکی ابتدائی شاعری کا بھی اندازہ ہو جائیگا :۔

"روزے در مجلس والد علامہ جمعے از مستعدان منعقد بود و مراہم دران مجلس طلبیدند و از ہر جا سخنے درمیان بود کہ یکے از حاضران این بیت ملا محتشم کاشی را برخواند :۔

اے قامتِ بلند قدان در کمندِ تو رعنائی آفریدۂ قدِ بلندِ تو

بعضے از حضار تحسین بلیغ نمودہ۔ والد مرحوم فرمود کہ دیوان ملا محتشم بنظر من در آمدہ۔ استاد ست اما کلامش بے نمک است و آن مقدار حلاوت کہ تدارکِ بے نمکی کند ندارد و با آنکہ نمک در سخن شاید گلو سوز تر باشد از حلاوت چنانچہ از ہمیں

مطلع بلندیِ او این معنی مستنبط تواند شد و دیگر تنہا مصرع آخر درست اُفتادہ و مصراعِ اول بطبع مانوس نمی شود چہ "قامت" را "در کمند" افتادہ گفتن با سلیقہ راست نیست۔ اگر لفظِ "قامت" نبودے و گفتے "اے کہ بلند قدان در کمند تو"۔ این کلام پسندیدہ بودے۔ حاضران تصدیق نمودند۔ پس متوجہ من شدہ فرمودند کہ میدانم کہ ہنوز از شاعری باز نماندۂ۔ اگر توانی درین غزل بیتے گفت بگو۔ بہاں لحظہ مرا مطلعے بخاطر رسید و چون نظر ایشان بمن باز افتادہ دریافتند کہ در خاطر چیزے رسیدہ است۔ فرمودند کہ اگر گفتی بخوان و خجلت مکن۔ پس خواندم :-

صیدا ز حرم کشد خم جعد بلند تو   فریاد از تطاولِ مشکین کمند تو

حاضران از جا در آمدند و آفرینہا گفتند۔ تا ایشان در تحسین بودند مرا بیتِ دیگر بخاطر رسید و برخواندم :-

شد رشک طور زآمدنت کوے عاشقان   بنشین کہ یاد خوردہ جانہا سپند تو

درین مرتبہ والد علامہ از جا در آمد و تحسین کردہ فرمود کہ آنچہ گفتم در شعر ملا محتشم نیست و درین بیت ہست و من بیتے دیگر برخواندم :-

مشکل شدست کار دل از عشق و خوش دلم   شاید رسد بخاطرِ مشکل پسند تو

حقیقت یہ ہے کہ دورآخر کی خاتم شیخ علی حزیں کی ذات ہے۔ ہر صنف میں مذاقِ سلیم کے حدود قائم کردئے ہیں اور برسوں کے بگڑے ہوئے رنگ کو آبدار کیاہے۔ نثر میں روانی۔ غزل میں سوز و گداز قصیدے میں فصاحت کے ساتھ جزالت۔ مثنوی میں سلاست پھر سے واپس لائے ہیں۔ ہر صنعت کو اسی غرض سے استعمال کرتے ہیں جسکے لئے شریعت شاعری نے نافذ کیا ہے۔ لفاظی اور صنعت گری سے سراسر احتراز ہے۔ دیکھو حسن تعلیل کس لطف سے ادا کی ہے :-

جنوں را کار ہا باقیست با مشتِ غبارِ ما   کہ بازیگاہِ طفلاں می شود خاکِ مزارِ ما

حقیقت عشق کا بعد فنا قائم رہنا اور اپنے آثار کو ظاہر کرنا ایک مؤثر طریقے میں نظم کیا ہے اور لفظ "مزار" (زیارت گاہ) سے شہید عشق کی عظمت ظاہر کی ہے۔ یا شاید یہ خیال کہ حسن کی کشش تو عاشقانِ صادق اور ہوس پیشہ لوگوں کے لئے باعتبار صورت یکساں ہے البتہ آلامِ عشق کے جھیلنے کا اندازہ دونوں میں امتیاز کر دیتا ہے۔ اس مضمون کو نہایت دلکش الفاظ میں ادا کرتے ہیں:۔

نہ بہ جلوهٔ گل جانبِ گلزار مرا   می برد نالهٔ مرغانِ گرفتار مرا

بیخودی کی لذت کا اظہار ہے اور اگر خودی کا احساس رہے تو حیاتِ ابدی سے بھی انکار:۔

حیات آتش اشکام گر بخودی بستاندم ساقی   بجامے میفروشم شربتِ خضر و مسیحا را

اپنی گری ہوئی حالت کا اظہار اور معشوق کے تقرب سے اطمینان:۔

گرچہ ما سبزهٔ خوابیدهٔ این گلزاریم   سرِ ما در قدمِ سروِ خرامانے ہست

دنیا کو چاہئے کوئی لذت و عیش کا مقام سمجھے اور یہ خیال صحیح بھی ہو مگر جن کی فطرت میں ذوقِ عشق داخل ہے ان کی حالت یہ ہے:۔

قسمت آلودهٔ عیشیم گر گلشن زادیم   چہ دہانے نکشودیم کہ صیاد آمد

صوفیانہ رنگ میں اخلاقی نصیحت:۔

گذشت از خوردهٔ شبنم گل و ز غنچہ برگردان

بدولت میرسد ہر کس کہ از زر دست بردارد

سعادت است ابا ۱۲

دیوان حزیں دیکھنے سے معلوم ہوا ہے کہ ان کی کوشش یہ نہیں کہ خواہ مخواہ طویل غزلیں نظم کریں اور ہر قافیہ کو کسی نہ کسی طرح باندھیں بلکہ جتنے شعر کسی زمین میں مزے کے نکل آتے ہیں انھیں پر اکتفا کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت کلیات پیشِ نظر نہیں ورنہ مثنوی اور قصائد کے بارے میں بھی لکھا جاتا۔

غالب[1] دہلوی۔ نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان عرف میرزا نوشہ

---

[1] تفصیلی حالات "یادگارِ غالب" مؤلفہ شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی میں ملیں گے۔

۱۲۱۲ھ میں بمقام اکبرآباد پیدا ہوئے۔ پانچ برس کے تھے کہ انکے والد ماجد عبداللہ خاں ایک جنگ میں کام آگئے اور نصراللہ خاں چچا نے پرورش کا بار اپنے ذمّے لیا۔ نو برس کے تھے کہ وہ بھی مر گئے اور عرصے تک نہایت فقر و افلاس میں زندگی کاٹنی پڑی۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں رسائی ہونے سے چھ سو روپیہ سالانہ بطور وظیفہ مقرر ہوا۔ آخر میں واجد علی شاہ اودھ نے بھی پانچسو روپیہ سالانہ مقرر کردئے مگر قسمت سے دونوں کی سلطنت جاتی رہی اور پھر تنگدستی کا سامنا ہوا مجبوراً رامپور گئے۔ اور نواب صاحب کی اُستادی کے معاوضے میں دو سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے لیکن دہلی کی جدائی شاق تھی نوکری چھوڑ کے واپس آئے۔ سرکار انگلشیہ سے جو پنشن جاری ہوئی اُسی پر قناعت کی۔ آخر ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا اور فارسی میں حسب ذیل تصانیف چھوڑے (۱) دستنبو۔ (۲) قاطع برہان۔ (۳) پنج آہنگ۔ (۴) مہر نیمروز در تاریخ سلاطین دہلی از تیمور تا ہمایوں۔ (۵) دیوان غزلیات و قصائد وغیرہ کہتے ہیں کہ میرزا کی ابتدائی تعلیم ایک پارسی موبد نے دی تھی جو مسلمان ہو گیا تھا اور شیخ عبدالصمد کہلاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبان سے اُنس فطری ہو گیا تھا اور خالص و فصیح فارسی کے دلدادہ تھے اور اُسی کو زندہ کرنا چاہتے تھے مگر ہندوستان میں اس زبان پر اتنے رنگ چڑھ چکے تھے کہ میرزا کو اپنی کوشش میں کامیاب ہونا دشوار ہو گیا تھا۔ غدر ہندوستان کے حال میں دستنبو اسی خیال سے تصنیف کی اور پوری کوشش کی کہ عربی وغیرہ کا کوئی لفظ نہ آئے مگر بعض جگہ ادھورے رہ گئی۔ البتہ بعض مقامات پر نہایت صاف عبارتیں بھی تحریر کی ہیں جو اس کتاب کا بہترین حصہ کہلانے کے قابل ہیں۔ مثلاً

"نخستیں بار کہ آں چیدہ دستیزان چنانکہ گفت آمد آمدند تنگ تنگ

آوردہ بودند کہ بجویدادند ہمہ یکباز سران پیچیدہ بودند بر آستان شہریار ہشادند۔

زود دید روزانہ سبا ... سپاہ و از ہر رہگذرے لشکرے و از ہر سوئے اردوئے"

گرد آورد و بدین سرزمین روان داشت۔ چوں شاہ سپاہ را نتوانست راند سپاہ فرود آمد و شاہ فرو ماند۔

شاہ را در میاں گرفت سپاہ   دین گرفتن بود گرفتن ماہ
ماہ نو ہیچکہ نمیگیرد   جز مہ چاردہ نمیگیرد
شاہ ماہ گرفتہ را ماند   نہ کہ ماہ دو ہفتہ را ماند

نظم میں **غالب** کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ابتدا میں **بیدل** اور **ناصر علی** کی عام پسندی نے انھیں بھی دھوکا دیا مگر رفتہ رفتہ **حافظ** و **سعدی** کے دلدادہ ہوئے اور کلام میں اثر خاص پیدا کر لیا۔ قصیدہ۔ غزل۔ مثنوی۔ رباعی ہر صنف میں کمال دکھایا ہے اور ہندیوں کو نظر اہل ایران میں سرخرو کیا ہے۔ کسی نے خوب کہا کہ ہندوستانیوں میں فارسی شاعری ایک ترک لاچین (امیر خسرو) نے شروع کی اور ایک ترک ایبک (میرزا غالب) نے ختم کر دی۔ خود کو بھی اپنی فارسی شاعری پر ناز ہے۔ ایک شخص پر طنز آگے کہتے ہیں:۔

ایکہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتۂ   کے بہ تیر گوئی فلاں در شعر ہمسنگ منست
راست گفتی لیک میدانی کہ نبود جائے طعن   کمتر از بانگ دہل گر نغمۂ چنگ منست
فارسی بین تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ   بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست
راست میگویم من و از راست نتواں سر کشید   ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ منست

طنزیہ رنگ میں ایک خاص مزہ ہے۔ زاہدان ریائی کی حیثیت سنو:۔

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار   ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند   حق را بسجودے و نبی را بدرودے

قصائد میں سلاست اور روانی انکے لئے مخصوص ہے۔ افسوس کہ قاآنی کا کلام آخر وقت میں انکے پاس پہونچا ورنہ خدا جانے کیا کرتے۔ ایک تشبیب کے چند اشعار سنو:۔

گفتم حدیث دوست بقرآں برابرست   نازم بہ کفر خود کہ بہ ایماں برابرست

بے دستگہ نیم کہ ہنوز از ہوائے وصل | شوریست در سرم کہ بہ سامان برابر ست
با چارہ گر مگوئے کہ تیمار بیش کش | دردیست در دلم کہ بہ درمان برابر ست

معرفت کی حد دیکھو:۔

تن زن زشکر وشکوہ کہ در مسلکِ رضا | راحت بہ رنج و سود بہ نقصان برابر ست
ترکِ وجود گیر سخن در سجود چیست | بگزر ز طاعتے کہ بہ عصیان برابر ست

غزلیت میں شوخی اور بلند خیالی دیکھو:۔

یا رب جبین کیست کہ از بس سجدہ سود | باقی بابروئے مہ کنعاں برابر ست

تمام قصائد اسی کیفیت سے لبریز ہیں اور ہر قصیدہ تنقید بسیط چاہتا ہے مگر اختصار مانع ہے۔ بزرگانِ دین کی مدح میں ایک خاص جوش اور سرمستی ہے جسکی مثال کے لئے ایک ترکیب سے ایک بند درج کیا جاتا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے:۔

غالبا حسنِ عقیدت بر نتابم بیش ازیں | ہم زخود بر خویش منت بر نتابم بیش ازیں
نیست زاسمائے الٰہی بر زبانم جز علی | بیخودم بارِ محبت بر نتابم بیش ازیں
بستہ ام دل در ہوائے ساقیٔ کوثر بخلد | طعنۂ از حوران جنت بر نتابم بیش ازیں
در نجف وقتِ نماز آرم بسوئے کعبہ روئے | قیدِ قانونِ شریعت بر نتابم بیش ازیں
عاشقِ شاہم نہ کافر عشقِ شاہاں کفر نیست | از غلط فہماں شماتت بر نتابم بیش ازیں
چوں بخواہم روئے ننماید نہم بر مرگ دل | جان گدازیہائے حسرت بر نتابم بیش ازیں
بودہ ام رنجور تا ذوقِ سلوکم روئے داد | لاجرم رنجِ ریاضت بر نتابم بیش ازیں

از فنا فی الشیخ مشہودم فنا فی اللہ باد
محو گشتم در علیؑ دیگر سخن کوتاہ باد

غزل کی سرزمین کی آخری فرمانروائی اپنے ہاتھ میں لے لی ہے تصوف کے رنگ میں ڈوبتے ہیں تو یوں کہتے ہیں:۔

اے بجلا و ملا خوے تو ہنگامہ زا　　با ہمہ بے گفتگو بے ہمہ با ماجرا
شاہدِ حسن ترا در روشِ دلبری　　طرۂ پرخم صفات موے میان ما سوا
بزم ترا شمع و گل خستگیِ بو تراب　　ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

شوقِ دیدار کا جوش دیکھو:-

ز من گرت نبود باور انتظار بیا　　بہانہ جوے مباش و ستیزہ کار بیا
بیک دو شیوہ ستم دل نمی شود خرسند　　بمرگِ من کہ بسامان روزگار بیا
وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد　　ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

جدّتِ تخیل اور تازگیِ بیان کا اندازہ کرو:-

دماغِ اہلِ فنا نشۂ بلا دارد　　بفرقم اثرِ طلوعِ پرِ ہما دارد
دلم فسردہ بیفزا بوعدۂ ذوقِ بلا　　چراغِ کشتہ ہمان شعلۂ خونبہا دارد
دل بہ تنہا ز فراقِ تو فغان ساز دہد　　رفتنِ عکسِ تو از آئینہ آواز دہد
دل چہ بیند ستم از دست نشاط آغازہ　　شیشۂ ساز نیست کہ تا بشکند آواز دہد
آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است　　بردار توان گفت و بہ منبر نتوان گفت

ہم نہایت حسرت کے ساتھ یہ تذکرہ ختم کرتے ہیں۔ ہجومِ افکار نے دل توڑ دیا ہے۔ حادثاتِ روزگار روح فرسائی کر رہے ہیں۔ نثر میں اس کثرت سے کتابیں تصنیف ہوئی ہیں ان کا ذکر خود ایک مستقل کتاب کا طالب ہے۔ مآثر الامرا۔ شاہجہاں نامۂ عبدالحمید لاہوری۔ سیر المتاخرین کی ایسی کتابیں فنِ تاریخ میں۔ مدارج النبوۃ۔ جذب القلوب الی دیار المحبوب وغیرہ سیرت میں۔ طبِ اکبر۔ مفرح القلوب۔ اکسیر اعظم وغیرہ طب میں۔ تحفۂ اثنا عشریہ۔ عبقات الانوار۔ جواہر عبقریہ وغیرہ علمِ کلام میں۔ غرض ہر فن میں مستقل تصانیف بیش بہا ہندوستان نے فارسی لٹریچر میں اضافہ کئے ہیں۔ یہ کوشش محض مسلمانوں تک

محدود نہیں رہی بلکہ ہندوؤں نے بھی ایسے عمدہ تصانیف یادگار چھوڑے ہیں کہ شاید و باید۔ ٹیک چند بہار کی بہارِ عجم سے آج کسے استغنا ہے۔ اسی طرح لچھمی نرائن۔ آنند رام چندر بھان وغیرہ کے مساعی جمیلہ سرمایۂ ناز ہیں۔ ان سب کا تنقیدی اور تحقیقی ذکر انشاء اللہ کسی مستقل تصنیف میں کیا جائیگا۔

برہمن آخر میں ہم چندر بھان برہمن کا کسی قدر ذکر کرتے ہیں تاکہ ہندوؤں کے کمال کا کسی قدر اندازہ ہو جائے۔ اس کی انشائے چار چمن ایک مجموعہ مکاتیب و نکات صوفیہ و مسائل فلسفہ ہے۔ نثر کا حصہ سلیس فارسی میں ہے مگر وہی فارسی جس پر ہندوستان کا رنگ چڑھا ہوا ہے مثلاً لاہور کی عمارتوں وغیرہ کا حال لکھا ہے:-

"عمارات منازل جنت شمائل سرکار نواب نامدار کہ مقتضائے حسن
مکان و وسعت فضا و غایت صفا با نواع آرائش و آراستگی یاد
از قطعۂ بہشت می داد تماشا نمودہ در ہر مکان و ہر محل دعائے دولت
نواب فرشتہ صفات را ورد زبان ساخت"

نظم نہایت صاف اور دلکش ہے۔ خصوصاً غزل میں ذوق سلیم کا ہر شعر شاہد ہے:-

دارم دلے کہ ترک تمنا گرفتہ است دست نسیم دامن صحرا گرفتہ است

وحشت عشق کی کیفیت حقیقت یہ ہے کہ نہایت لطیف پیرایہ میں بیان کی ہے۔ آگے کہتا ہے:-

ہرگز نمی فتد بزمیں طفل اشک من مانند موج دامن دریا گرفتہ است
بر قامتش نظر فگن و بر کنارہ باش زین آتش بلند کہ بالا گرفتہ است

باخویش ساختیم برہمن کہ روزگار
با اہل درد ترک مدارا گرفتہ است

مثنوی میں واقعات کے بیان سے کمال معلوم ہوتا ہے۔ اُلجھاؤ سے بچنا اور حقیقت کو شاعری کے پردے میں نہ چھپا لینا یہی خوبی ادا کی نشانی ہے۔ دیکھو باغ کی تعریف کس لطف سے کرتا ہے:—

دریں گلشن زگلہا دستہ دستہ — صبا در ہر طرف گلدستہ بستہ
ہوایش دلکشا و دل نشین است — طراوت خانہ زاد این زمین است
شگفتہ ہر طرف گلہائے لالہ — گرفتہ بر کفِ عشرت پیالہ
چو دیدم آب و رنگِ بوستاں را — صلائے عیش دادم دوستاں را
زباں در وصفِ گل بیتاب گردید — سخن تا بر لب آمد آب گردید

باب دوازدہم

قاچاریہ

دولت نادر شاہی کے خاتمے پر ہم لکھ چکے ہیں کہ ایران میں قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا تھا اور ہر طرف بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی۔ آخر ۱۱۸۰ھ میں کریم خان زند بادشاہ ہوا جس نے بیس برس تک نہایت نیک دلی اور انصاف کے ساتھ سلطنت کی مگر مستقل امن و امان آقا محمد خاں قاچار کے تسلط سے (۱۲۱۰ھ) میں ہوا اور ایران کے مختلف ولایات کی دوبارہ شیرازہ بندی اسی بانی سلطنت قاچاریہ کی ذات سے شروع ہوتی ہے جو کسی نہ کسی صورت میں آجتک قائم ہے۔ آقا محمد خاں کے قتل ہو جانے کے بعد فتح علی شاہ قاچار کا نام تاریخ ایران میں روشن نظر آتا ہے اور عدالت و نظم و نسق کا عمدہ عہد قائم ہوتا ہے اگرچہ آخر عمر میں تھوڑا سا نقصان بھی ہوا یعنی عاشق آباد وغیرہ سلطنت روس میں شامل ہوگئے اور لشکر روس نے شاہ ایران کو شکست دی۔

کریم خان زند

آقا محمد خان قاچار

فتح علی شاہ قاچار

محمد شاہ قاچار کا دور اس کے بعد شروع ہوا مگر کوئی خاص بات ایسی نہیں معلوم ہوتی جو درج کی جائے۔ البتہ تربیت فنون و علوم جو فتح علی شاہ نے اعلے پیمانے پر شروع کردی تھی اس زمانے میں بھی قائم رہی۔ ۱۲۶۴ھ سے ناصر الدین شاہ قاچار کی حکومت کا آغاز ہوا اور یہ عہد سلطنت ایران کی عظمت قائم کرنے میں نہایت کامیاب ثابت ہوا۔ علوم و فنون کی ترویج ہوئی اور بکثرت تصانیف نظم و نثر میں شائع ہوئے۔ بادشاہ کے ہاتھ میں عنان حکومت اٹھارہ برس کی عمر میں آئی اور ۴۹ برس تک برابر مہمات ملکداری انجام دیئے۔ فرقۂ بابیہ کا

محمد شاہ

ناصر الدین شاہ

استیصال اور میرزا علی محمد باب اور قرۃ العین وغیرہ اس فرقے کے سرگروہوں کا قتل اس زمانے کے اہم واقعات سے ہے۔ ناصر الدین شاہ نے دوبارہ سفر یوروپ کیا اور ممالک خارجہ سے دوستانہ تعلقات قائم کرکے سفارت خانے کھولے۔

مظفر الدین شاہ — آخر میرزا محمد رضا نے باب نے ۱۳۱۳ھ میں شہید کیا۔ مظفر الدین شاہ ان کے فرزند جب جانشین ہوئے تو ایران میں حریت کا جوش پھیلا اور آخر میں رعایا کو سلطنت

محمد علی شاہ — مشروطہ مل گئی۔ ۱۳۲۴ھ میں انکا بیٹا محمد علی شاہ وارث ہوا مگر مشروطہ سے مخالف ہونے کی وجہ سے چار سال کے بعد معزول کردیا گیا اور اسکا بیٹا

احمد شاہ — احمد شاہ برائے نام بادشاہ بنایا گیا۔ جب یہ بڑا ہوکے صاحب اختیار ہوا تو ملک سے غافل ہوکے یوروپ میں عیش کرنے لگا۔ بالآخر جمادی الاول ۱۳۴۴ھ (مطابق نومبر ۱۹۲۵ء) میں اسے معزول کرکے سردار رضا خاں مازندرانی کو صدر سلطنت جمہوریہ قرار دیا

رضا شاہ پہلوی — ۱۲۔ شوال ۱۳۴۴ھ (مطابق ۲۵- اپریل ۱۹۲۶ء) کو رضا شاہ پہلوی

اور خاتمہ عہد — کا لقب اختیار کرکے تاجدار ایران ہوئے اور دور

قاچاریہ — قاچاریہ کا خاتمہ ہوکے عہد پہلویہ کا آغاز ہوا۔

لٹریچر پر انقلاب — عہد قاچاریہ میں جو انقلاب نظم ونثر میں ہوا وہ نہایت عظیم الشان ہے مغربی ممالک سے تعلقات بڑھ جانا متاخرین کی بیجا ارترکیبوں اور تخیلیوں سے پریشان ہونا۔ شاہنامہ اور مثنوی معنوی کی طرز کا پسند آجانا۔ ان تمام امور کا نتیجہ یہ ہوا کہ انشائے عجم کی کایا پلٹ گئی۔ عہد تیموریہ کی نازک خیالی اور دورۂ صفویہ کی معاملہ بندی دونوں سے طبیعتیں ہٹ گئیں۔ کسی رنگ کو پریشان گوئی کہنے لگے کسی کو بیہودہ سرائی۔ بلکہ صاحب مجمع الفصحا کے خیال میں فارسی شاعری پستی کے بدترین درجے پر پہنچ گئی تھی کہ عہد قاچاریہ کے شعرا نے اپنا رنگ بدلا۔

کسی نے فردوسی واسدی کی تقلید شروع کی۔ کوئی عنصری و مسعود سعد کا متبع ہوا۔ بعض شاعر بزمیات سعدی و نظامی سے سیکھنے لگے حکیمانہ مذاق کے لوگ ناصر خسرو کو پیشوا ماننے لگے۔ اہل معرفت نے سنائی اور مولانا روم کی تقلید شروع کی غرض

لکھی تھی بخت میں گردش جو صورت پرکار — پھر آگئے اسی مرکز پہ ہم جہاں سے چلے

اس میں شک نہیں کہ متقدمین کا کمال اظہر من الشمس ہے لیکن جو وجوہ اُن کے کمالات کے فروغ کے لئے پیدا ہوئے اور انقلابات روزگار کی وجہ سے جو حالات اُن کے پیش نظر آتے تھے اور جن کیفیات سے اُن کے قلوب متاثر ہوتے تھے اُس کا نتیجہ نظم و نثر میں ظاہر ہوتا تھا۔ شعرائے قاچاریہ کا کلام مجمع الفصحا میں دیکھا۔ بیشتر متقدمین کی نقالی ہے اور اس نقالی کا شوق اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ متروک محاورات۔ مذموم تعقیدیں۔ کرخت تلفظ۔ اکھڑی ہوئی ترکیبیں بھی اختیار کرلیں ہیں۔ اگر متاخرین استعارہ بازی اور بوس و کنار کے دلدادہ ہو کے تباہ ہوئے تو معاصرین پر یہ مصیبت نازل ہوئی۔ سچ ہے کہ افراط و تفریط دونوں بری چیزیں ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مرادف الفاظ و فقرات کا بار بار لانا یا سلاست ادا کو استعاروں کی گتھیوں میں الجھا دینا اچھا ہے لیکن اتنی قدامت پرستی بھی بیکار ہے کہ اُن حالات و کیفیات کے پیدا کئے بغیر اُن کے دائرے میں قدم رکھا جائے یا اُن کی کمزوریاں اور لغزشیں بھی ہنر سمجھ کے اختیار کرلی جائیں۔ بہر تقدیر زبان کا صاف ہونا ضروری تھا خصوصاً نشر علوم و فنون کی راہ میں متاخرین کا اسلوب بیحد حائل ہو گیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ انقلاب آیندہ کوئی عمدہ صورت اختیار کرے۔ بیشتر شعرائے حال معنویت کی طرف کم جاتے ہیں اور لفاظی کو ساری کائنات سمجھتے ہیں۔ بعض سادگی ادا کی طرف

اتنا جھکے ہیں کہ "دندان تیغ جملہ درو بانند + چشمان تو زیر ابروانند" کے حدود کے قریب پہونچ گئے ہیں ہاں! بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی صنف میں امتیاز پیدا کیا ہے اور اپنے عصر کے انقلاب کو قائم رکھکے نظم ونثر میں فروغ حاصل کیا ہے۔ ایسے چند لوگوں کا بلا امتیاز جاہ ومنصب ذکر کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین اندازہ کرلیں کہ اس رجعت قہقری کی بہترین صورت کہاں تک پہونچی ہے۔ "قاآنی" البتہ اس عہد کا مایۂ ناز ہے جس کا حال کسی قدر تفصیل سے لکھا جائے گا۔ ایک امر اور یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ مذہبی تصانیف اس دور میں بھی ہوتی ہیں مگر علما کی عبارت ان انشا پردازوں سے بالکل جدا ہے۔ خصوصاً مسائل فقہ تو ایسی عجیب طرز میں لکھے جاتے ہیں کہ سمجھنا دشوار ہوجاتا ہے کیونکہ اصول فقہ کی تحقیق اس دور میں حد کمال تک پہونچ گئی ہے اور علمائے ملت کا ذوق اس فن شریعت کی طرف اس قدر بڑھ گیا ہے کہ سیدھے سے سیدھا مسئلہ بھی اصولی اور منطقی زنجیروں میں جکڑا نظر آتا ہے۔ کاش! یہ طبقہ بھی سادہ نویسی کی طرف مائل ہوجائے تو دورۂ حاضرہ کا انقلاب یکساں نظر آئے۔ اب ہم فتحعلی شاہ کے زمانے سے چند خاص خاص شعرا اور مصنفین کا حال شروع کرتے ہیں کیونکہ اسی وقت سے اطمینانی حالت ایران میں پیدا ہوئی اور یہ انقلاب ظاہر ہونے لگا۔

صبائے کاشانی **ملک الشعرا صبا کاشانی** فتحعلی خاں نام فتحعلی شاہ کے زمانے میں سرگروہ شعرا تھے۔ رعایات لفظی ومعنوی کا بہت شوق ہے مثنویاں۔ شہنشاہ نامہ وخداوندنامہ وغیرہ نظم کیں اور قصائد مدحیہ بادشاہ اور امرا کی تعریف میں

عندلیب لکھے۔ ان کے بیٹے **عندلیب** بھی بعد کو ملک الشعرا ہوئے تھے۔ دونوں کا کلام ایران میں شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ چند منتخب اشعار نقل کئے جاتے ہیں

جن سے اندازہ ہوگا کہ دورِ جدید کے پیشروؤں کو اسی رنگ کا ہونا چاہیئے۔
ایک توحیدیہ قصیدے کی ابتدا یوں کی ہے :۔

تعالیٰ اللہ خداوند جہاندار جہاں آرا — کہ روشن آشکارا گل ز خارا و گوہر از خارا
مرصع کرد بر چرخ زبرجد گوہر انجم — معلق کرد بر خاک مطبق گنبد مینا
ز فعلش شاہدِ شام آمدہ با طرۂ تیرہ — ز فیضش بانوے بام آمدہ با غرۂ غرا
نشاندہ باغبانِ قدرتش در روضۂ ہستی — ہزاران سرو مہ منظر ہزاران ماہ سرو آسا [صبح ۱۲] [پیشانی روشن ۱۲]
بغمزہ غارتِ تقویٰ بایما آفتِ ایمان — بسیما لالۂ سوری بگیسو عنبر سارا
ہمہ کافر ولے آتش فروزِ ملتِ مؤمن — ہمہ نادان ولے سرمایہ سوزِ دانشِ دانا
وجودِ اوست چوں دریا وجودِ ما ہمہ امواجش — ولے گر نیک بینی نیست موجے بجز دریا

خداوند نامہ میں جنگِ خندق کے حال میں اس مقام سے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں جہاں عمرو بن عبدود مبارز طلب ہوا ہے اور علیؑ بن ابیطالب نے رسولِ مقبول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اذنِ جہاد مانگا ہے :۔

کہ شیرِ خدا یال یازید چست — کہ شاہا منم آنکہ ببرد و جست
پیمبر بدو گفت کہ عمرو است ایں — کہ دستِ علی آختہ ز آستیں
علی گفت کاے شاہ اینک منم — کہ یک بیشہ شیر است در جوشنم
براو آفریں خواند و خواندش بمہر — کہ یار تو بادا ایزد گردان سپہر
بسر بست دستار از پاک دست — کشادِ دو گیتی نہانش بہ بست
ہمش داد شمشیرِ رخشاں بجنگ — ہمش گفت فیروز بادی بجنگ
پس آن شیرِ یزداں پیادہ چو شیر — بمیدانِ آن اہرمن شد دلیر
چو با او زمین و ہوا گشت تنگ — بیاورد ہمرا بمیدانِ جنگ

حقیقت میں یہ مثنوی بے نظیر ہے۔ لہجہ اور زور بالکل فردوسی کا ہے بلکہ

لطف شاعری کے ساتھ ساتھ روایات کا نہایت صحیح ترجمہ کیا ہے اور حتی الوسع بضرورت شاعری بھی حقیقت سے زائد نہیں لکھا ہے۔ بعض مقامات پر لفظی ترجمہ نہیں ہے مگر غرض اور اصلیت وہی ہے جسے "زبان حال" سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ مثلاً اسی مکالمہ میں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ھذا احمد! اور امیر المومنین نے جواب دیا تھا وانا علیّ لیکن ان مختصر الفاظ میں سوال و جواب سے غرض دونوں کی شجاعت کا اعلام ہے۔ شاعر نے پہلے مصرعوں میں ترجمہ رکھا اور دوسرے مصرعوں میں بزبان شاعری تفسیر کردی ہے۔ فافہم۔

نشاط اصفہانی — **میرزا عبدالوہاب نشاط اصفہانی** (المتوفی ۱۲۴۴ھ) فتحعلی شاہ کے دربار میں نہایت معزز تھا اور معتمد الدولہ خطاب تھا۔ فلسفیانہ رنگ اسکی ذات سے اس دور میں مقبول ہوا۔ صاحب مجمع الفصحا کا خیال ہے کہ اس جامعیت کا آدمی مشکل سے ملتا ہے۔ فصاحت کلام اور شوخی طبع میں بھی کسی سے کم نہ تھا۔ ایک مرتبہ موسم بہار میں عید آئی ہے۔ اس نے قصیدہ نظم کیا اور اس کی تمہید میں اس کا نقشہ دکھایا:-

یر الہ ژالہ می چکد از ابر شکفام — خوش تر ز ژالہ بادہ و بہتر ز لالہ جام
صبح است و بزم عید و مے و مطرب و نبید — دولت مدید و بخت سعید و جہاں بکام
گلزار را طراوت و ایام را نشاط — افلاک را سعادت و آفاق را نظام
باشد حلال توبہ نباشد اگر زمے — باشد حرام بادہ نباشد اگر بجام

متاخرین کی نازک خیالی کا رنگ اس کے کلام میں کبھی کبھی آجاتا ہے چنانچہ اس قصیدے میں بھی یہ شعر کہہ گیا ہے:-

از فیض باد و لطف ہوا جاودان زید — نقشے اگر بر آب نگارند در منام
(خواب ۱۲)

حکیمانہ مذاق خاص طور سے محبوب تھا۔ آفرینش کے حال میں ایک قصیدے کی

تمہید کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں :۔

بزمِ غیب از شمع ذاتش چوں منور داشتند
پردہ دارانِ صفاتش پردہ بردر داشتند
خواست برنامحرماں پیدا شود حُسنِ ازل
محرمانش صدرہ از اوّل نساں تر داشتند
شاہدانِ غیب را دادند اطوارِ ظہور
روئے شاں پس در ظہورِ خویش مضمر داشتند
خامۂ اظہار چوں بر لوحِ امکان نقش زد
از نخستیں صورتِ نوری مصوّر داشتند
گاہ خوانندش محمدؐ گاہ گویندش علیؑ
گر بعقلِ اوّلیں اورا مُعبّر داشتند
نفسِ کُل کز سایہ اش طبعِ ہیولیٰ پایہ یافت
مقتبس از نورِ آں فرخندہ جوہر داشتند
واندراں نور آنچہ از نقصان و پستی یافتند
عرش نامیدند و زاں کرسی فروتر داشتند
وز کفِ دودِ ہیولیٰ از پسِ بگداختن
چرخِ اخضر برفراز ارضِ اغبر داشتند

خیر و شر کے متعلق کہتا ہے :۔

پیشکارانِ ازل کز پیشگاہ لم یزل
نفعہا ہر سو رواں در دفعِ ہر ضر داشتند
تا نگوئی خیر و شر بے عزمِ شاں آمد پدید
یا نپنداری کہ بے موجب سرِ شر داشتند
فعلِ شاں بر مقتضائے قابل آمد در وجود
زاں تکلش خواستند آں دیں ستمگر داشتند

می نہ بینی شیشہا را بیش و کم نزدیک و دور   در خورِ خود پرتوے از تابشِ خور داشتند

انبساطاتِ وجود از اعتباراتِ حدود   ہمچو ظل در قرب و بُعدِ مہرِ نور داشتند

ور بگوئی اعتبار سے کے اثر آمد پدید   گویم ایں آثار ہم اوہام مظہر داشتند

گریز دیکھو کتنی صاف ہے :-

از پئے نظمِ دو عالم در پئے ہم یک بیک   شاہ بر شاہ و پیمبر بر پیمبر داشتند

در ظہورِ احمدی ختمِ نبوت تو استناد   سلطنت را ختم بر شاہ مظفر داشتند

غرض اس قسم کی تمہیدیں اکثر نشاط کے کلام میں ملیں گی اور ظاہر ہو جائے گا کہ یہ دور کتنا متقدمین کا دلدادہ اور متاخرین سے کشیدہ ہے۔

وصال شیرازی - مرزا شفیع نام اور مرزا کوچک لقب۔ خوبصورت اور خوش آواز شاعر تھا۔ روحانیت میں میرزا ابو القاسم شیرازی سے ارادت تھی۔ اس کی محفل میں اصحابِ حال کا مجمع رہتا تھا۔ خوشنویسی میں بھی کمال تھا اور بڑے بڑے خطاط استاد مانتے تھے۔ ناموافقت زمانہ نے گوشہ نشین کرا دیا تھا۔ ۱۲۶۲ھ میں انتقال کیا۔ ایک دیوان قصائد و غزلیات کا یادگار رہے اور ایک مثنوی وحشی کی شیرین و فرہاد کا تتمہ اور ایک پوری مثنوی بزم **وصال**۔ ناظرین کے لئے ایک مشکل ردیف کا قصیدہ منتخب کیا جاتا ہے۔ ممدوح کی تعریف میں کہتا ہے :-

چو جوہر است شگرف از نبار آتش و آب   بہم و ماد از و افتخارِ آتش و آب

بطبع دیوی بہار و برنگ روی نگار   نہے بہائے بہار و نگارِ آتش و آب

بلون گوئی لعلست یار عنبر بان   ببوے گوئی مشکست یارِ آتش و آب

کند بجائے حشم و کند بجائے رفق   شگفت نیست کہ ہست از تبارِ آتش و آب

بطبع ہر کہ گذر کرد چون خلیل و کلیم   ہراس می نکند از گذارِ آتش و آب

ایک قصیدہ خاقانی کے مشہور بیا بانش - گریبانش والے قصیدے کے

جواب میں کہا ہے اور اپنے مرشد میرزا ابوالقاسم کی تعریف کی ہے لیکن چونکہ دونوں میں کوئی نسبت نہیں لہذا اس کا ذکر ترک کیا جاتا ہے بعض قصائد میں واقعہ نگاری اچھی کی ہے اور بعض وعظیات بھی غنیمت ہیں۔ مثنوی شیرین و فرہاد کے بعض اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن میں فرہاد کی نالہ وزاری کا حال ہجر شیریں میں دکھایا ہے:۔

فغان برداشت کای ترک کام من ده | ببین بے طاقتی آرام من ده
چنان عشق فسونگر بستہ دستم | کہ خود ہم بت گرو ہم بت پرستم

ایک باغ کا حال لکھا ہے:۔

بہشتے کوثر اندر چشمہ سارش | دم عیسٰی نہان در جویبارش
فضایش چون سرائے میفروشان | ہوایش چون دماغ بادہ نوشان
زسنگش لالہائے آتشین رنگ | سرآوردہ برون چوں آتش از سنگ

یغمائے جندقی | **یغمائے جندقی**۔ میرزا ابوالحسن نام۔ قریۂ جندق کے شرفا میں سے ہے۔ درسیات متداولہ عراق میں ختم کئے۔ اور زندگی شہزادوں اور امیروں کی صحبت میں بسر کی۔ ابتدا میں ذوالفقار خاں کا منشی تھا جسکی فحاشی کی وجہ سے ہزل گوئی کی عادت پڑگئی تھی اور ایک مجموعہ ہزلیات کا تیار ہوگیا تھا جس کا نام سرداریہ ہے۔ غزل گوئی کا بھی شوق تھا اور اپنے زمانے کے رنگ میں شعر کہتا تھا۔ بعض شعر درج کئے جاتے ہیں:۔

زلف در پاے تو بیم است کہ دیوانہ شوم | آہ بینم اگر این سلسلہ برپاے دیگر

ماخراب از غم و میخانہ زمے آباد است | ناصح از بادہ سخن کن کہ نصیحت یاد است
گوش اگر گوش تو و نالہ اگر نالۂ من | آنچہ البتہ بجاے نرسد فریاد است

فی الحقیقت یغماؔ کا امتیاز خطوط نگاری میں ہے۔ زبان خالص فارسی ہے اور ترکیبیں نادر الوجود۔ اس رنگ میں دوسرا لکھنے والا نظر نہیں آتا۔ ظرافت اور جودت ہر جملے سے ٹپکتی ہے۔ سلاستِ زبان کے ساتھ پختگی بیحد ہے۔ انھیں نادر ترکیبوں کے مجموعے کو "مجعولاتِ یغما" کہتے ہیں۔ مثلاً یہ لکھنا ہے کہ مختلف الاقوام اور مختلف الخیال لوگ جمع ہو گئے اور جھوٹ سچ اپنے اپنے رنگ میں بیان کرتے ہیں مگر ان پر غور کرنے والا کون ہے اور اچھے برے میں تمیز کرنے والا کہاں ہے۔ اس مطلب کو ایک خط میں یوں ادا کرتا ہے۔

"گروہے گوناگون، ہر یک براہ ورسنگے دیگر، دریں انجمن جائے و بارے دارند، بر آئین و آہنے بہتر یا بدتر، گفت و گذارے، گرم و سرد میلانید، و پختہ و خام میسرانید، ولے آنکہ گوش دارد کیست؟ یا ویلہ (بھونکنا) سگ را از سروائے (وحی) سروش باز داند (امتیاز کرے) کدام"؟

آگے بڑھ کے کہتا ہے:۔

"آسودہ زی (آرام سے زندگی بسر کر) و آرام پائے (اور چین کر) کہ ایں قبیلہ گاؤ وخر را از سر تا دم شناختہ ام و نہاد از ویلۂ ایں روبہانِ یلہ (دلیر) و بیلۂ (گروہ) گرگان بے تلہ (بدمعاش) یک گلّہ (سب کو) گوش تاسم پرداختہ (اچھی طرح سمجھ لیا ہے)۔ میگویند و نمی شنویم، میخواستند و نمی کردیم"

اسی انداز پر بہ کثرت خطوط لکھے ہیں جو چھپ گئے ہیں۔ عربی کا ایک لفظ نہیں۔ سب خالص فارسی ہے اور اتنی فصیح و شیریں کہ اگر غور نہ کرو تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ایسی سخت اور دشوار صنعت کا التزام کیا ہے اور ظرافت و متانت دونوں کو قائم رکھا ہے۔

نشاطی ہزار جریبی مازندرانی۔ (المتوفی ۱۲۶۲ھ) فتحعلی شاہ کا مداح نشاطی
ہے اور محمد شاہ کی تعریف میں بھی قصائد کہے ہیں اسکے کلام میں حقائق و
معارف اور مضامین فلسفیانہ علاوہ مناقب اہلبیت وغیرہ کے اکثر نظم ہوئے
ہیں طبیعت جدت پسند ہے۔ نئے راستے شاعری کے لئے ڈھونڈھتا ہے۔
مثلاً ایک قصیدہ نعتیہ کہتا ہے۔ تشبیب میں دہریوں کی رد نہایت لطف
سے کی ہے۔ منتخب اشعار نقل کئے جاتے ہیں :۔

این جنبش آسمان چہ چیز است | وین گردش اختران چہ چیز است
این نعش و نبات واین ثریا | این فرقد و فرقدان چہ چیز است
این کشتی چرخ در یم دہر | بے لنگر و بادبان چہ چیز است
این حرکت ابر پیل پیکر | بے حربۂ پیلبان چہ چیز است
این میل بخواب و خور چہ میل است | این فوق بہ آب و نان چہ چیز است

غرض یوں ہی کائنات کو گنوا تا گیا ہے جن میں سے ہر ایک چیز ایک دلیل خاص سے
وجود ذات واجب پر دلالت کرتی ہے جو فلسفہ و کلام جاننے والوں سے
پوشیدہ نہیں۔ پھر کہتا ہے :۔

با اینہمہ صنعہا بہ صانع | بحث تو درین میان چہ چیز است
در ہستی ذات او چہ شک است | در پیش یقین گمان چہ چیز است

ایک اور نئی تمہید یوسف خاں سپہدار کی تعریف کے لئے پیدا کی ہے :۔

ہر کہ تیغے برکشد در رزم و پا داری کند | فتح اورا یاری و نصرت مددگاری کند
آنکہ رخ برتابد از وشت و نہد سر در گریز | روز روشن بر سپاہ خود شب تاری کند
ہر کرا شمشیر تیز و نیروی بازوے نیست | چوں گزارد پاے در میدان و سرداری کند
رستمے باید کہ تا اسفندیارے را بہ تیر | افگند از پائے و خون از چشم او جاری کند

حیدرے باید کہ تا چشم آرد و انگشت خویش — مژہ را دو پارہ تن ز اعجاز کرّاری کند
آدمی باید کہ شیطانے ز رحمانی فتد — یوسفے باید کہ در ایران سپہداری کند

اب معشوق کا حال ممدوح سے بیان کرتا ہے :-

سرورا! دیدم زلیخا طلعتے در مصرِ حسن — کان زلیخا بیند ار یوسف خریداری کند
تُرک مستی کز کمانِ ابرو و تیرِ مژہ — گر زند صد زخم بر دل یک بیک کاری کند
من سخن از وصل با او گویم واو از فراق — من بشیرینی سخن او تلخ گفتاری کند

اس کے بعد حسنِ طلب کا انداز بھی عجیب ہے۔ کہتا ہے یا تو اپنے غلام سے کہدے کہ مجھے شہر بدر کردے :-

یا بگو دو تُرک چشمِ من کہ بر روی نکو — کم نگہ انداز دو دل را نگہداری کند
یا طبیبی جو کہ او دارد دوائے دردِ عشق — تا منِ شوریدہ را چندیں پرستاری کند
یا مرا زر دہ بدان مبلغ کز آن زر پائے دل — گیرد و آزاد از دامِ گرفتاری کند

اس میں شبہہ نہیں کہ یہ عاشقی نہیں بلکہ ہوسناکی ہے۔ لیکن فصاحتِ بیان۔ سلاستِ زبان۔ جدّتِ اسلوب وغیرہ کی مثال میں یہ اشعار ضرور امتیاز رکھتے ہیں۔ ایک اور تمہید اور گریز ملاحظہ ہو :-

اے رفیقِ مہرباں وائے شفیقِ کاربین — چند بیکاری بیا زین کارہا کارے گزین
خواہی ار یابی تو زمزم رو بر مکہ بیاب — خواہی ار بینی تو احمدؐ را برو یثرب ببین
خواہی ار سلطاں شوی لشکر کشی بر شرق و غرب — خواہی از خاقاں شوی تسخیر فرما روم و چین
خواہی ار حاتم شوی زر آنچہ داری دہ بخلق — خواہی ار قاروں شوی سیم آنچہ داری کن دفین
خواہی ار کافر برو پیش رئیس الاشقیا (شیطان ۱۲) — خواہی ار ایماں برو پیش امام المتقین
سرورِ غالب علی بن ابیطالب کہ ہست — حجتِ حق، ساقیِ کوثر، امیر المومنین

حکیم قاآنی قاآنی۔ میرزا حبیب اللہ بن میرزا ابوالحسن گلشن۔ آسی شاعر خیز

خطۂ شیراز کے رہنے والے تھے جس نے سعدی اور حافظ ایسے آفتاب ماہتاب آسمانِ نظم و نثر کو عطا کئے۔ گیارہ برس کی عمر میں باپ کا سایہ اُٹھ گیا اور تکمیل درسیات میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ آخر مشہد مقدس جا کے علوم متداولہ میں دستگاہ کامل حاصل کی۔ شعر و شاعری کا فطری شوق بھی رفتہ رفتہ ترقی پر آگیا اور شاہزادۂ شجاع السلطنۃ حسن علی میرزا پسر سوم فتحعلی شاہ مبرور نے شہرت کلام و کمال سن کے اپنے دربار میں بلایا اور ندیم خاص بنایا۔ ایکبار شاہزادہ اپنے باپ کی خدمت میں گیا تو قاآنی کو بھی اپنے ہمراہ لیجا کے پیش کیا۔ شاہ جمجاہ نے مجتہد الشعراء خطاب دیا اور خلعت و انعامات سے بھی سرفراز کیا۔ فتحعلی شاہ و محمد شاہ قاچار کی مدح میں قصائد نظم کر کے حسان العجم کا لقب حاصل کیا اور ماہواری وظیفہ لیا بلکہ کتاب پریشان (بجواب گلستان سعدی) کا تہدیہ بھی اسی بادشاہ کے نام پر کیا۔ ۱۸۴۹ء میں فرانس کے لوگ حکم شاہی سے حاضر ایران ہوئے۔ قاآنی نے انسے فرانسیسی سیکھی اور اتنی عمدہ بولنے لگا کہ بالکل اہل زبان معلوم ہوتا تھا۔ پھر سیاحت ہندوستان کا شوق ہوا مگر کامیابی نہوئی اور دشت ارزن سے واپس جانا پڑا۔ محمد شاہ کے بعد (ستمبر ۱۸۴۸ء میں) ناصر الدین شاہ تخت نشین ہوئے۔ انکے زمانے میں اور بھی عروج ملا اور ملک الشعراء خطاب ہوا۔ ۱۲۷۰ھ (مطابق ۱۸۵۴ء) سال وفات ہے اور مدفن دار الخلافۃ طہران۔ خود ناصر الدین شاہ شہید اس کی تجہیز و تکفین کے متکفل ہوئے۔ بستر مرگ پر توبہ و استغفار کے اصرار پر یہ شعر نظم کیا تھا:۔

شرمندہ از آنیم کہ در روز مکافات
اندر خورِ عفوِ تو نکردیم گناہے

قاآنی کا عروج عہد جدید میں ایسا ہی تھا جیسا عنصری کا محمود کے دربار

میں تھا مگر حلم و تواضع نے اُسے خلق میں بھی مقبول و محبوب بنا دیا تھا نیکدلی اور خوش مزاجی کے ساتھ ظرافت اور شوخی نہایت مزہ دیتی تھی گلستان کا جواب پریشان بھی اسی شوخی کا نتیجہ ہے عجب مضحک قصے لکھے ہیں اگر فحش نہ ہوتے تو یادگار رہتے۔ زبان کی پختگی اور ترکیب کی استواری ہر جگہ موجود ہے نمونہ کے لئے ایک صاف عبارت نقل کی جاتی ہے جس میں اپنے والد کے انتقال کا ذکر کیا ہے :۔

"یازدہ سالہ بودم کہ پدرم گلشن را شمع کمال بنور جمالش روشن بود خارے در پا رفت و ہنوز خارش در پا بود کہ کارش از دست شد[۱]
چہ بمقتضائے ہرم[۲] ازاں خارش در پا ورمے حادث شد کہ طبیبان
پدر مائش درماندند[۳] و اذا جاء اجلھم لا یستاخرون
ساعۃ و لا یستقدمون[۴] فرو خواندند"

فن شعر میں بھی ظرافت طبع اکثر مقامات پر ظاہر ہوتی ہے۔ دو ہکلوں کا مباحثہ تخمیس کے لہجے میں نظم کیا ہے :۔ ایک بڈھا۔ ایک لڑکا جب فیصلہ ہوا تو :۔

طفل گفتا تخدا را صمصمد یار ششکر | کہ رستم بجہان از ملال و محن
ممن ہم گگگنگم ممثل تتتو | تو تو تو ہم گگگنگی ممثل ممن

یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ قا آنی نے فرانسیسی میں دستگاہ کامل حاصل کی تھی اور مغربی انداز نظم و نثر سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا علاوہ بریں عربی اور ترکی میں بھی کسی اہل زبان سے کم نہ تھا۔ فارسی مادری زبان تھی اور وہ بھی فصحائے شیراز

---

[۱] دیکھو کتنا پختہ تقابل ہے۔ [۲] بڑھاپا۔ [۳] درماں اور درماندند کی لطافت دیکھو۔ [۴] جب اُن کا وقت مقرر آجاتا ہے تو نہ تاخیر کر سکتے ہیں نہ تقدیم۔ الآیہ۔

کی۔ پھر معقولات و منقولات پر بھی عبور تھا خصوصاً فلسفۂ اشتقاق لغت (فلالوجی) وغیرہ کا تو پورا ماہر تھا۔ فن شعر میں جو اس جامعیت سے کام لیا تو فخر اسلاف و اخلاف ہو گیا جس رنگ پر آگیا معلوم ہوا کہ اسی کا بادشاہ ہے۔ ذوق سلیم نے قُدما کا طریقہ محبوب بنا دیا۔ سلاست و روانی اُن سے اخذ کی۔ نازک خیالی اور استعارہ آفرینی متوسطین و متاخرین کی پسند آئی اور اُسے بھی اپنے کلام میں جگہ دی مگر بقدرِ اعتدال یعنے جہانتک "آمد" رہے اور فصاحت و سلاست پر حرف نہ آئے۔ صنائع و بدائع کا بھی بیحد شوق ہے مگر نظرِ تنقید دیکھ لے گی کہ معنویت کے عالم میں سوائے اُس لفظ کے جو بغرضِ سجع یا تجنیس وغیرہ لایا گیا ہے دوسرا لفظ اُس سے بہتر ادائے مطلب کے لئے ملنا دشوار تھا۔ اِن پر استواری ترکیبات اور پختگیِ تخییل نے سونے میں سہاگے کا کام کر دیا ہے۔ زبانِ قدیم اور خالص فارسی کا عاشق ہے متروک الفاظ و محاورات کو واپس لا رہا ہے اور زبان پر تسلّط اس قدر ہے کہ اِن دقیانوسی چیزوں کو عہد جدید کی آرائش کا جزو بنا لیا ہے۔ غرض اس مجموعی حالت نے جو کیفیت اس کے کلام میں پیدا کر دی ہے اُس کا مثل فارسی لٹریچر میں نہیں۔ اگر فردوسی کا شاہنامہ عہد قدیم میں محیر العقول تھا تو قاآنی کے قصائد اس دورۂ حاضر میں نقادوں کی نگاہیں خیرہ کئے ہیں۔ اب ہم بعض صنائع کو ذرا تفصیل سے لکھتے ہیں۔ پہلا قصیدہ کلیات میں یوں شروع ہوا ہے:۔

دو شم ندا رسید ز درگاہ کبریا ۔۔۔ کای بندہ کبر بہتر ازین عجز باریا
خوانی مرا خبیر و خلاف تو آشکار ۔۔۔ دانی مرا بصیر و خطائے تو برملا

زبان اتنی صاف ہے جتنی سعدی کی۔ پھر مواعظ و معارف کے (فلسفۂ اخلاق کے حدود میں رہ کے) دریا بہا دئے ہیں۔ عبد و معبود کے تعلّق کا سا نازک مسئلہ

گفتگو کے انداز میں آکے پانی کر دینا اسی کا کام تھا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو شخص باتیں کر رہے ہیں اور وہ بھی عام فہم زبان میں۔

اسی طرح ایک قصیدے میں شاہنامہ کے واقعات کی تلمیح کا التزام کیا ہے۔ حقیقت میں نہایت شاندار ہے اور قابلِ نقل مگر بخوف طول ترک کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ قاآنی اس عہد کا گل سرسبد ہے۔ مناظرِ فطرت کا نقشہ کھینچتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود کھڑا ہوا سیر کر رہا ہے اور لذّت کے جوش میں آکے بیان کرتا چلا جاتا ہے:۔

بگردون تیرہ ابرے بامدادان برشد از دریا
جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا

ذرا انصاف سے کہنا! یہ ترصیع ہے یا حسن تکرار۔ یا پُر جوش دل کی آواز۔

چو چشمِ اہرمن خیرہ، چو روی زنگیان تیرہ
شدہ گیتی ہمہ چیرہ، بمغزش علّتِ سودا

دیکھو خیرہ۔ تیرہ۔ چیرہ۔ محض مبالغۃ الراسین یا سجع کے لئے نہیں ہیں بلکہ جس کیفیت کا ذکر مقصود ہے اِن سے بہتر الفاظ اُس کے ادا کرنے کے لئے مل نہیں سکتے۔ آگے کہتا ہے کہ کالے کالے بادل۔ صاف شفاف قطرے پانی کے برسا رہے ہیں۔ ذرا تشبیہات کی لطافت دیکھو۔ زبان کی روانی اُس پہ لفظی صنعتیں مستزاد:۔

تنش باقیر آلودہ۔ دلش از شیر آمودہ
درون سو سرمہ سودہ۔ برون سو لولوے لالا
بدل گلشن بتن زندان، گہے گریان، گہے خندان،
چو در بزمِ طرب رندان، ز شورِ نشۂ صہبا

معنویت پر غور کرو۔ ہر قطرہ جو اس وقت ابر کے اندر چھپا ہوا ہے حقیقت میں ایک ایک پھول کا سرمایہ ہے اور اگر وہ قطرے اولے ہیں تو بالکل مختلف الاشکال پھولوں کی صورت میں فطرۃً موجود ہیں۔ ان قطرات کے مجموعے کو گلشن کہنا کتنا دلآویز مبالغہ ہے اور یہ سیاہ دیواریں ابر کی اس باغ کو اپنی قید میں لئے ہوئے ہیں۔ زندان نہیں تو اور کیا ہیں۔ پانی برسنا "گریاں" ہوتا ہے اور بجلی چمکنا "خنداں" ہونا۔ اس تضاد کے جمع ہونے کا لطف کتنا زائد ہے۔ محض گریاں و خنداں قافیہ بندی کے لئے نہیں ہیں۔ پھر اس ہنگامے میں شراب نوشی کا یاد آجانا بھی لطف سے خالی نہیں۔ شاید فطرت نے خود مستانہ روش اختیار کی ہے۔ وہ عالم ہے جیسے شراب پی کے سیہ مست کبھی ہنستے ہیں کبھی روتے ہیں اور ہے محض نشہ کا زور اور کچھ نہیں۔ ایک قصیدے میں پانی برسنا۔ ہوائیں چلنا۔ بجلی کی چمک۔ رعد کی گرج انھیں خصوصیات کے ساتھ ساتھ بیان کی ہے۔ الفاظ کی آوازیں خود بتا رہی ہیں کہ بڑے زور شور سے پانی برس رہا ہے اور دور دور تک یہی عالم طوفان ہے:۔

فرو بگرفتہ گیتی را بباغ و راغ و کوہ و در ۔۔۔ ہم ابر و دم باد و لتیف برق و غریو تندر

پورا قصیدہ ایک ہی زور میں ہے۔ ایک مخمس میں اور جدت تشبیہہ کا لطف دیکھو:۔

بنفشہ رستہ از زمیں بطرف جوئبار ہا ۔۔۔ و یا گسستہ حور عین ز زلف خویش تار ہا

ز سنگ اگر ندیدۂ چسان جہد شرار ہا ۔۔۔ ببرگہائے لالہ بین میان لالہ زار ہا

کہ چگونہ شرارہ می جہد ز سنگ کوہسار ہا

بہار کا سماں ہے۔ رگوں میں خون دوڑ رہا ہے آتش عشق بھڑکی۔ دل کے ولولے بڑھنے لگے۔ شگوفے بھی بحر اں کشیدہ نظر آتے ہیں۔ کہتا ہے:۔

ندا نما ز کودکی شگوفہ از چہ پیر شد ۔۔۔ نخوردہ شیر عارضش چرا برنگ شیر شد

گمان برم کہ ہمچو من بدام غم اسیر شد ۔۔۔ ز پا فگندہ دلبرش چہ خوب دستگیر شد
بلے اچنیں پرند دل ز عاشقاں نگار ہا

اب اپنی ہجر کی مصیبت یاد آئی۔ لوگ معشوقوں کے ساتھ باغوں میں گھومتے ہیں اور جام پر جام پیتے ہیں۔ عاشقِ مہجور اپنے حالِ زار کو بیان کرتا ہے :۔

درین بہار ہر کسے ہوای راغ دارد ۔۔۔ بیادِ باغ طلعتے خیالِ باغ دارد ا
یہ تیرہ شب ز جام مے بکف چراغ دارد ۔۔۔ ہمین دل من است و بس کہ درد و داغ دارد
جگر چو لالہ پُر ز خون ز عشق گلعذار ہا

دیکھو کیا عمدہ تشبیہ دی ہے۔ وصل کے زمانے میں اندھیری راتیں شراب کے جام سے روشن کی ہیں اور ہجران نصیب کے پاس اپنا دل ہے اور بس! جسمیں داغ ہیں اور درد۔ اِس موسم بہار میں اس کا لالہ ایسا ہے کہ سرخ بھی ہے اور داغدار بھی ہے۔ ایک اور نئی تشبیہ سنو :۔

بہار را چہ می کنم چو شُد ز بر بہارِ من ۔۔۔ کنارہ کردم از جہاں چو اوشُد از کنارِ من
خوشا دمِ خرّم آن دمے کہ یار بود یارِ من ۔۔۔ دو زلفِ مشکبار او بچشم اشکبارِ من
دو چشمۂ کہ اندر و شنا کنند مار ہا

اس میں شک نہیں کہ قاآنی کی غزلیں بالکل قصیدے کا جزو معلوم ہوتی ہیں اور شانِ غزل سے کسی قدر خالی لیکن یہ مقامات اُس کی تلافی کے لئے کافی ہیں۔ غزل کیا۔ واسوخت میں بھی یہ سوز و گداز پیدا ہونا مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ غزل کے لئے یہ معذرت کی جاسکے کہ متقدمین کی تقلید کے جوش میں تغزل کا انداز بھی انھیں کا اختیار کر لیا اگرچہ یہ نہ چاہیے تھا۔

قاآنی کی طبیعت مشکل پسند بھی ہے اور دقیق مسائل بیان کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے مگر عنوان ادا ایسا سلیجھا ہوا کہ سخت سے سخت مسائل پانی ہو جاتے ہیں۔

یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دقیق مسئلہ بیان ہی نہیں کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایک قصیدے کے دو تین اشعار لکھے جاتے ہیں :۔

کشودی زلف قیرآگین، جہاں را قیروان کردی

نمودی چہر مہرآئیں، زمین را آسمان کردی

واقعہ یہ ہے کہ جب عشق کامل ہوتا ہے تو عاشق ہر چیز و نیا کی معشوق کے حالات پر نظر کر کے دیکھتا ہے۔ اگر اس کا چہرہ چھپ گیا تو دنیا اندھیر ہے۔ اگر وہ سامنے ہے تو زمانہ روشن ہے۔ اس مسئلہ کو شاعری کا لباس پہنایا ہے سیاہ زلفیں چہرۂ معشوق پر بکھرا کے دنیا سیاہ کر لی۔ پھر انھیں زلفوں کو ہٹا کے نورانی چہرہ دیکھا اور زمانہ اپنے لئے روشن کر لیا۔ یا ایک اور مسئلہ لو۔ دنیائے عشق کے مصائب ایک طرف جو معشوق کے حرکات سے واقع ہوتے ہیں اور ہماری مجازی دنیا کے مصائب دوسری طرف جو آسمان کی حرکت سے واقع ہوتے ہیں۔ ابھی سن چکے ہو کہ عاشق کی ساری دنیا معشوق ہے۔ اگر معشوق راضی ہے تو جورِ فلک کی پروا نہیں۔ اگر معشوق ظلم کر رہا ہے تو جورِ فلک اس پر گویا ہوتے ہی نہیں۔ اتنے پست معلوم ہوتے ہیں گویا اس کی مظلومی پر آسمان بھی ترس کھا رہا ہے :۔

زبس نامہربانی با من اے آرامِ جان کردی

فلک را با ہمہ نامہربانی مہربان کردی

فلسفہ کا مسئلہ ہے کہ عشق بتدریج کامل ہوتا ہے۔ پہلے مثلاً کسی خوبصورت چیز پر نظر پڑی تو وہ بھلی معلوم ہوتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ اُسے بار بار دیکھیں اُسے استیناس کہتے ہیں اور معشوق اس مرتبے میں **قاآنی** کی اصطلاح میں "نگار" ہے یعنے خوبصورت۔ دوسرا درجہ جب آتا ہے تو یہ جی چاہتا ہے کہ ہمارے اقوال و افعال معشوق کی مرضی کے موافق ہوں۔ گویا اب دِل لگ جاتا ہے۔ عاشق

رضا جو ہو جاتا ہے اور معشوق "دلبر" یہ درجہ مودت ہے تیسرا درجہ محبت کا ہے۔ اس درجے میں پہونچ کے معشوق سے اتحادِ خیال اور اتحادِ مذاق ہو جاتا ہے۔ جو عاشق چاہتا ہے وہی معشوق چاہتا ہے۔ جو معشوق چاہتا ہے وہی عاشق چاہتا ہے گویا عاشق و معشوق "یار" ہو جاتے ہیں۔ چوتھا درجہ خلّت ہے۔ اس میں عاشق کے ارادے اور ولولے معشوق کے عشق میں مستہلک ہو جاتے ہیں اور ایسا از خود رفتہ ہو جاتا ہے کہ معشوق کی جفاؤں میں بھی لذّت پاتا ہے۔ اُسے ہجر و وصل میں بھی امتیاز نہیں رہتا۔ پانچوں درجے میں مرتبۂ شہودی نصیب ہر وقت معشوق نظروں میں ہے اور اُسی تصویر تصوّری سے وفا اور آرام دل سب کچھ حاصل ہوتا ہے یہی عشق ہے۔ چھٹا درجہ ولہ ہے۔ یہ فنا فی المعشوق کا درجہ ہے خودی جاتی رہتی ہے اور بجز معشوق کچھ باقی نہیں رہتا۔ دیکھو اتنا بڑا مسئلہ چند لفظوں میں کس لطفِ تغزل کے ساتھ ادا کرتا ہے:۔

نگارا، دلبرا، یارا، دلآرا ما۔ وفادارا

خجل تر میں نا ہما بادی کہ ما را بے نشان کردی

قاآنی کی شوخ طبیعت اختراعِ محاورات پر بھی آمادہ رہتی ہے مثلاً تن پروری سخن پروری تو بولتے ہی ہیں۔ وہ مدح پروری، شعر پروری وغیرہ نظم کر جاتا ہے اور نہایت لطف کے ساتھ۔ افسوس کہ کتاب طویل ہوتی جاتی ہے ورنہ قاآنی کی تنقید کا تقاضا تھا کہ پوری بحث اس کے کلام پر کی جاتی۔ مؤلف نے تذکرہ و تبصرہ میں لکھا تھا کہ "در ہر کدام (شاعر) ہر چہ خوبتر است در کلام قاآنی بانتاسب صدور و اعجاز ہمچو معجزہ دیدہ می آید" لوگوں نے اس رائے کو قاآنی پرستی پر محمول کیا۔ گیارہ برس کے بعد آج پھر نوبت اس گفتگو کی آئی مگر رائے میں کوئی تفاوت نہیں ہوا ہاں! بعض خصوصیات اور نظر میں آگئے جو اس وقت تک

مخفی تھے۔ آخر میں ایک اور صنفِ نظم پر کچھ عرض کرنا ہے صنعتِ سوال و جواب میں عنصری کا قصیدہ "ہر سوالے کزاں گلِ سیراب ؛ دوش کردم مرا بدا د جواب" بہت مشہور ہے کیونکہ ایک مصرعے میں سوال ہے دوسرے میں جواب اور یہی التزام آخر تک ہے بلکہ صفائے بندش اور شیرینیٔ ادا سے اسے دلکش بھی بنا دیا ہے۔ قاآنی نے بھی یہ صنعت اختیار کی ہے اور ذوقِ سلیم نے اس کے لئے مرثیہ منتخب کر لیا ہے۔ جس سے حزن و ملال کی ایک دل ہلا دینے والی کیفیت پیدا ہو گئی۔ قاعدہ ہے کہ اگر کسی دردرسیدہ سے کرید کرید کے کسی سانحۂ جانکاہ کے جزئیات پوچھے جاتے ہیں تو دل اُمنڈ آتا ہے اور تڑپ تڑپ کے زار زار رونے لگتا ہے۔ پھر مصائب بھی پوچھے گئے تو کشتگانِ نہر فرات کے۔ بار بار سوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریائے غم اُمنڈنے والا ہے۔ دیکھو کیا کام کرتا ہے اور کتنے سوال ایک ایک شعر میں مع جواب ذکر کرتا ہے:۔

بارد چہ؟ خوں۔ دیدہ۔ چساں؟ روز و شب۔ چرا؟
از غم۔ کدام غم؟ غمِ سلطانِ اولیا

نامش چہ بد؟ حسین۔ ز نژاد کہ؟ از علیؑ
مامش کہ بود؟ فاطمہ۔ جدش کہ؟ مصطفےٰ

چوں شد؟ شہید شد بکجا؟ دشت ماریہ
کی؟ عاشرِ محرم۔ نہاں؟ نے! برملا

سیراب کشتہ شد؟ نہ۔ کس آبش بداد؟ داد
کو؟ شمر۔ از چہ چشمہ۔ ز سر چشمۂ فنا

امام زین العابدینؑ کی اسیری اور تشہیر کا حال یوں پوچھتا ہے:۔

برتن لباس داشت؟ بلے! گردِ رہگذر
بر سر عمامہ داشت؟ بلے! چوبِ اشقیا

سارا مرثیہ اسی طرز میں ہے جیسے محاکات کی سچی تصویر کہنا چاہیئے۔ سارا واقعہ نظروں میں پھر جاتا ہے اور دل بے چین ہوتا ہے۔ انصاف سے کہنا کہ محض صنعت سوال و جواب کے التزام کے لئے یہ رنگ اختیار کیا ہے یا ایک کارنامہ پیش کیا ہے۔

افسر قاچار

افسر قاچار شہزادہ محمد رضا میرزا ابن خاقان فتحعلی شاہ ۱۲۱۱ھ میں طہران میں پیدا ہوئے۔ ارباب فضل و معرفت کی صحبت کا یہ اثر تھا کہ باوجود حاکم گیلان وغیرہ ہونے کے علوم و فنون کی طرف ہمیشہ توجہ رہی۔ غزلیں نہایت پاکیزہ اور صاف ہوتی ہیں اور طبیعت شوخ و جدّت پسند ہے۔ چند منتخب اشعار نقل کئے جاتے ہیں:۔

ز ہولِ روزِ قیامت بود چہ باک آنرا … کہ صبح کرد بہ اندوہ شام ہجران را

آنچہ در وصف نگنجد صفت مشتاقیست … رفت زاندازہ سخن باز حکایت باقیست
ترسم آخر زکف از بیمِ فراقت ندہد … نیمجانے کہ بامیدِ وصالت باقیست

تا عکسِ ساقی آئنہ افروزِ جام شد … جز بادہ ہرچہ بود بہ عالم حرام شد
گر مرغ دل بزلفِ تو زاری کند مرنج … آرے فغاں کنند غریباں چو شام شد

طفلے نزند سنگ بدیوانہ دریں شہر … عاقل بچہ امید کند خانہ دریں شہر
ز افسانۂ عشقِ من شوریدہ سر افسر … افسانۂ مجنوں شدہ افسانہ دریں شہر

آں یار کہ در کون و مکاں میطلبیدیم … چوں گنج بویرانۂ دل بود چو دیدیم
شد بستہ بہ پر بندِ چو از پائے کشودیم … بنشست بدل تیر چو از سینہ کشیدیم

احمد قاچار **احمد علی میرزا** ابن فتحعلی شاہ خاقان بھی نہایت خوشگو تھے۔ سعادت قلی خاں (سعادت علی خاں ؟) برادر نواب آصف الدولہ وزیر لکھنؤ ایک بار خراسان میں سفر کر رہے تھے کہ ترکمان ڈاکوؤں نے گرفتار کر لیا۔ بحکم شاہی احمد علی میرزا نے انھیں رہا کرایا اور زر فدیہ ادا کیا۔ پھر ترکمانوں کی بھی پوری تنبیہ کر دی ۱۲۷۰ھ میں رہگرائے ملک عدم ہوئے۔ چند اشعار منتخب کئے جاتے ہیں :-

آنانکہ روز ہجر تو دوزخ شمردہ اند — گویا ندیدہ اند شب انتظار را

فصل گل شد ہمہ مرغان بچمن نغمہ سرائے — وائے برحسرت آں مرغ کہ بے بال و پرست

باپ کی یاد میں کہتے ہیں :-

گر دو روزے بے حضورت زندگیست — حاصل این زندگی شرمندگی است

کاش زاوّل خواجگی قسمت نبود — چوں نصیب مادر آخر بندگی است

رفت تا فتح علی شہ از جہاں — گشت آسان مرگ و مشکل زندگی است

فرہاد میرزا **فرہاد میرزا**۔ فرزند نائب السلطنۃ ولیعہد مرحوم بن فتحعلی شاہ خاقان۔ دورۂ جدید کے اکمل افراد سے ہیں۔ ناصر الدین شاہ کے زمانے میں ان کا بڑا عروج تھا اور اکثر مہمات سلطنت ان کے متعلق کئے جاتے تھے۔ سفر گرگاں میں بادشاہ کے ساتھ تھے۔ رات بھر میں ایک رسالہ اپنے باپ اور دادا کے حال میں لکھ ڈالا جس میں ۲۸ حکایتیں ہیں اور انشا میں یہ صنعت رکھی ہے کہ ہر حکایت سے ایک حرف ساقط کر دیا ہے۔ ایک میں الف نہیں ہے دوسری میں بے نہیں۔ یہانتک کہ آخری حکایت میں یائے معروف و مجہول نہیں ہے۔ خلاصۃ الحساب شیخ بہائی رح کی شرح فارسی میں کی ہے اور ایک نصاب انگریزی زبان کا تصنیف کیا جس میں دو ہزار لفظیں اس زبان کی آگئی ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور اور معتبر جغرافیہ **جام جم** ہے جو عہد حاضر کی

تصانیف میں خاص طور سے قابل قدر ہے۔ قصائد و غزلیات کا ایک دیوان بھی چھوڑا ہے جن کا اقتباس بخوف طول ترک کیا جاتا ہے۔

یمانؔ علی کرمانی

راجی کرمانی۔ یمانؔ نام۔ اصلاً مذہب زرتشت کے پیرو تھے مسلمان ہوئے تو یمانؔ علی نام رکھا گیا۔ علما و عرفائے کرمان سے نہایت ارتباط تھا شہزادہ شجاع السلطنت غلام نجیب حاکم کرمان ہوئے تو ان پر بہت عنایت کی۔ ایک مثنوی شاہنامہ کے طرز پر نظم کی اور امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام کے غزوات کے حالات بیان کئے (جس طرح ملا رفیع باذل نے حملۂ حیدری لکھی ہے) ۔ یہ کتاب ظہیر الدولہ ابراہیم خاں کو نذر دی ہے۔ انداز طبیعت ابتدائی اشعار سے معلوم ہو جائیگا :۔

بنام خداوند دانائے فرد — کہ از خاک آدم پدیدار کرد
یکے را بقدرت ز خاک آفرید — یکے شد ز تابندہ آتش پدید
یکے سجدہ ناکردہ مسجود شد — یکے سجدہ ہا کردہ مردود شد
زہے حال [illegible] سرشت خاک — کزو شد عیاں نور یزدان پاک
ندانم چہ [illegible] بار بخشند — چہ صافات اندریں گرد ساختند
بدہ ساقی آں آتش تابناک — کہ تا کش پدید آمد از آب و خاک
نہ از خاک تنہا ہمی تاک خاست — خم و ساغر و مے ہم از خاک خاست
مے کو خراب اندرے تاب نیست — مگو دل کہ غیر از گل و آب نیست

کلام میں پختگی اور صفائی بیحد ہے۔ واقعات کے بیان کرنے کا سلیقہ بھی اچھا ہے بلکہ جوش اعتقاد بعض مقام پر خاص قوت پیدا کر دیتا ہے مثلاً جنگ بدر میں

.ط.ا اس وقت انکے متعلق لکھنا دشوار ہے کیونکہ نہ حملۂ حیدری موجود ہے نہ کوئی اور کتاب جس سے مدد لیجائے۔

جب امیر المومنین نے ولید بن عتبہ پر حملہ کیا اور گرد آڑی تو کہتا ہے :۔

درافتادہ در بحر توحید شور	بظلمت نہاں گشت دریائے نور
چناں بر خروشید شیر خدائے	کہ گفتی عدا گشت رزم آزمائے

حضرت سرور کائنات صلعم کی شان میدان اُحد میں دکھائی ہے :۔

بمیداں پیمبر صف آرائے شد	اُحد از صفش عرش پیمائے شد
بہ آرزم شد چہرۂ ماہ و مہر	خوی شرم بگرفت روئے سپہر

رزم کے حالات بھی نہایت پُر جوش ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ اتنے عرصے کے بعد رزمیہ نظم میں قوت کہاں سے آگئی بجز اسکے کہ جوشِ مذہب مصنّف میں کافی طور سے موجود تھا۔ وہ غالب آجاتا ہے اور شعر میں زور بھر دیتا ہے۔

مرحب کے مقابل جانے کا حال نظم کرتا ہے :۔

روان شد علیؑ سوئے میدانِ کین	بنالید بر ہفت گردون زمین
چو مرحب نگہ کرد از بام دژ	تبہ یافت آغاز و انجام دژ
بفرمانش حارث بہ ناورد تاخت	ولیکن پس از تاختن زہرہ باخت
شہنشاہ خنداں برآورد تیغ	درخشید برقی تو گفتی ز میغ
بغلطید بر خاک حارث نژند	بہ تکبیر صوت علیؑ شد بلند
ز سم ستوران تنش سودہ شد	بخونش رخِ خاک آلودہ شد

سپہر کاشانی - میرزا محمد تقی نام۔ فتح علی شاہ اور محمد شاہ کے دربار میں سپہر کاشانی مقرب رہے بلکہ مستوفی الممالک بھی ہو گئے۔ قوت علمیہ میں خاص امتیاز تھا اور نظم و نثر میں پایہ بلند تھا۔ ایک کتاب مبسوط ناسخ التواریخ انکی یادگار ہے۔ جو ناصر الدین شاہ کو نذر کی گئی اور **لسان الملک** کا خطاب بھی اسی بارگاہ سے ملا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں اس سے بہتر تاریخ ملنا دشوار ہے۔ حضرت آدم

سے لیکے امام زین العابدین علیہ السلام تک کے حالات شرح و بسط سے لکھتے ہیں۔ زبان نہایت صاف اور شیریں ہے اور طرز ادا نہایت دلکش۔ تکلّفات و تصنّعات یکقلم ترک ہیں تنہا رسول مقبول صلعم کے حال میں تقریباً نو سو صفحے تحریر کئے ہیں۔ دوسرا حصہ اس تاریخ کا قاچاریوں کے حال میں ہے یہ بھی نہایت ضخیم ہے۔ علاوہ بریں ایک مبسوط کتاب براہین العجم تحریر کی ہے جس میں فن شعر کے متعلق لطیف تحقیقیں درج کی ہیں۔ تذکرۂ شعرا و علما بھی انھیں کے قلم سے نکلا ہے۔ غرض دورۂ حاضرہ کے مصنّفین میں ان سے زیادہ امتیاز کے لوگ شاید نہ ملیں گے۔

حاجی مرزا آقاسی نے ایک مطلع اور حسن مطلع کہا۔ (مجمع الفصحا) :۔

ساقی بدہ رطل گران زان مے کہ دہقان پرورد
اندہ برد غم بشکرد شادی دہد جان پرورد

در خم دل پیر مغان در جام مہر زرفشان
در دست ساقی قوّت جان رخسار جانان پرورد

سپہر نے یہ قصیدہ محمد شاہ قاچار کی تعریف میں پورا کیا[1] چند شعر نقل کئے جاتے ہیں :۔

ساقی بریخ گلبرگ تر عکس رخش در جام زر
چون پور آزر تاگذر زآزر گلستان پرورد
(ابراہیم ع — آتش)

شراب مانگتا ہے :۔

ہم راوق بیجادہ کن ہم بید برگ امادہ کن[2]
با خویش کار بادہ کن زان مہ کہ کتّان[3] پرورد

---

[1] قاآنی نے بھی اسکا تتمہ نظم کیا ہے جو دیکھنے کے قابل ہے۔

[2] یعنے انگور کو نچوڑ اور بید کی پتّیاں شراب صاف کرنے کے لئے مہیّا کر۔

[3] کتّان ایک کپڑا ہے جو چاند کے عکس سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

مطرب کی زلفوں کی تعریف کرتا ہے :۔

از طرّہ صد مشکین زرہ، افشاند بر سیم سرہ
واندر شکنج ہر گرہ، کفریست کا یمان پرورد

ستّارِ ایمانست آن، وز کفر برہانست آن
یا دستِ شیطانست آن، کش نورِ یزدان پرورد

لبِ معشوق کی تعریف کرکے تخلیص نہایت نازک کرتا ہے :۔

لعلش چو آتش پر بہا، در آتشش آبِ بقا
یا عدل شہ آن آب را در نارِ سوزان پرورد

ایک مثنوی اسرار الانوار چہاردہ معصومین علیہ السلام کی مدح میں اچھی کہی ہے :۔

سامانی ۔شیرازی بن حکیم قاآنی شیرازی بھی اپنے باپ کے قدم بقدم چلتا ہے۔ مدرسۂ نظامیہ دار الفنون میں سپہر کاشانی کی نگرانی میں تعلیم پائی۔ علاوہ زبان فرانسیسی کے علوم جدیدہ میں بھی اچھی دستگاہ حاصل کی مگر عنفوان شباب میں ۱۲۸۵ھ میں رحلت کر گیا۔ اس کے زمانے میں مسمطات کا بیحد رواج تھا بلکہ عہد قاچاریہ کے اکثر شعرا نے طبع آزمائی اس صنعت میں کی ہے خصوصاً بہاریہ اشعار عمدہ عمدہ نظم کئے ہیں۔ ایک بہاریہ بند اس کا بھی نقل کیا جاتا ہے جس میں صنعت رجوع نہایت لطف سے برتی ہے :۔ سامانی پسر قاآنی

آمد بہار و بادِ صبا مشکبار گشت — نے نے بہشت آمد و نامش بہار گشت
گل بر شگفت از اثرِ بادِ نوبہار — نے نے زشاخ، آتشِ طور آشکار گشت
خطِّ بنفشہ رائحۂ مشکِ تر گرفت — نے نے برنگ و بوئے خط و زلفِ یار گشت
دستِ زمانہ در چمن اسباب تازہ چید — نے نے چمن برونقِ پیرار و پار گشت

بانکہتِ عبیر بود شاخ مشک بید — زینے زنے خط کہ غیرتِ مشک تتار گشت
از دولتِ بہار جوان گشت روزگار — زینے زنے زبخت خواجہ جوان روزگار گشت

آن خواجۂ ستودہ کہ دوران غلام اوست
دورِ سپہر و گردشِ اختر بکام اوست

میرزا سعید اللہ خاں **وفائی تفرشی** بھی اسی زمانے کا خوشگوار شاعر ہے۔ وفائی تفرشی
شہزادہ ظل السلطان (پسر ناصر الدین شاہ قاچار) اور شیخ علی میرزا کا ندیم رہا ہے۔
طبیعت میں تغزل کافی موجود ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

نگویم جاے می شادی فروشد میفروش امّا — بسی ناشاد دیدم کز درِ او شاد می آید

ہر دیدہ کہ بینم نگرانست برویت — یک شہر پراں دیدہ و بحسرت نگرانم

یک رہ از طرۂ او شانہ نیامد بیرون — کہ از و صد دلِ دیوانہ نیامد بیرون
رفت بر باد نہ دانم ز چہ ہم بستر شمع — نالہ از دلِ پروانہ نیامد بیرون

ہدایت طبرستانی۔ رضا قلی خاں بن محمد ہادی ۱۵ محرم ۱۲۱۵ھ کو طہران رضا قلی ہدایت
میں پیدا ہوئے۔ بعد تکمیلِ علوم رسمیہ اپنے باپ دادا کی طرح امرا و سلاطین کے
دربار تک رسائی ہوئی اور شاہزادۂ **فرما نفرما** اور شہزادۂ **شجاع السلطنۃ** کی
عنایت ان کے حال پر بہت رہی۔ شعر گوئی کا شوق جوانی سے تھا۔
ابتدا میں چاکر تخلص کرتے تھے۔ بعد کو **ہدایت** تخلص اختیار کیا۔
فتحعلی شاہ نے انھیں پہلے **خان** کا خطاب دیا پھر ملک الشعرا صبائے شیرازی
کے بعد انھیں **ملک الشعرا** کا خطاب و منصب عطا کیا مگر یہ شدید بیمار ہو گئے
اور حاضر دربار نہ رہ سکے۔ محمد شاہ کے زمانے میں نواب فیروز میرزا کے

ساتھ رہے۔ پھر صدر اعظم حاجی مرزا آقاسی کے توسط سے حاضر دربار شاہی ہوئے۔ ناصر الدین شاہ کے عہد میں مدرسۂ دار الفنون کے صدر ہوئے اور بادشاہ کے حکم سے روضۃ الصفا کی تکمیل کی یعنے صفویہ سے لیکے اپنے زمانے تک کی تاریخ مرتب کرکے شامل کی اور انعام حاصل کیا۔ ایک تذکرہ مجمع الفصحا شعرائے فارسی کے حال میں ضخیم مرتب کیا ہے اور سب کے کلام کا انتخاب نہایت خوشگوار اور تفصیلی کیا ہے۔ زبان سلیس اور شیرین ہے اور طرز تحریر مؤرخانہ ہے۔ نظم میں انوار الولایہ۔ گلستانِ ارم۔ بحر الحقائق (بروزن حدیقۂ سنائی) انیس العاشقین خرّم بہشت و ہدایت نامہ وغیرہ مثنویاں اور ایک دیوان غزلیات وقصائد وغیرہ کا ہے۔ علاوہ بریں فہرس التواریخ۔ تذکرۂ ریاض العارفین لطائف المعارف وغیرہ بھی انھیں کی تصنیف سے ہیں۔ کلام میں سادگی غالب ہے اور تصنّعات سے عاری۔ بعض وقت مشکل ردیفوں میں بھی اشعار کہے ہیں اور نہایت آسانی پیدا کرلی ہے۔ رنگ طبیعت ملاحظہ ہو:۔

سرو من بر لالہ از سنبل نقاب آرد ہمی — آفتابے را نہاں زیر سحاب آرد ہمی
آہوے مردم شکارش خونِ مردم بسکہ خورد — لالۂ عنبر نقابش مشکناب آرد ہمی
نرگسش دارد نظر موے دلم ہر دم بہ تاز — آرسے آرسے مست آہنگِ کباب آرد ہمی
گر سیاوش نیست آں خطِ سیہ وش اینقدر — از چہ رو در رفتنِ آتش شتاب آرد ہمی

مثنوی کا اندازہ ابتدائی اشعار سے گلستانِ ارم کے ہو جائے گا اور قوت علمیہ کی وجہ سے بعض مقامات پر دل پسند جدّتیں نظر آئیں گی:۔

بنامِ آنکہ بے نامش بہ نامہ — نمی گردد رواں از عجز خامہ
ہمہ عالم بنورش گشتہ پیدا — ولے خود گشتہ نہاں و گتے ہویدا

بہر ذرّہ ز نورِ آفتابش ظہورِیّ و ظہورش خود حجابش
ظہورِ جملہ ہستیہا بنورش خفائے ذاتش از فرطِ ظہورش
ہمہ کارے عجائب در عجائب بہر جا حاضر و از جملہ غائب

ناصر الدین شاہ

ناصر الدین شاہ قاچار کا ایک مجموعۂ غزلیات ہے اور تین جلدوں میں سفرنامہ۔ اس کتاب کی عبارت سہل ممتنع ہے اور جدید فارسی کا ایک معتبر سرمایہ۔ جس قدر الفاظ غیر زبانوں کے رائج ہیں اُن کی ابتدا اسی سفر نامہ سے ہے۔ بلاد یوروپ و امریکا کے الفاظ فرانسیسی تلفظ کے ساتھ بکثرت استعمال کئے ہیں کیونکہ دوسرا تلفظ فارسی میں کھپ نہیں سکتا تھا اور فارسی زبان خود بھی اپنی شیرینی ادا اور قبولِ عام کی وجہ سے ایشیا کی فرانسیسی کہلاتی ہے) بعض اصطلاحی ناموں کے فارسی میں ترجمے کر لئے ہیں جو نہایت شیریں معلوم ہوتے ہیں۔ یہ نثر نویسی بالکل نرالی ہے۔ جو بولتے ہیں وہی لکھتے ہیں۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ انشا پردازی کے لئے قلم اُٹھایا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو :۔

"دیشب کہ دریا را تماشا کردیم، بعضے ماہیہائے ریزہ دیدیم مثلِ حیوانات کوچک **فسفردار** کہ در ماز ندرانِ ایران بسیارست و در شب تمام شان برق میزند۔ ایں ماہیہا ہم توے دریا از زیرِ موج و کفِ آب کہ از زیرِ چرخِ کشتی بیرون می آمد زیرہ و بالا میشدند و مثل **الکتریسیتہ** در تاریکئ شب برق می دادند۔ خیلے تماشا داشت۔ ہنوز نرسیدہ مقابلِ رودخانۂ **طیمس**، سہ کشتی زرہ پوشِ **انگلیس** باستقبالِ ما آمدہ بنا کردند بہ شلیکِ توپ نمودن و سلام دادن۔ کشتیہائے بخاری و بادبانی زیاد ہم کہ ہمہ پُر از مرد و زن بود از انگلیس برائے تماشا آمدہ بودند متصل

ہو را میکشید ند و دستمال تکان میدادند۔"

شاہ مغفور کی عاشقانہ غزلیں مشہور ہیں۔ جو مجموعہ اسوقت میرے سامنے ہے اس میں سراسر عشق مجازی کا ذکر ہے اور حقائق و معارف سے زیادہ سروکار نہیں۔ طبیعت رنگین ہے اور استعارات و تشبیہات بھی خوشگوار ہیں۔ ترکیبیں بھی کسی قدر پختہ ہیں۔ منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں :۔

بہ بستان در بہاران چوں گل نسرین شود پیدا
خجل گردد چو یارِ من بصد تمکین شود پیدا
تکلم چون نماید معجز عیسی شود ظاہر
تبسم چون نماید خوشۂ پروین شود پیدا
بفردائے قیامت گے زجا فرہاد برخیزد
مگر وقتیکہ در چشمش رخ شیرین شود پیدا

دل می بری و روے نہان میکنی چرا
خود میکشی مرا و فغان میکنی چرا
تا چند روی خویش نہان میدہی بخلق
رازِ مرا ز پردہ عیان میکنی چرا

دلِ مارا ز چہ رو زار و حزین باید کرد
عاشقی کفر نباشد کہ چنین باید کرد

یار مارا سر پرسیدنِ بیمار بود
عجب از طالع برگشتہ کہ بیدار بود
ما قوی پنجہ و چشم تو کہ بیمار انست
کہ شنیدست قوی کشتۂ بیمار بود؟
جائے معشوق ندانیم و لیکن گویند
کعبہ و بتکدہ و خانۂ خمار بود

مظفر الدین شاہ — مظفر الدین شاہ قاچار نے بھی یوروپ کے سفر کئے۔ جن کے اور دو جلدیں سفرنامہ کی ناصر الدین شاہ کے انداز پر لکھی ہیں۔

خاتمہ — اب فارسی لٹریچر کی یہ حالت ہے کہ سلاست ادا اور صفائے بیان کیطرف مائل ہے۔ خصوصاً جمہوریت و مشروطیت کی ہوانے یوروپ کے علوم و فنون کو بھی ایرانی لباس پہنا دیا ہے۔ اخبار اور جرائد بھی بالکل مذاق حال کے موافق نکل رہے ہیں۔ علوم و فنون کی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ ناول اور ڈرامے نے بھی سرزمین ایران پر دخل کیا ہے۔ یوروپ کے افسانوں کے ترجمے ہوتے چلے جاتے ہیں اور زبان ایک خاص رنگ اختیار کرتی جاتی ہے۔ غیر زبانوں کے الفاظ و خیالات بھی شامل ہو رہے ہیں۔ نمونہ کے لئے ایک عبارت سیاحت نامۂ ابراہیم بیگ سے نقل کی جاتی ہے:-

"اصناف کسبہ ہم زرقیل و قال پول سیاہ۔ امروز ہفتاد شاہی
یک قران۔ فردا ہشتاد شاہی۔ فقرا ہم در تدارک نان۔ امروز
یکمن دو قران فردا سہ قران۔ ہیچ کس را پروائے وطن واز خیر او
اثرے در ظاہر و باطن نیست۔ ہمگی ناقص العقل و قاصر الایمان۔
مردہ اند و لے زندہ۔ زندہ اند و لے مردہ"۔

ایک ڈراما کا اقتباس ملاحظہ ہو:-

گلچہرہ۔ آغا باجی! چرا گریہ میکنی؟

شرف النساء خانم۔ (دست او را گرفتہ تکان دادہ) گم شو!

گلچہرہ۔ (باز شیطانی کردہ دست بطرف او دراز می کند) آغا باجی آغا باجی! ترا بخدا! چرا گریہ میکنی؟

شرف النساء خانم۔ (باز زیر دستش زدہ) گفتم۔ گم شوید!

کار دستمت بگذار! کارم را بکنم!

گلچهره۔ تو کہ کاری نمی کنی ۔ ہمہ اش را گریہ می کنی! بگو۔ ببینم۔

برائے چہ گریہ می کنی؟ اگر نگفتی میروم۔ تنم را صدا میکنم ببینم!

چرا گریہ می کنی؟ (چارقدش[1] را از سر می کشد)۔

شرف نشاء خانم ۔ (دل تنگ سخت تکانش می دہد)

گم شو! دستمت نمی کشد! نمیگذارد کارم را بکنم۔

(گلچہرہ می افتد۔ بعد بلند میشود۔ گریہ کناں می دود پیش مادرش)۔

نظم بھی سادگی کی طرف کھنچ آئی ہے اور یوروپ کے رنگ سے متاثر ہے۔ اکثر قومی نظمیں اور قومی افسانے رواج پا گئے ہیں۔ جس طرح قوم اور تمدن پر انقلاب ہے اسی طرح انشا اور انشاد بھی تغیر پذیر ہیں۔ نازک خیالی کا حد سے بڑھ جانا برا تھا۔ سادگی کا بھی حد اعتدال سے متجاوز ہو جانا کچھ اچھا نہیں مگر انقلابی حالت میں کسی امر کو دیکھ کے اس کے انجام پر حکم لگانا ممکن نہیں۔ لہذا سکوت اختیار کیا جاتا ہے۔

انچہ از زمزمۂ دوست شنفتم گفتم
بپذیر انچہ پسندی دگرم آن نیست

---

[1] چارقد۔ عورتوں کے سر کا لباس۔

معذرت

یہ اوراق پریشان مؤلف کی پریشانیِ حال کا مرقع ہے۔ اپنی علالت۔ بچوں کی نازک بیماریاں۔ ایک بچے کی ہلاکت۔ ایک جلیل القدر بزرگ کی وفات۔ غرض عجیب جانکاہ سانحات کا سامنا رہا اور یہ کتاب کسی نہ کسی طرح تین مہینے دو دن میں ختم کی۔ پروف پڑھنے کی نوبت آئی تو دیکھا کہ یہ تالیف اکثر مقامات پر ناقص ہے۔ اہلی شیرازی کا بالکل ذکر نہیں۔ اس کی مثنوی سحر حلال ذو بحرین ہے اور تقریباً کل اقسام تجنیس پر حاوی ہے۔ دوسری مثنوی شمع و پروانہ مذاق تصوف میں قابل قدر ہے۔ ہاتفی کی مثنویاں شیریں وخسرو۔ لیلی ومجنوں اور تیمور نامہ بھی نظر انداز ہونے کے قابل نہ تھیں۔ شاہنامۂ قاسمی شاہ اسمٰعیل صفوی کے زمانے کی یادگار ہے۔ شاہ اعظم کے عہد میں مرزا جلال اسیر کا نام لینا یا زلالی کے سبعۂ سیارہ خصوصاً مثنوی محمود وایاز کا ذکر نہ کرنا سراسر ظلم ہے۔ نثر میں طاہر وحید کی انشا اور تاریخ شاہ عباس ثانی کی تنقید بھی لازم تھی۔ دورۂ ہندیہ میں غنی کشمیری اور ملا غنیمت کے متعلق بھی اگر کچھ لکھ دیا جاتا تو خوب تھا۔ غرض فروگذاشتیں بہت ہیں اور ہر ایک ناقابلِ تلافی۔ ناظرین میری شکستہ حالی پر رحم فرمائیں اور خدائے عزوجل نظر ثانی کا موقع عطا فرمائے کہ نقائص کی اصلاح ہو اور فروگذاشتیں محل تدارک میں آجائیں۔ والسلام۔

ناصری

تاریخ تالیف

از حضرت لسان القوم مولانا صفی لکھنوی

لغتِ فرس ز عہدِ کے و جم تا ایندم
چو ذخائر کہ نبندد رخت ز اصوات و نغم

ہم شوخ برازندہ شمائل خوش رنگ
شاہد مست خرامندہ بہ صحن عالم

شیوہا دارد و ہر شیوہ ادائے دیگر
گنجہا ریزد و ہر گنج پر از زر و درم

للہ الحمد کزاں جنسِ گرانمایہ بہے
خامۂ ناصری نکتہ رس آورد بہم

وہ چہ گلدستۂ تالیف لطافت پرور
وہ چہ مجموعۂ اوراق دل آویز رقم

حرف حرفش چو خط و خالِ صبیحاں دلکش
سطر سطرش چو سر زلفِ بتاں پُر خم و چم

حسنِ تخییل از آئینۂ تنقید عیاں
ہمچو شادابیِ گلبرگ ز اشکِ شبنم

ساقیِ بزمِ ادب چوں ز مئے گوناگوں
کرد آرائشِ ہر ہفت خطِ ساغرِ جم

نقش زد کلکِ گہر ریزِ صفی مصرعِ سال
جلوہ گر نامہ از آثارِ صنادیدِ عجم

۱۳۴۲ھ